www.iqbalkalmati.blogspot.com
تم کتنے بھٹو مارو گے!
طارق اسمٰعیل ساگر

طارق اسمٰعیل ساگر

طاہر سنز پبلشرز ۴۰۔بی، اُردو بازار۔لاہور
فون:7234137 فیکس:7312159
Website: www.tahirsonspublishers.com
E-mail: info@tahirsonspublishers.com

نام کتاب	ــــ	تم کتنے بھٹو مارو گے!
مصنف	ــــ	طارق اسمٰعیل ساگر
ٹائٹل ڈیزائن	ــــ	رامین امین
کمپوزنگ	ــــ	عاصم شہزاد (طاہر سنز آرٹ سیکشن)
ناشر	ــــ	سید فرحان زیدی
مطبع	ــــ	محمد سید شاہ پرنٹنگ پریس
سن اشاعت	ــــ	جنوری 2008ء
قیمت	ــــ	-/250 روپے

ملنے کے پتے

ساگر پبلی کیشنز اُردو بازار، لاہور فون: 7312159

مکتبہ سراجِ منیر اُردو بازار، لاہور

یہ بازی خون کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے!

ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے!

(نصیر قوی، جہلم)

انتساب

شہید جمہوریت عوام کے دلوں پر راج کرنے والی
چاروں صوبوں کی زنجیر
ذوالفقار علی بھٹو شہید
کی بیٹی کے نام
جس نے مر کر قوم کو جینے کا شعور دیا

ترتیب

عرضِ مصنف

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت نے پاکستان ہی نہیں دُنیا بھر میں جمہوریت پسندوں کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہمارے ہاں منتخب وزراءاعظم کو مارنے اور رُسوا کرنے کی روایت نئی نہیں لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کو جس طرح ٹارگٹ کیا گیا وہ ہمارا قومی المیہ ہے۔ اپنی شہادت سے پہلے ہی انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ انہیں دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔

میرے پیش نظر وہ سرکاری بیانات ہیں جنہوں نے شکوک وشبہات کو جنم دیا اور اب حالت یہ ہے کہ عوام سوائے اقوامِ متحدہ کے اور کسی انکوائری سے مطمئن ہوتے دکھائی نہیں دے رہے۔

ایک صحافی اور قلم کار کی حیثیت سے میں بھی اسی صدمے سے دوچار ہوں جس کا شکار ساری قوم ہوئی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ حالات و واقعات کی وہ تصویر آپ دیکھ لیں جو اب تک چھپائی جا رہی ہے اور جسے ساری قوم دیکھنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے محترمہ بے نظیر بھٹو کو مارنے والے یہ سمجھتے ہوں کہ ماضی کے قاتلوں کی طرح وہ چھپے رہیں گے لیکن اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ کوئی نہیں جانتا تو جان لے کہ خون کی لکیر قاتل کے گھر تک جا رہی ہے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

مرثیہ

درندے جاگتے ہیں
شہر سوتا ہے
درندے جاگتے ہیں
خون کا دریا بہاتے ہیں
زمین مصلحت کی نیند میں ڈوبا
ضمیر وقت سوتا ہے
ہر اک جانب، زمیں سے آسماں تک
ظلم کے سفاک درندے اُچھلتے کودتے ہیں، خوف کی فصلیں اُگاتے ہیں۔
جنوں کی آگ پھیلاتے
فضا کو وحشیانہ قہقہوں کی زد پہ رکھتے ہیں

درندے جاگتے ہیں
اور سکوں کے، عافیت کے آرزومندوں کو اپنے خنجروں سے قتل کرتے ہیں
شہر، غافل شہر سوتا ہے
حاکمانِ وقت سوتے ہیں

نہتی بنتِ حوا کا دھڑکتا دل
کچل دیتے ہیں اپنے بدنما پنجوں کی قوت سے
درندے جاگتے ہیں
شہر، غافل شہر سوتا ہے
یہ عافیت کا جویا شہر، غافل شہر کب تک نیند کی لذت اُٹھائے گا؟
یہ کب بیدار ہوگا؟
جب در و دیوار سارے
آنسوؤں میں ڈوب جائیں گے؟

یہ عافیت کا جویا شہر کب بیدار ہوگا؟
یہ کب ظالم کے ہاتھوں سے لہو آلود خنجر چھین کر
سکون و امن کی بنیاد ڈالے گا؟
یہ جاگے گا کہ اس کا مرثیہ تاریخ لکھے گی
یہ غافل شہر تھا
بس موت ہی اس کا مقدر تھی؟

(احفاظ الرحمٰن)

▪ ▪ ▪

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا!

27 دسمبر 2007ء پاکستانی تاریخ کا وہ روزِ سیاہ ہے جس کا ماتم بہت عرصہ تک کیا جائے گا۔ اس روز پاکستان کی سالمیت کے لئے سرگرم چاروں صوبوں کو زنجیرِ محبت میں جکڑے رکھنے والی ذوالفقار علی بھٹو شہید کی عظیم بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کو ''دہشت گردوں'' نے مار ڈالا۔ وہ بے نظیر بھٹو جو زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے بھرپور، پرجوش، بیباک مدبر اور بہادر خاتون تھی جس کو اپنی موت کا اس شدت سے یقین تھا کہ اس نے مرنے سے پہلے اپنی آخری وصیت بھی لکھ دی تھی۔ اپنے خصوصی احباب کے نام فرداً فرداً خط بھی لکھ دیئے تھے جسے اس کے ساتھی منت سماجت سے روکتے رہے کہ وہ عوامی اجتماعات سے خطاب نہ کرے لیکن اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر جمہوریت اور پاکستان کی بقا کی جنگ جاری رکھی۔ اس جنگ میں بالآخر وہ جان کی بازی ہار گئی۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

15 جولائی 1969ء کو ذوالفقار علی بھٹو پر سانگھڑ میں، جبکہ ملک میں ایک فوجی جرنیل کی حکومت تھی، حملہ ہوا تو بھٹو صاحب نے کہا تھا Bhuttos die young اور پھر انہوں نے مزید کہا تھا ''اس حقیقت کے باوجود میں انشاءاللہ تاریخِ پاکستان میں اپنا کردار ادا کر کے جاؤں گا۔''

ذوالفقار علی بھٹو کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ تاریخ ساز ثابت ہوئے۔ وہ جب جنرل ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں پھانسی پر لٹکائے گئے تو بھٹو صاحب کی عمر صرف 51 سال 2 ماہ 29 دن تھی۔ بھٹو کو ایک غیر جمہوری دور اور ایک جمہوریت دشمن حکمران کے دور میں جس طرح راستے سے ہٹایا گیا، اس نے بھٹو کی سزائے موت کو نہ صرف ہمیشہ کے لئے متنازعہ بنا دیا بلکہ ان

کی بے وقت موت نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک ایسی خلیج کو جنم دیا جو آج تک پاٹی نہیں
جاسکی۔ بھٹو خاندان گزشتہ 30 برس سے مسلسل مسائل اور مصائب و آلام کا شکار ہے۔ اس
خاندان نے اتنی خوشیاں نہیں دیکھی ہوں گی جتنے دُکھ اور غم اسے دیکھنا نصیب ہوئے ہیں۔ زیڈ
اے بھٹو کی بے وقت اور غیر فطری موت کے بعد ان کے دونوں صاحبزادگان کو جلاوطنی کی زندگی
کے عذاب سے گزرنا پڑا اور ان کی بڑی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو اور اہلیہ محترمہ نصرت بھٹو کو
قید و بند اور جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی۔ وہ بیمار بھی تھیں پھر بھی جنرل ضیاء الحق نے انہیں
قید کی سزا دیئے رکھی۔ بھٹو ابھی کال کوٹھڑی میں ہی تھے کہ ان کی اہلیہ اور سابق خاتون اول محترمہ
نصرت بھٹو کا لاہور میں پولیس نے سر پھاڑ دیا تھا۔ نصرت بھٹو کا خون آلود چہرہ آج بھی لاتعداد
لوگوں کو یاد ہے۔

بھٹو مرحوم کی آل اولاد پہ تشدد، زیادتیاں اور صعوبتیں برداشت کرتی رہی لیکن اس
نے جمہوریت کی آواز بلند کرنا اور غیر جمہوری حکمرانوں کے خلاف پرچم بلند کرنا نہ چھوڑا لیکن
نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو شاید نہیں جانتے تھے کہ ان کے باپ کا خاتمہ
کرنے والی قوتیں مسلسل ان کے تعاقب میں بھی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں فرانس کے
شہر کینز (Canes) میں جب شاہ نواز بھٹو کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تو یہ موت پراسرار
ہونے کے باوجود زبانِ حال سے بہت کچھ عیاں کر رہی تھی۔ شاہ نواز کو جب قتل کیا گیا تو بھٹو
مرحوم کے اس سب سے چھوٹے صاحبزادے کی عمر فقط 20 سال تھی۔ نوجوان شاہ نواز بھٹو کا قتل
محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ محترمہ کے لئے صدمہ جانکاہ تھا جس نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی
اور نصرت بھٹو وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئیں۔ بھٹو خاندان کو تیسرا بڑا صدمہ اس وقت سہنا پڑا
جب 1996ء میں کراچی کی ایک معروف شاہراہ پر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اس وقت رُکن
اسمبلی بھی تھے اور ایک وزیراعظم بہن کے بھائی بھی لیکن ان کے تعاقب میں لگی قوتوں نے اس
سب کے باوجود نہایت چالاکی اور مشاقی سے مرتضیٰ بھٹو کو مار ڈالا اور محترمہ بے نظیر سکتے میں
آ گئیں۔ جس وقت مرتضیٰ بھٹو کو قتل کیا گیا، اس وقت ان کی عمر 45 سال تھی یعنی انہوں نے 50
سال بھی عمر نہ پائی۔ ان کے قتل کا سانحہ اسرار کی اتنی تہوں میں گم ہو چکا ہے کہ آج تک قاتلوں کا
سراغ نہیں لگایا جاسکا بلکہ اس پولیس افسر کو بھی مار ڈالا گیا جو مرتضیٰ بھٹو پر فائرنگ میں مبینہ طور پر
ملوث تھا۔ مرتضیٰ بھٹو کو مارنے والوں نے نہایت چالاکی سے بے نظیر بھٹو اور مرتضیٰ کے بچوں کے

درمیان غلط فہمیوں اور ناپسندیدگی کی دیوار کھڑی کر دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کی صاحبزادی
فاطمہ بھٹو کھلم کھلا اپنے انٹرویوز اور کالموں میں اپنی پھوپھی بے نظیر بھٹو پر الزامات کی بارش کرتی
رہی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان کے بارے میں یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ
انہوں نے قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کی ہیں اور جمہوریت کی جدوجہد میں مرکزی اور
ہراوّل دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو راستے سے ہٹانے اور بے نظیر بھٹو
کے ملک سے چلے جانے سے یہ فرض کر لیا تھا کہ اب بھٹو مرحوم کی پارٹی ''پاکستان پیپلز پارٹی''
کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن جب محترمہ بے نظیر بھٹو محمد خان جونیجو کی وزارتِ عظمیٰ اور جنرل ضیاء الحق
کی صدارت کے دور میں فاتحانہ انداز میں لاہور میں اُتریں تو کل عالم نے دیکھا کہ بھٹو مرحوم کا
جادو ابھی مدہم نہیں پڑا ہے اور ان کے چاہنے والے بھٹو مرحوم کی شخصیت، آدرشوں، نعروں اور
پیغامات کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے آزو بازو میں بسنے
والے لوگ اگرچہ بے نظیر کے خلاف نعرہ زن رہے اور ان کی نہایت بھونڈے انداز میں بے
بنیاد کردار کشی بھی کرتے رہے لیکن بے نظیر بھٹو ان سب سے بے نیاز ہو کر اور جمہوریت کی شمع
تھامے مسلسل آگے بڑھتی رہیں۔ بھٹو مرحوم کی پارٹی اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کی مقبولیت کا جادو اور
بھی واضح اس وقت ہوا جب جنرل ضیاء الحق کے اقتدار اور زندگی سے رُخصت ہونے کے بعد
1988ء میں انتخابات کا رن پڑا تو محترمہ بے نظیر بھٹو جیت سے ہمکنار ہو کر وزیراعظم بن
گئیں۔ یہ کامیابی دراصل بھٹو مرحوم کے آدرشوں کی کامیابی اور آرزوؤں کے بر آنے کا نام
تھا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو یہ منفرد اور بے مثل اعزاز نصیب ہوا کہ وہ عالم اسلام کی پہلی
منتخب وزیراعظم تھیں۔ وہ روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ سیاست کا ڈھنگ انہوں نے
اپنے والد گرامی سے سیکھا۔ والد گرامی زیڈ اے بھٹو بھی ان کی اسی لئے اسی انداز میں تربیت
کرتے رہے کہ انہیں مستقبل میں پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ وہ اکثر غیر ملکی دوروں میں
انہیں اپنے ساتھ لے جاتے تاکہ عالمی لیڈروں سے ان کی ملاقات کے دوران بیٹی کا تعارف
بھی ہو جائے اور وہ عالمی اُمور کے داؤ پیچ سے بھی آگاہ ہو سکیں۔ بھٹو صاحب جب شملہ معاہدہ،
جس کے تحت افواجِ پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی رہا ہوئے، کرنے بھارتی وزیراعظم اندرا

گاندھی سے ملنے گئے تو محترمہ بے نظیر بھٹو ہر حساس میٹنگ میں بھٹو صاحب کے ساتھ ساتھ تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو بڑے چاؤ سے ان کے والد گرامی نے دُنیا کی دو اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی۔ برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور وہاں کی طلباء یونین کی وہ صدر بھی منتخب ہوئیں۔ یہ اعزاز پہلی بار بے نظیر بھٹو کی شکل میں کسی ایشیائی طالب علم کے حصے میں آیا تھا۔ اعلیٰ مغربی درس گاہوں سے محترمہ بے نظیر بھٹو نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وزیر اعظم باپ سے حکومت کرنے کے اسرار و رموز سیکھے۔ علم اور تجربہ ان کے ہم رکاب تھا جس نے انہیں دُنیا کے بہترین اور قابل رشک مدبرین کی صفوں میں شامل کر دیا تھا۔ وہ 1988ء میں پہلی بار وزیر اعظم بنیں تو ایک زمانے نے ان پر رشک کیا۔ ان کے بعد اگرچہ ترکی میں تانسو چیلر اور بنگلہ دیش میں حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء بھی مسلمان ممالک کی وزیر اعظم بنیں تھیں لیکن ان تینوں میں سے کوئی خاتون محترمہ بے نظیر بھٹو سے یہ منفرد اعزاز چھین نہ سکی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلی بار وزیر اعظم بننے سے ملک میں مذہبی قوتوں اور جماعتوں نے ان کے خلاف پراپیگنڈے کا طومار باندھا لیکن وہ مسلسل آگے بڑھتی رہیں۔ ان کی وجہ سے دُنیا بھر میں پاکستان کا معتدل روشن خیال چہرہ سامنے آیا۔ تقریباً 3 سال بعد صدر غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا لیکن اگلے 3 سال بعد 1993ء میں وہ دوبارہ وزیر اعظم بن گئیں۔ 1993ء سے لے کر 1996ء تک ان کا پونے تین سالہ اقتدار ان کے پہلے اقتدار سے کہیں زیادہ بہتر، باوقار اور یادگار تھا۔ وہ ابھی مزید کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتی تھیں کہ صدر فاروق لغاری، جنہیں خود محترمہ بے نظیر بھٹو نے صدر بنایا تھا، نے ان کا اقتدار ختم کر دیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا شاندار سیاسی کردار اور ملک کے لئے ان کی خدمات کو جریدہ عالم سے محو نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ نواز شریف کی وزارتِ عظمٰی کے دور میں جلاوطن ہو گئی تھیں لیکن اب ایک طویل عرصہ بعد 18 اکتوبر 2007ء کو وطن عزیز تشریف لے آئی تھیں۔ ان کے وطن آنے سے قبل انہیں بعض اطراف سے دھمکیاں دی گئیں کہ ان پر خود کش حملہ کیا جائے گا لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو ان دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر 18 اکتوبر کو کراچی اُتر گئیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو جس دن شہر قائداعظم میں آئیں، اسی شب ان پر کراچی میں قاتلانہ حملہ کیا گیا جس میں 150 سے زائد لوگ جاں بحق ہوئے لیکن محترمہ محفوظ رہیں۔اس حملے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ خودکش حملہ تھا لیکن محترمہ بینظیر بھٹو بار بار حکومت کے بعض اہم انٹیلی جنس افسروں کی جانب انگشت نمائی کرتی تھیں۔محترمہ بینظیر بھٹو مسلسل دھمکیوں اور قاتلوں کی زد میں تھیں۔راستے سے ہٹانے کے لئے جتنی دھمکیاں محترمہ بینظیر بھٹو کو ملیں، اتنی دھمکیاں انتخابات کی مہمات میں شریک کسی دوسرے سیاست دان کو نہ ملیں۔اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مخصوص قوتیں جنہوں نے زیڈ اے بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کو قتل کیا تھا، اب وہی قوتیں محترمہ بینظیر بھٹو کو بھی قتل کرنا چاہتی تھیں۔لیکن بینظیر صاحبہ ان سے بے نیاز ہو کر مردانہ وار انتخابی مہمات میں شریک ہورہی تھیں۔اس دوران ان کے ایک سیکورٹی مشیر رحمٰن ملک نے گزشتہ روز ہی یہ بیان ریکارڈ کرایا تھا کہ حکومت پاکستان نے بینظیر بھٹو کی سیکورٹی کو یقینی بنانے کے لئے جو سیکورٹی آلات فراہم کئے تھے، وہ ناکارہ اور فرسودہ تھے۔

ان شکایتوں کے باوجود محترمہ بینظیر بھٹو اپنے قافلے کو آگے ہی آگے بڑھاتی رہیں۔ 26 دسمبر 2007ء کو جب محترمہ بینظیر بھٹو پشاور میں جلسہ عام سے خطاب کررہی تھیں، ان کے عقب میں ایک دھماکہ ہوا۔یہ دراصل بینظیر بھٹو پر دوسرا قاتلانہ حملہ تھا لیکن وہ پھر بھی محفوظ رہیں۔ وہ اپنے دائیں بازو پر بندھے امام ضامن کے سہارے منزلوں پر منزلیں مارتی آگے بڑھتی رہیں۔ 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ بینظیر بھٹو راولپنڈی کے مشہور پارک لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرنے آئیں۔جوش وخروش میں بھرے پی پی پی کے کارکنوں نے انہیں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا۔سورج ڈوب چکا تھا اور شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے راولپنڈی پر اُتر رہا تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو جو زبردست مقررتھیں، جلسہ عام سے خطاب کرنے سٹیج پر آئیں۔انہوں نے اپنے خطاب میں حکومت پر دھاندلی کے الزامات لگائے اور کہا کہ ان کے پاس اس کے ثبوت بھی موجود ہیں۔جلسے کے خاتمے پر وہ گاڑی میں سوار ہوئیں۔کارکنوں کی دیوانگی دیدنی تو محترمہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر گاڑی میں کھڑی ہوگئیں جب حملہ آوروں نے ان کی جان لے لی۔ پستول کی گولیاں، دھماکہ، کس نے محترمہ بینظیر بھٹو کی زندگی کا چراغ گل کیا؟ یہ ابھی معمہ ہے۔

پاکستان کی دوبار وزیراعظم بننے والی محترمہ بینظیر بھٹو اس دُنیا میں تقریباً 54 برس گزارنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملی ہیں۔(اناللہ وانا الیہ راجعون) اللہ ان کی مغفرت

کرے اور جنت فردوس کے اعلیٰ درجات سے نوازے۔ جس جگہ ان کی شہادت ہوئی ہے اسی جگہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا تھا اور قاتل سیّد اکبر نے خود کو گولی مار لی تھی۔ جس جگہ محترمہ بینظیر بھٹو کو شہید کیا گیا ہے، اس سے محض 2 کلومیٹر کے فاصلے پر وہ جیل تھی جہاں ان کے والد گرامی اور منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر کھینچا گیا۔ والد بھی شہید، بیٹی بھی شہید۔ لیاقت علی خان کے قاتل ہنوز روپوش ہیں، اب بینظیر بھی مار ڈالی گئی ہیں، ان کے قاتلوں کو کون بے نقاب کرے گا؟ ان کے تینوں بچے (بلاول، آصفہ اور بختاور) اپنی بینظیر ماں بینظیر بھٹو سے پلک جھپکتے ہی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ وہ کون ظالم ہیں جنہوں نے یہ سفاک اور بہیمانہ اقدام کیا ہے؟ محترمہ بینظیر بھٹو شدت پسندی کے سخت خلاف تھیں اور گزشتہ کئی برس سے اس عفریت کی تباہ کاریوں کے بارے میں بیانات دیتی آ رہی تھیں۔ ملک کا شدت پسند طبقہ اور القاعدہ کے ارکان اور وابستگان ان کے دشمن خیال کئے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو پاکستان کی واحد سیاست دان تھیں جو ملک بھر میں مقبول تھیں۔ ان کے بارے میں یہ جو کہا جاتا تھا ''چاروں صوبوں کی زنجیر، بے نظیر بے نظیر'' تو یہ محض پی پی پی کا نعرہ ہی نہیں تھا، حقیقت کا عکاس بھی تھا۔ اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو بھی پنجاب ہی میں شہید کیا گیا اور ان کے والد کو بھی پنجاب ہی کے اسی شہر میں پھانسی دی گئی تھی۔

بینظیر بھٹو کی شہادت کی خبر پھیلتے ہی ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہاہاکار بپا ہوگئی۔ اِک قیامت کا سماں تھا۔ احتجاجی مظاہرے شروع ہوئے۔ سینکڑوں گاڑیاں، ٹرینیں، بنک، دفاتر اور سرکاری پارٹی کے اُمیدواروں کے دفاتر جلا کر خاک کر دیئے گئے۔ ان مواقع سے فائدہ اُٹھانے والے بدقماش عناصر نے ملک کے ایک سے دوسرے کونے تک لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ سوگ میں ڈوبے عوام ان غنڈوں اور لٹیروں کے ہاتھوں لٹتے رہے۔ تین روزہ سوگ کے اعلان سے پٹرول پمپ اور میڈیکل سٹور بھی بند کروا دیئے۔ زندگی تھم گئی لیکن بدقماشوں کی لوٹ مار جاری رہی۔ کچھ عاقبت نااندیش پٹرول پمپ مالکان نے اس صورتِ حال کا انتہائی ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے 100 روپے لیٹر تک پٹرول بلیک میں فروخت کیا۔ آٹا 50 روپے کلو تک فروخت کیا گیا۔ ایسے سماج دشمن عناصر کی تعداد گو کہ آٹے میں نمک کے برابر تھی لیکن یہ لوگ کسی بھی معاشرے کے منہ پر کالک ضرور مل گئے۔

تدفین

28 دسمبر 2007ء کو محترمہ بینظیر بھٹو کا جسدِ خاکی چک لالہ ایئر پورٹ سے موہنجوداڑو ایئر پورٹ پر پہنچا۔ جہاں سے انہیں جلوس کی شکل میں نوڈیرو لایا گیا تھا۔ یہاں اُن کے دیدار کے بعد اُن کا جسدِ خاکی گڑھی خدا بخش لے جایا گیا جو اُن کا آبائی قبرستان ہے اور جہاں اُن کے والد اور دو جواں سال بھائی بھی آسودہ خاک ہیں۔ آصف زرداری اور بلاول زرداری نے اُن کے جسدِ خاکی کو لحد میں اُتارا۔ اس مرحلے پر بڑے جگر خراش مناظر دیکھنے کو ملے۔ دھاڑیں مار کر روتے ہوئے جنازے کے شرکا کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے، رہائش گاہ پر قرآن خوانی جاری رہی، آخری رسومات میں شرکت کے لئے ملک بھر سے قافلے گڑھی خدا بخش پہنچے۔ صنم بھٹو کی آمد کی وجہ سے تدفین میں تاخیر ہوئی، آصف زرداری کئی مرتبہ فرطِ جذبات سے رو پڑے۔ نمازِ جنازہ حافظ حاکم علی منگی نے پڑھائی۔ تفصیلات کے مطابق تدفین کے موقع پر نہایت رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ کارکنوں کی بڑی تعداد غم سے نڈھال تھی اور وہ بار بار ''یااللہ، یارسول، بے نظیر، بے قصور'' کے نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ کلمہ طیبہ کا ورد بھی کر رہے تھے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی میت جمعہ کو علی الصباح سکھر سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے موہنجوداڑو ایئر پورٹ پہنچی جس کے بعد انہیں گاڑیوں کے ایک بڑے جلوس میں نوڈیرو میں واقع ان کی رہائش گاہ لایا گیا جس کے بعد ان کی میت کو بنگلے کے اندرونی حصے میں رکھ دیا گیا۔ اس کمرے میں رشتہ دار خواتین کے علاوہ ان کی بھابی غنویٰ بھٹو، بھتیجی فاطمہ بھٹو اور بھتیجے ذوالفقار جونیئر بھی تھے اور وہ تمام لوگ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ تدفین سے قبل نوڈیرو ہاؤس میں خواتین کو آخری دیدار کرایا گیا۔ آخری دیدار کرنے والوں میں بلاول، آصفہ، بختاور کے علاوہ غنویٰ بھٹو، فاطمہ بھٹو، ذوالفقار جونیئر اور دیگر رشتے دار خواتین کے علاوہ نوڈیرو ہاؤس پہنچنے والی ممتاز خواتین رہنما بھی شامل تھیں جن میں عاصمہ جہانگیر، شیری رحمٰن، پروین بشیر قائم خانی، رخسانہ زبیری اور دیگر شامل ہیں۔ آخری دیدار کے بعد میت کے تابوت کو پی

پی پی کے پرچم میں لپیٹ دیا گیا جس کے بعد ان کا سفرآخرت شروع ہوگیا۔ بینظیر بھٹو کی میت کے ہمراہ ان کے شوہر آصف زارداری بھی لاڑکانہ پہنچے تھے۔ موہنجوداڑو ائیر پورٹ پر پی پی کے صوبائی صدر قائم علی شاہ، نثار کھوڑو، مخدوم امین فہیم اور دیگر رہنماؤں نے آصف زرداری سے ملاقات کے بعد میت وصول کی۔ جمعہ کی صبح تقریباً چھ بجے بینظیر بھٹو کی میت نوڈیرو پہنچی جبکہ اس دوران گڑھی خدا بخش بھٹو میں بھٹو کے مزار کے پہلو میں بینظیر بھٹو کی لحد کی تیاری کا کام جاری رہا۔ صبح ہی سے لاڑکانہ، قمبر، شہدادکوٹ، دادو، شکار پور، کراچی، حیدرآباد، پنجاب، سرحد اور بلوچستان سے لوگوں کے قافلے نوڈیرو اور گڑھی خدا بخش پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ پی پی کے مقامی رہنماؤں کی جانب سے قبل ازیں تدفین کے لئے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا تاہم بےنظیر بھٹو کی رہائش گاہ پر جہانگیر بدر، مخدوم امین فہیم، سیّد قائم علی شاہ، اسلام دین شیخ، نثار کھوڑو، خورشید جونیجو، شاہ محمود قریشی، منظور وسان، آفتاب شعبان میرانی، شاہد بھٹو، محمد ایاز سومرو، میاں مٹھو، خورشید شاہ، میر نادر مگسی، میر عامر مگسی، حاجی ظفر لغاری، میر ہزار خان بجارانی، ڈاکٹر فدا میرانی، غلام قمبر لغاری، سروری جماعت کے سید اللہ ورایو شاہ، نذیر احمد بگھیو، حزب اللہ بگھیو، آغا سراج درانی، اللہ بخش انڑ، راجہ پرویز اشرف، زمرد خان، فرحت اللہ بابر، فرزانہ راجہ، رُخسانہ بنگش، مہرین راجہ، چوہدری عبدالمجید (آزاد کشمیر) صبح سے ہی موجود تھے جبکہ بعد میں چارٹرڈ فلائٹ سے آنے والوں میں عاصمہ جہانگیر، رخسانہ زبیری، رضا ربانی، نفیس صدیقی، وقار مہدی، سنی تحریک کے شاہد غوری، تاج حیدر، اے این پی کے شاہی سید، راشد ربانی، صادق عمرانی (بلوچستان) پیر مظہر الحق اور بہت سے دیگر اہم رہنما اور کارکن تدفین سے قبل نوڈیرو پہنچے۔ بینظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو دوپہر تقریباً اڑھائی بجے نوڈیرو پہنچی جہاں انہوں نے اشکبار آنکھوں سے اپنی بہن کا دیدار کیا۔ اس کے بعد میت کو تدفین کے لئے چانڈکا میڈیکل کالج اسپتال لاڑکانہ کی ایمبولینس میں منتقل کر دیا گیا۔ میت کی منتقلی کے موقع پر آصف زرداری، منور تالپور، آفتاب شعبان میرانی اور دیگر موجود تھے۔ میت کی منتقلی کے بعد دوسری ایمبولینس میں بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی اور سیکرٹری ناہید خان، پروین بشیر قائم خانی، شیری رحمان اور دیگر رہنما گڑھی خدا بخش بھٹو کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی خدا بخش روانگی سے قبل کارکنوں کی بڑی تعداد آہ و زاری میں مصروف تھی اور غم کی شدت سے نڈھال تھی۔ ایک موقع پر متعدد کارکنوں نے آصف زرداری سے التماس کی کہ بینظیر بھٹو کا آخری دیدار کرنے کی اجازت دی جائے مگر اسلامی اُصولوں کے مطابق آصف زرداری نے ایسا نہ کرنے

کا اشارہ کرتے ہوئے شہادت کی اُنگلی آسمان کی طرف کر کے اللہ کو یاد کرنے کی ہدایت کی۔ آصف زرداری اس موقع پر کئی بار رو پڑے۔ انہوں نے سیاہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ تقریباً تین بجے بےنظیر بھٹو کی میت جب گڑھی خدا بخش کے لئے روانہ ہوئی تو پورا پنڈال آہوں اور سسکیوں سے گونج اُٹھا اور متعدد لوگ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گڑھی خدا بخش پہنچنے کے بعد بینظیر بھٹو کی میت والی ایمبولینس کو قبرستان کے عین سامنے واقع وسیع و عریض میدان میں کھڑا کیا گیا اور نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد بینظیر بھٹو کو سپرد خاک کرنے کے لئے قبرستان کے اندرونی حصے میں پہنچایا گیا۔ اس موقع پر بھی کارکن چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ بینظیر بھٹو کی میت کو لحد میں اُتارنے کے لئے ذوالفقار جونیئر، شاہد بھٹو، محمد علی بھٹو اور میر نادر علی مگسی قبر میں اُترے اور لحد میں بینظیر بھٹو کی میت اُتارنے میں آصف زرداری کی مدد کی اور دیگر افراد نے قبر پر مٹی ڈالی۔ تقریباً پون گھنٹے میں تدفین کا عمل مکمل ہوگیا جس کے بعد آصف زارداری اور پی پی کے دیگر رہنما نوڈیرو ہاؤس پہنچے جہاں ملک بھر سے آئے ہوئے افراد نے انتہائی رقت سے آصف زرداری سے بینظیر سے کی شہادت پر ان سے اظہارِ تعزیت کیا۔

بینظیر بھٹو کو 28 دسمبر 2007ء کو بعد از نمازِ جمعہ ان کی وصیت کے مطابق گڑھی خدا بخش میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان کے متفقہ فیصلے کے مطابق بینظیر بھٹو کا آخری دیدار کرایا گیا کیونکہ جنازے میں شرکت کے لئے آنے والے کارکنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ گڑھی خدا بخش کی مرکزی مسجد کے پیش امام حافظ حاکم علی منگی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ گڑھی خدا بخش نوڈیرو ہاؤس سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں پر نمازِ جنازہ کے لئے مختص کی جانے والی جگہ 165 ایکڑ میں بنائی گئی تھی۔

ادھر پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے بھی ایک پیغام میں بینظیر بھٹو کی موت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ سب ایک قومی رہنما کے قتل پر افسردہ ہوئے ہیں۔ ایک مختصر بیان میں انہوں نے مرحومہ کے خاندان اور دوست احباب سے تعزیت بھی کی اور نوڈیرو ہاؤس میں خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری نے پارٹی کارکنوں سے اپیل کی کہ وہ رو کر ان کا دل چھوٹا مت کریں بلکہ خود بھی ہمت کریں اور ان کی بھی ہمت بندھائیں۔ آصف زردای کے خطاب کے دوران چند مشتعل کارکنوں نے پنجاب کے خلاف نعرہ بازی کی تو انہوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ پنجاب کا کوئی قصور نہیں بلکہ لٹیروں کا

قصور ہے جنہوں نے ہم سے دھوکہ کیا۔

بینظیر بھٹو کی چھوٹی بہن صنم بھٹو جنازے سے قبل لندن سے نوڈیرو پہنچ گئیں۔ انہیں ایک خصوصی طیارے سے کراچی سے لاڑکانہ لایا گیا۔ جنازگاہ میں موجود پاکستان پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما سید نوید قمر نے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ چھوٹے صوبے کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ سندھ سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کو راولپنڈی میں ہی کیوں قتل کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ شاید یہی وجہ ہے کہ رنجشیں نعروں میں بدل رہی ہیں۔ بینظیر بھٹو کا جسد خاکی پاکستان ایئرفورس کے ایک C-130 طیارے کے ذریعے راولپنڈی سے سکھر اور پھر وہاں سے ہیلی کاپٹر پر ان کے آبائی شہر لاڑکانہ کے موہنجوداڑو ایئرپورٹ پہنچایا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو کی میت پاکستانی وقت کے مطابق رات ایک بج کر بیس منٹ پر راولپنڈی کی چک لالہ ایئربیس سے سکھر کے لئے روانہ کی گئی تھی۔ طیارے میں ان کے شوہر آصف زرداری اور بچے بلاول، بختاور اور آصفہ بھی موجود تھے۔ آصف علی زرداری اور ان کے بچے خصوصی طیارے کے ذریعے دبئی سے اسلام آباد پہنچے تھے۔ موہنجوداڑو ایئرپورٹ سے بینظیر بھٹو کی میت لاڑکانہ میں نوڈیرو ہاؤس پہنچی تو موقع پر موجود سینکڑوں کارکن زاروقطار رونے لگے۔ ان میں سے کئی نے سینہ کوبی شروع کر دی۔ آصف زرداری نے جذباتی کارکنوں کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے راستہ دینے کی گزارش کی۔ جب میت کو گھر کے اندرونی حصے میں منتقل کیا جارہا تھا تو آصف زرداری نے ہاتھ جوڑ کر لوگوں کو باہر رہنے کی اپیل کی۔ میت کے ساتھ پیپلز پارٹی کے رہنما مخدوم امین فہیم، راجہ پرویز اشرف، شیری رحمان اور دیگر شامل تھے۔ بینظیر بھٹو کو گڑھی خدا بخش میں ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دائیں جانب دفن کیا گیا۔

بینظیر بھٹو کی میت جب ہسپتال سے باہر لائی گئی تو سینکڑوں کی تعداد میں غصے سے بھرے پیپلز پارٹی کے کارکن دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور صدر پرویز مشرف کے خلاف نعرے بازی کر کے اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ ہسپتال کے ایک اہلکار نے بی بی سی کو بتایا کہ بینظیر بھٹو کو جب ہسپتال لایا گیا تو وہ دم توڑ چکی تھیں۔ پروفیسر مصدق خان نے کہا کہ اوپن ہارٹ مساج کے ذریعے انہیں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی بتایا کہ ایک گولی ان کی شہ رگ میں لگ کر سر سے نکلی ہے، جس سے دماغ کا پچھلا حصہ اُڑ گیا، تاہم ڈاکٹروں کی ایک اور رائے یہ بھی ہے کہ یہ زخم دو الگ الگ گولیوں کی وجہ سے آئے۔ دھماکے کے چند عینی شاہدوں

نے بی بی سی سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ حملہ آور ایک نوجوان شخص تھا جو ایک گاڑی سے اُتر کر بینظیر بھٹو کی گاڑی کے قریب آیا اور ان پر فائر کھول دیا، جب اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اپنے آپ کو دھماکے سے اُڑا دیا۔

o

28 دسمبر 2007ء گڑھی خدا بخش میں ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لوگ ابھی سڑکوں پر نکلنے شروع ہی ہوئے تھے مگر قبرستان میں ایک اور بھٹو کی لحد تیار کی جارہی تھی۔ گڑھی خدا بخش کے لوگوں سے جب بی بی سی کے نمائندہ کی بات ہوئی تو انہوں نے راولپنڈی کے حاکموں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے پہلے بھی ہمیں راولپنڈی سے بڑے بھٹو صاحب کی لاش ملی تھی اب دوسری لاش بھی راولپنڈی سے بھیجی گئی ہے۔ بینظیر کی لحد تیار کرنے کا کام کرنے والوں کے انچارج محمد علی شاہ نے کہا: ''پاکستان کو بچانے کے لئے ہم نوڈیرو کے کسی بھٹو کو راولپنڈی روانہ کرتے ہیں تو وہ لوگ ہمیں ان کی لاش واپس کرتے ہیں۔'' ان کا کہنا تھا کتنے بھٹوؤں کی لاشیں ہم وصول کرتے رہیں گے۔

گڑھی خدا بخش میں بھٹو کے بڑے بزرگوں کا کہنا تھا کہ انہیں وہ اندھیری رات بھی یاد ہے جب چار اپریل کو ذوالفقار علی بھٹو کی لاش فوجی پہرے میں دفنائی گئی تھی اور مقامی لوگوں کو نمازِ جنازہ ادا کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی، ایک بزرگ نور محمد نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی میت پہنچنے پر پورا علاقہ فوج کی تحویل میں تھا اور شناخت کے بعد گاؤں کے چند افراد کو نمازِ جنازہ ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے القاعدہ کی جانب سے مبینہ طور پر بینظیر بھٹو پر حملے کی ذمے داری قبول کرنے والی اطلاعات کو مسترد کر دیا ہے۔ پارٹی کا کہنا ہے کہ اس طرح کی باتیں ممکن ہے اس لئے کہی جا رہی ہوں تاکہ اصل چہروں کو چھپایا جا سکے۔ پی پی پی کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے بتایا کہ اٹھارہ اکتوبر کو کراچی میں ہونے والے بم دھماکے کے بعد بھی اسی طرح کا ایک بیان جاری ہوا تھا اور قبائلی علاقے کے ایک گروہ کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ اس نے ذمہ داری قبول کی ہے لیکن اگلے ہی روز اسی گروہ نے اس کی تردید کر دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے یہ بھی غلط بیان دیا گیا ہو، جو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ القاعدہ یا طالبان کی جانب سے حملہ ہے۔

اس مرحلے پر آصف علی زرداری نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے انتہائی محب وطن ہونے کا ثبوت دیا اور جو نوجوان جوش میں پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے انہیں سختی سے روک دیا۔انہوں نے کہا کہ بینظیر کے ساتھ شہید ہونے والے تمام پنجابی نوجوان اور میرے جیل کے دوست تھے اور محترمہ نے شہادت صرف اور صرف پاکستان کو متحد رکھنے کے لئے دی ہے۔ انہوں نے میاں نواز شریف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپیل کی کہ وہ انتخابات کے بائی کاٹ کا فیصلہ واپس لیں کیونکہ پیپلز پارٹی نے بھی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ 30 دسمبر کو سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں بلاول بھٹو زرداری کو ان کی شہید ماں کی وصیت کے مطابق چیئر مین مقرر کر دیا گیا جبکہ آصف علی زرداری ان کے نگران بن گئے جبکہ محترمہ بینظیر بھٹو نے اپنی وصیت میں آصف علی زرداری کو چیئر مین مقرر کیا تھا۔

بینظیر بھٹو کی بہادری کا اندازہ کیجئے کہ اپنی موت سے پہلے انہوں نے نہ صرف اپنی وصیت لکھوا دی تھی بلکہ فرداً فرداً خاندان کے ہر اہم فرد کے نام خط بھی لکھ رکھا تھا۔ حیرت ہے کہ وہ کس جرأت اور دلیری سے صورتِ حال کا سامنا کر رہی تھیں۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہوشیار باش

پاکستان کی دو مرتبہ منتخب ہونے والی وزیر اعظم بینظیر بھٹو کے جاں بحق ہونے کے بعد پورے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ پیپلز پارٹی کے جیالوں نے ہنگامہ آرائی کا ذمہ دار اپوزیشن کو قرار دیا اور کہا کہ انہوں نے کسی لوٹ مار میں حصہ نہیں لیا۔ عالمی سطح پر بھی اس قتل کی شدید مذمت کی گئی۔ بینظیر بھٹو کے جاں بحق ہونے کے بعد اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں اس قتل کی مذمت کرتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا اس سانحہ کو شاخسانہ قرار دیا گیا۔

صدر پرویز مشرف نے سانحہ کے بعد اسلام آباد میں اعلیٰ سطحی ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں نگران وزیر اعظم محمد میاں سومرو سمیت کابینہ کے ارکان نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں سانحہ کے بعد رونما ہونے والے ردِ عمل کو روکنے کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور صوبہ سندھ سمیت ملک کے دیگر علاقوں کا کنٹرول فوج کے سپرد کر دیا گیا، مگر انتخابات ملتوی نہ کرنے کا اعلان بھی کیا گیا۔ بینظیر بھٹو کی ہلاکت پر پرویز مشرف کی ہدایت پر ملک بھر میں 3 روزہ قومی سوگ منا کر بینظیر بھٹو کو عظیم سیاسی شخصیت قرار دیا گیا۔ صدر مملکت نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے ہمیشہ قومی نصب العین کو مقدم رکھا اور ہمیشہ ملک وقوم کی بہتری کے لئے کام کیا۔ نگران وزیر اعظم محمد میاں سومرو نے بھی اس سانحہ کو قومی سانحہ قرار دیا جبکہ تمام بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بینظیر بھٹو کو عظیم سیاسی شخصیت قرار دیا۔ پیپلز پارٹی کی مخالف نظریاتی جماعت جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے سانحہ سے اگلے دن ملک بھر میں احتجاج کیا اور صدر پرویز مشرف کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔

بینظیر بھٹو کے جاں بحق ہونے کے بعد ملک بھر میں احتجاج اور تشدد کی جو لہر شروع ہوئی تھی وہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سانحہ کے بعد درجنوں افراد کو قتل کر دیا گیا۔ کھربوں روپے کی املاک

کونقصان پہنچایا گیا ہے۔حکومت امن وامان کی صورت حال کو کنٹرول کرنے میں پہلے ہی ناکام تھی اور سانحہ کے بعد محسوس یہ ہورہا ہے کہ ملک میں حکومت اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ملک دشمن عناصر اپنا کام کئے جارہے تھے۔صوبہ بلوچستان میں یا صوبہ سرحد، صوبہ پنجاب ہو یا صوبہ سندھ چاروں صوبوں میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔قبائلی علاقے پہلے ہی خون میں نہا رہے تھے۔سوات اور مالاکنڈ میں فوج اور شہری آمنے سامنے ہیں۔پاکستان دشمن طاقتیں ہمیں آپس میں لڑا کر اپنے مفادات حاصل کررہی ہیں۔بینظیر بھٹو کی ہلاکت کے بعد ان سازشوں میں مزید تیزی آئی۔

بینظیر بھٹو جون 1953ء میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے سیاست کا آغاز انتہائی مشکل حالات میں کیا مگر ان کی آخری وقت تک سیاسی جدوجہد پرامن رہی۔بینظیر بھٹو نے اعلیٰ تعلیم لندن آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔بینظیر بھٹو نے اپنی سیاست کا باقاعدہ آغاز اس وقت کیا جب سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو ختم کر کے 1977ء میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی زندگی میں ہی بینظیر بھٹو کو اپنا سیاسی جانشین قرار دے دیا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو جب 1979ء میں پھانسی دی گئی اس وقت بینظیر بھٹو اپنی والدہ کے ہمراہ نظر بند تھیں۔1984ء میں بینظیر بھٹو کو ضیاء الحق نے جلاوطن کر دیا۔1985ء میں جب ضیاء الحق نے ملک سے مارشل لاء اُٹھایا تو اس وقت بینظیر بھٹو نے پاکستان آنے کا اعلان کیا اور صوبہ پنجاب کے شہر لاہور میں بینظیر بھٹو کا 1985ء میں فقید المثال استقبال کیا گیا۔اس استقبال کو پاکستان کا سب سے بڑا استقبال قرار دیا گیا۔

1985ء میں بینظیر بھٹو نے ضیاء الحق کے خلاف تحریک شروع کی اور 1987ء میں بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کی شادی ہوئی۔16 نومبر 1988ء کو بینظیر بھٹو نے پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم کا خطاب حاصل کیا۔سابق صدر غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت کو ختم کیا تو 1990ء کے انتخابات میں وہ قائد حزب اختلاف بنی اور میاں نواز شریف نے حکومت بنائی۔1993ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی اور بینظیر بھٹو دوبارہ وزیراعظم بن گئیں۔

ان کے دور اقتدار میں ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کر دیا گیا اور بعدازاں سابق

صدر فاروق احمد لغاری نے ان کی حکومت ختم کر دی۔بینظیر بھٹو کی دوسری مرتبہ حکومت ختم ہونے کے بعد بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے خلاف کرپشن کے متعدد مقدمات بنا دیئے گئے۔ان کے شوہر آصف علی زرداری کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

1999ء میں بینظیر بھٹو ملک سے باہر چلی گئیں اور انہوں نے ملک سے باہر رہ کر پاکستانی سیاست میں کردار ادا کیا۔عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی اسٹیبلشمنٹ نے پیپلز پارٹی کی مخالفت کی اور مسلم لیگ (ق) کی حکومت بنوا دی گئی اور پیپلز پارٹی کے ڈیڑھ درجن کے قریب اراکین قومی اسمبلی توڑ لئے گئے۔

2004ء میں بینظیر بھٹو نے سعودی عرب میں میاں محمد نواز شریف سے ملاقات کی اور پاکستان میں آمریت کے خاتمے کے لئے مل کر جدوجہد کرنے پر صلاح مشورے ہوئے۔2006ء میں بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان لندن میں میثاق جمہوریت پر دستخط ہوئے جس میں فوج کو سیاست سے دور رکھنے پر زور دیا گیا اور اس کے لئے مل کر جدوجہد کرنے کی یقین دہانی ہوئی۔27 جولائی 2007ء میں پیپلز پارٹی اور صدر پرویز مشرف کے درمیان رابطے کامیاب ہوئے اور بینظیر بھٹو اور صدر پرویز مشرف کے مابین ابوظہبی میں ملاقات ہوئی جس کے بعد 18 اکتوبر 2007ء کو بینظیر بھٹو نے پاکستان واپس آکر پرامن جدوجہد کا آغاز کیا مگر اسی روز وہ خودکش حملہ میں بال بال بچ گئیں مگر 27 دسمبر 2007ء کو وہ ایک خودکش حملہ آور کا نشانہ بن گئیں اور راولپنڈی لیاقت باغ میں شہید ہوگئیں۔

بھٹو خاندان نے ہمیشہ جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لئے کام کیا۔ذوالفقار علی بھٹو نے جان قربان کر دی مگر آمریت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ان کے لئے شاہنواز بھٹو نے بھی آمریت کے خلاف لڑتے ہوئے جان دی۔ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو صوبہ سندھ میں ہی قتل کر دیا گیا۔ذوالفقار علی بھٹو کی آخری نشانی بینظیر بھٹو 54 سال کی عمر میں دُنیا سے چلی گئیں۔

پیپلز پارٹی کو وفاق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔پیپلز پارٹی واحد جماعت ہے جس کا ووٹ بینک چاروں صوبوں بشمول آزاد کشمیر اور قبائلی علاقہ جات میں موجود ہے۔پاکستان کی وحدانیت اور اتحاد جن ملک دشمن عناصر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے انہی دشمنوں کی آنکھوں میں پیپلز پارٹی بھی ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے کیونکہ اس جماعت نے پاکستان کو ایک تسبیح میں پرو کر رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بینظیر بھٹو کو چاروں صوبوں کی زنجیر قرار دیا جاتا رہا ہے۔

بینظیر بھٹوایک بہادر خاتون تھیں جنہوں نے تمام مشکل حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

پاکستان پر جب بھی مشکل وقت آیا بینظیر بھٹو پاکستان کو مشکلات کی گرداب سے نکالنے کے لئے آگے بڑھیں۔ بینظیر بھٹو کو پاکستان واپس آنے کے بعد مختلف اطراف سے قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں بلکہ ایک وقت پر تو بینظیر بھٹو نے سابق وزیر اعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم اور سابق وفاقی وزیر اعجاز الحق پر بھی الزام لگایا کہ یہ لوگ مجھے مروانا چاہتے ہیں۔ اب یہ واقعہ کس نے کیا اس بات کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ کے اثرات دور رس اور انتہائی خطرناک ہوں گے۔

سانحہ کے خلاف پاکستان پیپلز پارٹی نے 40 روز کا سوگ کا اعلان کیا ہے۔ سانحہ کے روز زرداری ہاؤس میں مخدوم امین فہیم، راجہ پرویز اشرف اور دیگر رہنماؤں نے ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں سوگ کا اعلان کیا اور اس سانحہ کی ایماندارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ مخدوم امین فہیم نے بتایا کہ جلسہ گاہ سے جلسہ ختم ہونے کے بعد بینظیر بھٹو، ناہید خان اور میرے ہمراہ گاڑی میں بیٹھیں ایک طرف ناہید خان اور دوسری طرف میں بیٹھا تھا درمیان میں بینظیر بھٹو تھیں۔ بینظیر بھٹو کارکنوں کے نعروں کا جواب دینے کے لئے سن روف کھول کر گاڑی سے اوپر آگئی جیسے ہی گاڑی چلی تو فائرنگ کی آوازیں آئیں اور اسی وقت دھماکہ ہوا۔ دھماکہ کی آواز کے بعد ہم گاڑی سے نیچے اُتر آئے اور بینظیر بھٹو کو گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جایا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال گیا اگر بینظیر بھٹو گاڑی سے باہر نہ آتیں تو وہ بچ سکتی تھیں۔

مخدوم امین فہیم نے پیپلز پارٹی کی قیادت بارے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت بھٹو خاندان کی امانت ہے قیادت بارے بعد میں فیصلہ کیا جائے گا۔

مسلم لیگ (ن) نے اس سانحہ پر احتجاجاً عام انتخابات 2008ء کے بائی کاٹ کا اعلان کر دیا۔ سانحہ کے بعد پاکستان مسلم لیگ (ن) کا اعلیٰ سطحی اجلاس میاں نواز شریف کی قیادت میں منعقد ہوا۔ بعد ازاں میاں نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس میں بائی کاٹ کے بارے میں بتایا اور مطالبہ کیا کہ ملک میں قومی حکومت قائم کی جائے۔

میاں نواز شریف نے انتخابات کے بائی کاٹ بارے پیپلز پارٹی کو بھی آگاہ کر دیا ہے۔ ملک بھر میں عام ہڑتال کی گئی۔ ہڑتال میں تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے حصہ لیا اور پیپلز

پارٹی سے یک جہتی کا ثبوت دیا۔ دوسری طرف اے پی ڈی ایم نے عام انتخابات کے خلاف چلائی جانے والی تحریک معطل کرتے ہوئے ملک بھر میں شٹر ڈاؤن کیا۔

بینظیر بھٹو شہید ہو کر امر ہو گئیں پوری قوم آبدیدہ ہے یہ اتنا بڑا سانحہ ہے کہ شاید اسے مدتوں نہ بھلایا جا سکے۔ بھٹو خاندان میں قربانی دینے کا سلسلہ بینظیر بھٹو تک جا پہنچا۔ بینظیر بھٹو لاڑکانہ میں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو اور اپنے دونوں بھائیوں کے پہلو میں دفن ہو کر امر ہو گئیں۔

پاکستان 60 سال میں ایک اور تاریخی اور افسوس ناک سانحہ سے دو چار ہوا ہے۔ 27 دسمبر 2007ء کی تاریخ کو ملکی تاریخ کے سیاہ ترین دنوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس روز نہ صرف پاکستان پیپلز پارٹی کی قائد، مقبول عوامی لیڈر، اسلامی دُنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم کو راولپنڈی کے اسی لیاقت باغ میں جلسہ عام کے بعد گولی اور مبینہ خودکش حملے کا نشانہ بنایا گیا جہاں 16 اکتوبر 1951ء کو ملک کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کو ایک جلسہ عام میں گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملک اپنے حصوں کے بنیادی مقاصد کے حصول میں نہ صرف ناکام رہا بلکہ اس کے بعد مسلسل سنگین سانحات سے دو چار ہوتا رہا بالآخر 1971ء میں ملک دولخت ہو گیا۔ بینظیر بھٹو کا قتل صرف ایک سیاسی رہنما کا قتل نہیں بلکہ جمہوریت، ملکی وحدت، وفاق کی علامت اور عوامی اتحاد کا قتل ہے۔ بینظیر بھٹو کے خیالات، تفکرات، نظریہ، سیاست اور مستقبل کے حوالے سے پالیسیوں سے لاکھ اختلاف سہی مگر اس حقیقت کو کوئی بھی باشعور آدمی تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا ہے کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف اس ملک کے 2 واحد لیڈر ہیں جن کو وفاق کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں نواز شریف کے مقابلے میں بینظیر بھٹو زیادہ اثر انداز تھیں۔ پی پی پی کے جیالوں کا یہ نعرہ کسی حد تک صداقت پر مبنی ہے کہ چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر بے نظیر 27 دسمبر 2007ء کو شام 6 بج کر 10 منٹ پر بینظیر بھٹو کے خالق حقیقی سے جا ملنے کے ساتھ ہی ملکی وحدت اور وفاق کی ایک علامت کا خاتمہ ہوا۔ ان کے قتل کی خبر خیبر کے پہاڑوں سے کراچی کے ساحلوں، گلگت بلتستان کی حسین وادیوں سے بلوچستان کے ریگستانوں، آزاد کشمیر کے سبزہ زاروں سے پنجاب کے میدانوں تک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور یقین نہ کرتے ہوئے بھی ایک ہی لمحے میں پاکستان، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان کا شاید ہی کوئی ضلع تحصیل، ٹاؤن، تعلقہ، یونین کونسل،

گاؤں، محلہ اور گلی ایسی ہو جہاں شدید دکھ اور غم وغصے کا اظہار نہ کیا گیا ہوگا۔ ایک اندازے کے مطابق مجموعی طور پر ملک بھر میں 3 ہزار سے زائد چھوٹی بڑی گاڑیاں، 5 ہزار سے زائد املاک اور ادارے نذرِ آتش جبکہ 35 سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے تھے، جبکہ ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ شدید لوٹ مار کا سلسلہ بھی تین روز تک جاری رہا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس ملک میں کوئی قانون نہیں اور خانہ جنگی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بینظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ انہیں اپنی عمر کے 54 سال میں کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ 4 اپریل 1979ء میں ان کے والد کا عدالتی قتل ہوا۔ بعد ازاں 1980ء میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ نواز کو زہر دے کر قتل کیا گیا اور 20 ستمبر 1996ء میں بینظیر بھٹو کے اپنے ہی دورِ حکومت میں ان کے اکلوتے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو ان کے گھر کے باہر پولیس فائرنگ کے نتیجے میں قتل کیا گیا۔ جس کے بعد ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو، شوہر، چھوٹے بیٹے اور بالآخر اپنے جواں سال بیٹے کے قتل کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔ پی پی کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ کہنے کو تو بیگم نصرت بھٹو زندہ ہیں مگر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد وہ صرف ایک زندہ لاش ہیں۔ جس کو دُنیا و مافیا کا کوئی علم نہیں ہے۔ بینظیر بھٹو کے قتل کے ساتھ جہاں بھٹو خاندان کی سیاست کا خاتمہ نظر آ رہا ہے وہیں اس ملک کا اتحاد، وفاق اور جمہوریت بھی شدید خطرات سے دوچار ہوگئی ہے۔ بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد عوامی ردِعمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس ملک کی واحد مقبول عوامی لیڈر تھیں۔ بینظیر بھٹو کا قتل ایسے موقع پر ہوا ہے جب ملک میں عام انتخابات صرف 12 دن کے فاصلے پر تھے اور ملک کی 7 میں سے 3 اکائیاں شدید خلفشار کا شکار ہیں۔ بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد ملک میں نہ صرف عام انتخابات کا انعقاد ناممکن نظر آ رہا تھا بلکہ اگر سیاسی فوجی اور انتظامی قیادت نے ہوش کے ناخن نہیں لئے تو ملکی اتحاد کو خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں۔ ہونا تو یہی چاہئے فوری طور پر 8 جنوری 2008ء کے عام انتخابات کو موخر کرنے کا اعلان کیا جائے اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے اس بہتر اور مناسب مشورے پر عمل کرتے ہوئے نگراں حکومت تمام مذہبی، سیاسی اور اہم سماجی جماعتوں اور تنظیموں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کرے جس میں مستقبل کے خدوخال کے حوالے سے باہمی مشاورت سے فیصلے کئے جائیں۔ اب اس میں بنیادی ذمہ داری صدر پرویز مشرف، چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور نگراں وزیر اعظم محمد میاں

سومرو پر عائد ہوتی ہے۔ ملک جن مشکل حالات سے گزر رہا ہے اس میں ہر شخص کو اپنی انا، ذاتیات اور اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ملکی بقاء اور سلامتی کا مسئلہ ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے 40 روزہ سوگ، میاں نواز شریف، اسفند یار ولی اور جمعیت علماء پاکستان نورانی گروپ کی جانب سے انتخابات کے بائی کاٹ اور دیگر جماعتوں کی جانب سے احتجاج کے اعلان کے بعد ملک میں 8 جنوری 2008ء کے انتخابات بے معنی، عوام سے مذاق اور ملک دشمنی کے مترادف ہوں گے۔ حکمرانوں کی یہ بھول ہوگی کہ وہ اقتدار کے زور پر بینظیر بھٹو کے قتل کے منفی اثرات کو زائل کریں گے اگر اس مشکل وقت میں بھی ہوش کے ناخن نہیں لئے گئے تو (اللہ نہ کرے) کہ سندھی بھی بلوچوں کی طرح مایوسی کا شکار نہ ہوں کیونکہ لیاقت علی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور اب بےنظیر بھٹو کا قتل پنجاب (راولپنڈی) میں ہوا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے بینظیر بھٹو پر قاتلانہ حملے کے خدشات کے اظہار کے باوجود حکومت نے مناسب انتظامات کیوں نہیں کئے اگر کئے تھے تو قاتل اتنے قریب کیسے پہنچا جبکہ 18 اکتوبر 2007ء کو بینظیر بھٹو کو وطن واپسی کے موقع پر حملہ ہو چکا تھا جس میں 135 سے زائد افراد جاں بحق اور 500 سے زائد زخمی ہوئے۔ جن لوگوں نے بینظیر بھٹو کو نشانہ بنایا اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ملک کی ایک مقبول جماعت ختم ہوگی تو یہ ان کی بھول ہے۔ بینظیر بھٹو کا خون پی پی پی کو مزید پروان چڑھائے گا۔ اس کا انحصار بھی پی پی کی قیادت کی بصیرت اور اتحاد پر ہے۔ مسلم لیگ (ن) کے بعد جمعیت علماء اسلام (ف) کے قائد مولانا فضل الرحمٰن کو بھی چاہئے کہ وہ فوری طور پر عام انتخابات کا بائی کاٹ کریں ورنہ شدید عوامی ردِعمل نہ صرف ان کے بلکہ مذہبی طبقے کے لئے بھی مشکلات پیدا کر دے گا۔ دانشمندی اور بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں فوری طور پر انتخابات کے بائی کاٹ کا اعلان کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کی احتجاجی تحریک میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے۔ پی پی کی قیادت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بینظیر بھٹو کے قتل کی ذمہ داری فوری طور پر مبینہ انتہا پسندوں پر ڈالنے کی بجائے اس کا باریک بینی سے جائزہ لے اور بین الاقوامی، قومی اور علاقائی عناصر کے کردار پر بھی غور کرے کہیں یہ ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سازش کا شاخسانہ تو نہیں۔ اس ضمن میں بعض حکومتی ذمہ داروں کے پروپیگنڈوں اور بیانات پر بھی انتہائی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اب پوری قوم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے

اتحاد اور یک جہتی سے عالمی سازشی عناصر کی سازشوں کو ناکام بناتے ہوئے بینظیر بھٹو کے قاتلوں کی گرفتاری اور ان کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو بینظیر بھٹو کے قتل کا مقصد ملکی وحدت اور اتحاد کو پارہ پارہ کرتے ہوئے امریکی تھنک ٹینک کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ہے جس میں 2025ء میں پاکستان کی شکل میں صرف پنجاب کو دکھایا گیا ہے اور اسی نقشے میں بلوچستان، سندھ دیش اور پختونستان نامی ریاستوں کا بھی ذکر ہے۔ بینظیر بھٹو کا قتل مقامی سے زیادہ عالمی سازشوں کا حصہ محسوس ہوتا ہے اور عالمی عناصر اب اس ملک میں مذہبی اور سیکولر طبقے کے مابین فساد کا بیج بونے کی کوشش کریں گے۔

تاریخ خود کو دہراتی ہے!

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن سابق وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو 27 دسمبر 2007ء جمعرات کی شام لیاقت باغ کے جلسہ عام میں شرکت کے بعد واپسی پر ایک خودکش حملہ آور کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ وہ ایک جرأت مند اور دلیر سیاسی رہنما تھیں، موت کی دھمکیوں پر وہ ایک بات دوہراتی تھیں کہ ''جو رات قبر میں آنا ہے وہ رات باہر نہیں گزر سکتی۔'' 18 اکتوبر کو کراچی آمد پر ان کے قتل کی خوفناک سازش ناکام ہوگئی جس میں پارٹی کے 70 سے زیادہ کارکن جاں بحق اور 500 کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ جمعرات کو راولپنڈی کے جلسہ عام سے ایک دن قبل بدھ کے روز انہوں نے پشاور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اس موقع پر ایک شخص کو دھماکہ خیز مواد سمیت پکڑ لیا گیا۔ دو ہفتے قبل وزارت داخلہ کی طرف سے پیپلز پارٹی کی قیادت کو خبردار کیا گیا تھا کہ بینظیر بھٹو پر 21 سے 25 جنوری کے درمیان حملوں کا خطرہ ہے۔ ان تمام خطرات، خدشات اور خود پر ہونے والے ایک خوفناک حملہ کے باوجود بینظیر بھٹو نے ایک نڈر رہنما ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ میں اپنے عوام سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ جلسوں سے بلٹ پروف کیبن کے بغیر شرکت کرتی تھیں۔ جلسوں میں تقریر کے دوران بھی وہ عوام کے سامنے بغیر بلٹ پروف شیشوں کی رکاوٹ کے کھڑی ہوتیں۔ لیاقت باغ کے جلسہ عام میں بھی وہ عوام کے سامنے کھلے سٹیج پر موجود تھیں اور ان کے سامنے کوئی بلٹ پروف رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ اپنے اس جلسہ میں بینظیر بھٹو نے دہشت گردوں کو للکارتے ہوئے کہا کہ ''انتہا پسند اور دہشت گرد عوام کو یرغمال نہیں بنا سکتے۔'' سوات، شمالی علاقہ جات اور قبائلی علاقہ جات میں پاکستان کا پرچم دوبارہ لہرایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے دہشت گردوں کو چیلنج دیا اور جرأت و بہادری کے ساتھ ایک خودکش حملہ آور کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ بینظیر بھٹو ملک کی دو مرتبہ وزیر اعظم رہیں۔ وہ وفاق کی علامت تھیں اور ان کے جلسوں میں ایک نعرہ ہمیشہ لگایا جاتا تھا۔ ''چاروں صوبوں کی زنجیر، بے نظیر، بے نظیر'' بظاہر یہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ بینظیر

بھٹو سندھ میں قوم پرستوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج تھیں۔ جی ایم سید کی سندھ میں بے پناہ عزت اور توقیر کے باوجود سندھ میں قوم پرستوں کو کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بینظیر بھٹو نے بلوچستان میں فوجی آپریشن کی بھرپور مخالفت کی، کوئٹہ کے زرغون سٹیڈیم کے جلسہ عام میں انہوں نے واضح اعلان کیا کہ تمام لاپتہ بلوچ نوجوانوں کو بازیاب کرایا جائے گا۔ فوجی آپریشن ختم کر کے اسیر رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے گا جبکہ بلوچستان میں عام معافی کا اعلان کیا جائے گا۔ اپنے مردان کے جلسہ عام کے دوران بینظیر بھٹو نے پنجاب کے عوام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے استحکام میں پنجاب کا کردار بہت اہم ہے۔ پنجاب نے ہمیشہ قربانیاں دیں۔ 1965ء کی جنگ میں پنجاب کے نوجوان بھارتی ٹینکوں کے سامنے سینے پر بم باندھ کر دیوار بن گئے۔ ایک چھوٹے صوبے کی وفاق پرست قد آور سیاسی رہنما کی طرف سے پنجاب کو خراجِ تحسین پیش کرنا صرف بینظیر بھٹو جیسی رہنما کے لئے ممکن تھا۔ اب بھٹو خاندان میں صرف بزرگ اور علیل رہنما نصرت بھٹو باقی بچی ہیں۔ بھٹو خاندان کے تمام افراد غیر فطری موت کا شکار ہوئے ہیں ذوالفقار علی بھٹو، میر شاہنواز بھٹو، میر مرتضٰی بھٹو اور بینظیر بھٹو۔ اہل پنجاب پر اب یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سندھیوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کریں۔ راولپنڈی میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی پھانسی گھاٹ سے دو کلومیٹر دور آج ان کی بیٹی خودکش حملہ کی نذر ہو گئیں۔ اسی لیاقت باغ میں ایک سابق وزیراعظم لیاقت علی خان کو بھی پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا تھا جبکہ قاتل کو بھی موقع واردات پر ختم کر دیا گیا تھا۔ خودکش حملہ آور بھی ہدف پر حملہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل پر بھی اسرار کا پردہ پڑا رہے گا۔

▪ ▪ ▪

بے نظیر بھٹو (1953-2007)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن اور سابق وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو پیدا ہوئیں۔ انہیں پہلے جیننگز نرسری سکول اور بعد ازاں کانونٹ سکول کراچی میں داخل کرایا گیا۔ دو سال کی تعلیم کے بعد وہ راولپنڈی منتقل ہو گئیں جہاں انہیں پریزینٹیشن سکول کانونٹ راولپنڈی میں داخل کرایا گیا۔ بعد ازاں وہ مری میں کانونٹ سکول میں زیر تعلیم رہیں۔ انہوں نے 15 سال کی عمر میں او لیول کا امتحان پاس کیا جس کے بعد اے لیول مکمل کرنے کے لئے انہیں کراچی گرامر سکول میں داخل کرایا گیا۔ پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بینظیر بھٹو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلی گئیں جہاں وہ 1969ء سے 1973ء تک ریڈکلف کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہیں، جہاں سے انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کا اگلا مرحلہ انہوں نے برطانیہ میں مکمل کیا جہاں انہوں نے 1973ء سے 1977ء تک لیڈی مارگریٹ ہال آکسفورڈ میں فلسفہ سیاسیات اور اکنامکس کے مضامین پڑھے۔ انہوں نے آکسفورڈ سے انٹرنیشنل لاء اور ڈپلومیسی کے مضامین میں بھی کورس کیا۔ 1976ء میں انہیں آکسفورڈ یونین کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ پہلی ایشیائی خاتون ہیں جنہیں اس باوقار ڈبیٹنگ سوسائٹی کا سربراہ بننے کا موقع ملا۔ 18 دسمبر 1987ء کو ان کی آصف علی زرداری سے شادی ہوئی۔ ان کے تین بچے ہیں جن کے نام بلاول، بختاور اور آصفہ ہیں۔ ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی صدر تھے جو ملک کے صدر اور وزیراعظم رہے۔ 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کے الزام میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے خلاف مقدمہ بنایا گیا اور انہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ انہیں راولپنڈی کی جیل میں 4 اپریل 1979ء کو پھانسی دی گئی جہاں اب جناح پارک کے نام سے ایک پارک بنایا گیا ہے۔ بینظیر بھٹو نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں یہ پارک اپنے والد کی یاد میں تعمیر کرایا تھا لیکن بعد میں اس کا نام

تبدیل کر دیا گیا۔ اپنے والد کی قید اور پھانسی کے دوران بینظیر بھٹو کو گھر پر نظر بند رکھا گیا۔
1984ء میں انہیں برطانیہ جانے کی اجازت ملی جہاں انہوں نے جلاوطنی کا دور گزارا۔ ان کے
بھائی شاہنواز بھٹو کو 1980ء میں فرانس میں پراسرار حالات میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا جبکہ
دوسرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو 1996ء میں ان کے اپنے وزارتِ عظمیٰ کے دور میں کراچی میں قتل کر
دیا گیا۔ 16 نومبر 1988ء کو ہونے والے عام انتخابات میں قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو سب
سے زیادہ نشستیں ملیں۔ 2 دسمبر کو بننے والی مخلوط حکومت میں محترمہ بینظیر بھٹو ملک کی پہلی خاتون
وزیراعظم بن گئیں۔ ایک مسلمان ملک کی یہ خاتون وزیراعظم اس وقت 35 برس کی تھیں۔ پیپل
میگزین نے انہیں 50 خوبصورت خواتین کی فہرست میں شامل کیا۔ 1989ء میں انہیں لبرل
انٹرنیشنل نے آزادی کا ایوارڈ دیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کرپشن کا الزام لگا کر 1990ء میں ختم
کر دی گئی۔ اس وقت ملک کے صدر غلام اسحٰق خان تھے۔ 1993ء میں وہ دوبارہ ملک کی وزیر
اعظم منتخب ہوئیں لیکن انہی کے پارٹی کے منتخب کردہ صدر فاروق احمد لغاری نے اختلافات کے بعد
1996ء میں ان کی حکومت ختم کر دی۔ نواز شریف کے دورِ حکومت میں 1998ء میں محترمہ
بینظیر بھٹو نے جلاوطنی اختیار کر لی اور دوبئی میں مقیم ہو گئیں۔ طویل جلاوطنی کے بعد وہ 18 اکتوبر
2007ء کو کراچی واپس آئیں تو ان کا تاریخی استقبال کیا گیا لیکن ان کے جلوس میں بم دھماکہ
ہوا۔ خوش قسمتی سے محترمہ بینظیر بھٹو اس قاتلانہ حملے میں محفوظ رہیں لیکن اس واقعہ میں 136 افراد
شہید اور 450 زخمی ہوئے۔ دوسری مرتبہ 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں انتخابی
جلسہ سے خطاب کے بعد اس وقت ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جب وہ اپنی گاڑی میں سوار ہونے والی
تھیں۔ انہیں 54 برس کی عمر میں شہید کر دیا گیا۔ وہ 2 دسمبر 1988ء سے 6 اگست 1990ء تک
وزیراعظم رہیں، اس وقت ملک کے صدر غلام اسحٰق خان تھے جبکہ دوسرے دور میں وہ 19 اکتوبر
1993ء سے 5 نومبر 1996ء تک وزیراعظم کے عہدہ پر فائز رہیں۔ اس وقت وسیم سجاد اور
فاروق لغاری صدر مملکت کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے دختر مشرق Daughter of
The East نامی کتاب لکھ کر بہت شہرت حاصل کی۔ ان کی وفات سے بلاشبہ قومی سیاست کا
ایک اہم باب بند ہو گیا ہے، ان کے جانے سے قومی سیاست میں جو خلاء پیدا ہو گا اسے پر کرنے
میں ایک طویل عرصہ لگے گا۔ عالمی سطح پر ان کی قابلیت کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ انہیں برطانیہ اور
امریکہ کی بہترین جامعات میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا تھا جو ملک کے لئے ایک اعزاز کی

بات ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کی قائد تھیں جو وفاق پر یقین رکھنے
والی جماعت ہے۔ وہ ایک نازک دور میں اور مشکل حالات میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر
پاکستان آئی تھیں اور ملک کو بحران سے نکالنے کا عزم رکھتی تھیں لیکن زندگی نے انہیں یہ مہلت نہیں
دی۔ ان کی شہادت پر ہر آنکھ پرنم اور ہر دل افسردہ ہے۔

بینظیر بھٹو وہ پہلی پاکستانی خاتون سیاستدان تھیں جو دو مرتبہ وزیراعظم کے عہدے پر
فائز ہوئی تھیں۔ نوآبادیاتی نظام اور استعماریت کے خاتمے کے بعد بینظیر بھٹو پہلی خاتون تھیں
جنہیں کسی مسلمان ملک کی حکمرانی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بینظیر بھٹو جمعرات کو لیاقت باغ
راولپنڈی میں جلسہ عام سے خطاب کے بعد جب واپس جانے لگیں ان پر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد
فائرنگ کی گئی اور ایک دھماکا بھی ہوا۔ انہیں گردن میں گولی لگی جس سے وہ شدید زخمی ہو گئیں اور
ہسپتال میں انتقال کر گئیں۔ صدر پرویز مشرف نگران وزیراعظم محمد میاں سومرو اور قومی شخصیات
نے اس اندوہناک سانحے پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

بینظیر بھٹو 8 سالہ جلاوطنی کے بعد جب 18 اکتوبر کو کراچی پہنچیں تو ان کے استقبالیہ
جلوس پر پہلا خودکش حملہ کیا گیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو اس حملے میں بال بال بچ گئیں اور کئی سو کارکن
جاں بحق ہو گئے تھے۔ تین ماہ میں بینظیر پر دوسرا خودکش حملہ ہوا اور پاکستان کی مقبول سیاسی رہنما
کو قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے 1988ء میں پہلی مرتبہ اقتدار سنبھالا مگر 20 ماہ کے بعد اس وقت کے
صدر غلام اسحٰق خان نے انہیں برطرف کر دیا۔ 1993ء میں بینظیر بھٹو دوبارہ اقتدار میں آئیں مگر
انہیں دوسری مرتبہ بھی کرپشن کے الزامات پر اس وقت کے صدر فاروق لغاری نے برطرف کر دیا۔
جس کے بعد بینظیر بھٹو 1998ء میں جلاوطن ہو کر دوبئی چلی گئیں اور صدر پرویز مشرف سے
مصالحت کے نتیجے میں وہ 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی پہنچی تھیں اور قومی مصالحتی آرڈیننس کے
تحت انہیں عائد الزامات سے بری الذمہ کر دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو کے سیاسی کیریئر کا آغاز
1977ء سے اس وقت ہوا تھا جب ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو جنرل ضیاء الحق نے
برطرف کر دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو بینظیر بھٹو کی سیاسی تربیت میں تمام کاوشیں بروئے عمل لائے
تھے اور سیاسی جانشین کے طور پر ان کی تربیت کی تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو
نے اقتدار سنبھالا تو ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ایک شکست خوردہ قوم کے اعتماد کی بحالی اور
بھارت میں قید 90 ہزار پاکستانیوں کی رہائی تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی

بیٹی کو پہلی ذمہ داری سونپی اور بھارت میں قید پاکستانیوں کے لواحقین کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئیں۔ بینظیر بھٹو نے اس مقصد کے لئے اپنے تعلیمی کیریئر کی بھی پرواہ نہیں کی۔ بعد میں بھٹو مرحوم کی ہدایت پر خارجہ تعلقات کی باریک بینیوں سے آگاہی کے لئے دفتر خارجہ بھی جاتی رہیں۔

بینظیر بھٹو نے اپنے والد کی معزولی اور والدہ بیگم بھٹو کی نظر بندی کے بعد مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا اور پارٹی کی شریک چیئرپرسن کی حیثیت سے پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ ملک بھر میں انہوں نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف تحریک کو منظم کیا۔ بعد میں ان کی ملک بدری ہوئی اور چار سال کی جلاوطنی کے بعد وہ 10 اپریل 1986ء میں جب لاہور پہنچیں تو ان کا تاریخی استقبال کیا گیا۔

بینظیر بھٹو کا یہ عوامی استقبال درحقیقت جنرل ضیاء الحق کے اقتدار کا سورج غروب ہونے کا سبب بنا اور جنرل ضیاء الحق کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے آیا اور جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد 16 نومبر 1988ء کو ملک میں انتخابات ہوئے تو قومی اسمبلی میں ان کی پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور 2 دسمبر 1988ء کو انہوں نے 35 سال کی عمر میں وزیراعظم کے عہدے کا حلف اُٹھایا تھا۔ مگر 1990ء میں ان کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ 1993ء میں وہ دوبارہ وزیر اعظم بنیں اور پھر ان کی پارٹی کے صدر سردار فاروق لغاری نے بھی ان کی حکومت کو 4 نومبر 1996ء کو برطرف کر دیا۔

بینظیر بھٹو نے اپنے دونوں ادوار میں خواتین کے حقوق کے لئے سرگرم کردار ادا کیا۔ انہوں نے حدود آرڈیننس کے خلاف بھرپور آواز بلند کی۔ 1996ء جب طالبان نے کابل کا اقتدار سنبھالا اس وقت محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت تھی۔ موجودہ انتخابی مہم میں محترمہ بینظیر بھٹو نے طالبانائزیشن اور انتہا پسندی کے خلاف تقریریں کیں اور دہشت گردی کی کھل کر مذمت کرتی رہیں۔

بینظیر بھٹو اس لحاظ سے خوش قسمت تھیں کہ وہ دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی دو مرتبہ سربراہ حکومت بنیں اور اقتدار ان کے خاندان میں رہا۔ ان کے دادا سر شاہنواز بھٹو جونا گڑھ سے پرائم منسٹر تھے۔ ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو اسلامی دُنیا کی ہردلعزیز شخصیت اور پاکستان کے صدر اور وزیراعظم رہے اور پھر وہ خود پاکستان کی حکمران رہیں۔ اس کے ساتھ ہی محترمہ بینظیر بھٹو کی زندگی کا یہ تلخ پہلو بھی نمایاں ہے کہ اپنی زندگی میں انہوں نے اپنے والد اور دو بھائیوں کو کھویا۔ وہ وزیراعظم تھیں کہ ان کا بھائی قتل ہو گیا ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو گزشتہ دس

سال سے صاحب فراش ہیں۔ بیگم بھٹو بڑے حوصلے کی مالک خاتون ہیں کہ انہیں اب بینظیر بھٹو کی صورت میں ایک اور بڑا صدمہ برداشت کرنا ہوگا۔ بینظیر بھٹو کا قتل پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والی قوتوں کے لئے بڑا دھچکہ ہے۔ امریکی صدر بش نے اس واقعہ کو انتہائی المناک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہم پاکستانی عوام کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی تقریروں میں بڑی وضاحت کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو اپنی انتخابی مہم کا موضوع بنایا تھا۔

بینظیر بھٹو کے قتل پر صدر پرویز مشرف نے قوم سے خطاب کے دوران اس افسوس ناک سانحے پر آصف علی زرداری اور ان کے تینوں بچوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور محترمہ بینظیر بھٹو کے احترام میں تین دن کے قومی سوگ کا اعلان کیا ہے۔ قومی پرچم تین روز سرنگوں رہے گا۔ صدر نے کہا کہ یہ ظلم ان دہشت گردوں کا کام ہے جن سے ہم جنگ کر رہے ہیں۔ صدر مشرف کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کا خاتمہ کئے بغیر قومی ترقی ممکن نہیں۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل پر جس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومی قیادت پختہ شعور کی مالک ہے۔ قوموں کی زندگی میں چیلنجز اور نازک لمحات آتے ہیں۔ بینظیر بھٹو کا قتل یقیناً قومی امتحان ہے۔ قومی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نازک لمحے میں قوم کی درست سمت میں رہنمائی کرے۔ تاکہ ایک باوقار قوم کی طرح ہم اس بڑے چیلنج سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

شہادت پر حکومتی مؤقف اور ردِعمل

28 دسمبر کو ترجمان وزارتِ خارجہ بریگیڈئر (ر) جاوید اقبال نے سابق وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت اوران پر حملے کا ذمہ دار القاعدہ اور بیت اللہ محسود کو قرار دے دیا ہے اور کہا ہے کہ نواز شریف سمیت دیگر سیاست دانوں کو بھی خطرہ ہے۔ انہیں حکومت سے تعاون کرنا چاہئے۔ بینظیر بھٹو کی موت گولی لگنے یا خودکش حملے کی وجہ سے اُڑنے والے چھرے لگنے سے نہیں ہوئی بلکہ ان کی موت بلٹ پروف گاڑی کی سن روف کا لیور لگنے سے واقع ہوئی ہے۔ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ترجمان وزارتِ داخلہ بریگیڈئر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے کہا کہ حکومت اس سانحہ پر قومی جذبات کی قدر کرتی ہے اس پر صدرِ مملکت نے تین روز کے سوگ کا اعلان کیا ہے اور ہم عوام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ پرامن رہیں تا کہ دہشت گردوں کی طرف سے درپیش بحران سے نمٹا جا سکے۔ حکومت نے بینظیر بھٹو کو ہر ممکن سیکورٹی فراہم کی تھی موت کی وجوہات کے حوالے سے بہت پہلے خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے ہم حکومت کا دفاع نہیں کرتے۔ یہ بڑا المیہ ہے جس پر سب کو دُکھ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے تحفظ کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے۔ ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مل کر انہوں نے خود ضابطہ اخلاق بنایا تھا جس پر عملدرآمد کیا گیا۔ تمام لوگوں کی تلاشی لی گئی، بینظیر بھٹو بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرنے کے بعد بلٹ پروٹ گاڑی میں دیگر ساتھیوں کے ساتھ باہر نکلیں اور آگے جا کر انہوں نے لوگوں کے نعروں کا جواب دینے کے لئے سن روف کھلوائی اور کھڑی ہو گئیں، ہاتھ لہرائے۔ بریگیڈئر چیمہ نے کہا کہ خودکش حملہ آور اس گاڑی کے بائیں طرف تھا اس دوران تین فائر بھی ہوئے لیکن خوش قسمتی سے کوئی بینظیر بھٹو کو نہیں لگا۔ اس کے بعد دھماکہ ہوا جب خودکش حملہ آور نے خود کو اُڑا دیا، بینظیر بھٹو نے اس موقع پر گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، دھماکے کے دباؤ کے باعث ان کا سر سن روف کے لیور

پر دائیں سائیڈ پر لگا جس سے دماغ پر بہت زیادہ چوٹ آئی جو ان کی موت کا سبب بنی۔ اگر انہیں کوئی اور چیز لگتی تو بائیں طرف متاثر ہوتیں۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی شخص نے فائر اور دھماکہ کیا ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ دو افراد ہوں۔ واقعہ کی دو انکوائریاں ہو رہی ہیں ایک جج کے ذریعے اور دوسری ایڈیشنل آئی جی پنجاب کر رہے ہیں۔ انہیں ماہرین اور انٹیلی جنس اداروں کی مدد حاصل ہے۔ یہ اللہ کی مرضی تھی اگر محترمہ باہر نہ آتیں تو ہوسکتا تھا کہ بچ جاتیں کیونکہ گاڑی میں جو لوگ بیٹھے تھے جن میں مخدوم امین فہیم اور ایس ایس پی امتیاز شامل ہیں وہ بالکل محفوظ رہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورتِ حال کو کنٹرول کیا مگر کچھ مجرم عناصر نے لوٹ مار کی اور بنکوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اگر تباہی کا یہ عمل جاری رہا تو دہشت گردوں کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے اس صورتِ حال میں فوج بلا لی ہے جسے اندرونِ سندھ اور کراچی کے بعض حصوں میں متعین کیا جا رہا ہے اور ہم مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں گے۔ بینظیر بھٹو دہشت گردوں اور القاعدہ کی ہٹ لسٹ پر تھیں، ہم نے پہلے بھی کچھ ٹیلی فون کالز ٹریس کی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ بیت اللہ محسود بھی بینظیر بھٹو کو قتل کرنے کے لئے کوشاں تھے اور گزشتہ صبح بھی ہم نے بیت اللہ محسود کی ایک کال ٹریس کی ہے جو پشتو میں تھی اور اس واقعہ پر بیت اللہ محسود اپنے دوستوں کو مبارکباد دے رہا تھا۔ بریگیڈئر چیمہ نے کہا کہ ہمارے پاس اس امر کے ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں کہ القاعدہ پاکستان میں عدم استحکام پیدا کرنا چاہتی ہے۔ کراچی میں بھی القاعدہ اور طالبان نے بینظیر کے قافلے پر حملہ کیا۔ ہم عوام کے تعاون سے ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آصف علی زرداری نے خود کہا تھا کہ ہماری فیملی پوسٹ مارٹم نہیں چاہتی تاہم ڈاکٹروں نے بینظیر بھٹو کے ایکسرے اور مکمل بیرونی جائزہ لیا تھا جس سے موت کی وجہ معلوم ہوئی ہے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ اب تک کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ تاہم اس بارے میں آپ کو بتا دیا گیا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کے سیکورٹی ایڈوائزر سے ہمارا رابطہ ہے اس لئے ہم نے گزشتہ روز لیاقت باغ سے ان کی ریلی روک دی تھی کیونکہ خطرہ تھا۔ بدقسمتی سے سیاسی جماعتوں نے وزارتِ داخلہ کے جاری کردہ ضابطہ اخلاق کو اہمیت نہیں دی۔ صدر اور وزیراعظم بھی سیکورٹی ماہرین کی رائے پر عمل کرتے

ہیں۔ اب بھی دیگر سیاست دانوں کو خطرہ ہے جن میں نواز شریف، مولانا فضل الرحمٰن، شیخ رشید، آفتاب شیر پاؤ اور دیگر شامل ہیں۔ توقع ہے کہ یہ لوگ ہم سے تعاون کریں گے۔ کسی سیاسی لیڈر کو وہ سیکورٹی نہیں دی گئی جو بینظیر بھٹو کو دی گئی تھی۔ خودکش حملہ آور کی اب تک شناخت نہیں ہوئی جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ بیت اللہ محسود کی ٹیلی فون کالز ٹریس کر چکے ہیں اب تک اسے گرفتار کیوں نہیں کیا گیا تو بریگیڈیئر چیمہ نے کہا کہ کہنا آسان اور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ نقل وحرکت کرتے رہتے ہیں اس لئے بچتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ دو تین دن میں امن وامان بہتر ہو جائے گا۔ دریں اثناء بینظیر کی شہادت کے حوالے سے صدر مشرف کو یہ ابتدائی رپورٹ پیش کر دی گئی ہیں۔ لائن کے مطابق بینظیر بھٹو پر بین الاقوامی میڈیا مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کر کے ان کی شہادت کی ذمہ داری القاعدہ و طالبان پر ڈال رہا ہے۔ اٹلی کے ایک خبر رساں ادارے اے کے آئی کے مطابق القاعدہ کے ایک کمانڈر اور مرکزی ترجمان مصطفیٰ ابوالزید نے نامعلوم مقام سے ٹیلی فون پر خبر رساں ادارے کو بتایا کہ القاعدہ بینظیر بھٹو کے قتل کی ذمہ دار ہے۔ ترجمان القاعدہ کا کہنا تھا کہ القاعدہ کے نائب ایمن الظواہری نے اس کی منصوبہ بندی رواں سال اکتوبر میں تیار کی تھی۔ ترجمان نے کہا کہ ہم نے امریکہ کے انتہائی قیمتی اثاثے کو ختم کر دیا ہے جس نے مجاہدین کو شکست دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ ترجمان نے بتایا کہ عسکریت پسندوں کو شکست دینے کے دعوے کرنے والی شخصیت کو قتل کر دیا گیا ہے اور وہ امریکہ کے لئے اہم اثاثہ تھیں اور یہ عسکریت پسندوں کی ان افراد کے خلاف بڑی کامیابی ہے جو القاعدہ کے خلاف جنگ میں بے دین شخصیات کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خودکش حملہ القاعدہ سے منسلک گروپ لشکر جھنگوی نے کیا ہے۔ ادھر ایشیاء ٹائم کے مطابق پاکستانی خفیہ اداروں نے گزشتہ دنوں عسکریت پسند لیڈر اور مذہبی رہنما مولانا اسد اللہ خالد کی گفتگو بھی ریکارڈ کی تھی جس کے بعد مولانا اسد اللہ خالد کو کراچی سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

○

اس مرحلے پر حکومت نے جو سکرپٹ بیت اللہ محسود کی ریکارڈنگ کے نام پر جاری کیا اس کا متن ملاحظہ فرمائیں:

مولوی صاحب: السلام علیکم!

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): وعلیکم السلام!

مولوی صاحب: امیر صاحب کیا حال ہے؟

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): ٹھیک ہے۔

مولوی صاحب: مبارک ہو، میں تو ابھی رات کو پہنچا ہوں۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): تمہیں بھی مبارک ہو۔ ہمارے بندے تھے؟

مولوی صاحب: وہاں ہمارے والے تھے؟

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): کون کون تھے؟

مولوی صاحب: سعید تھا، دوسرا بدروالا بلال تھا اور اکرام اللہ بھی تھا۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): تینوں نے کیا ہے؟

مولوی صاحب: اکرام اللہ اور بلال نے کیا ہے۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): پھر تو خیر مبارک!

مولوی صاحب: کہاں ہو؟ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): مکین میں ہوں۔ آجاؤ۔ میں انور شاہ کے گھر میں ہوں۔

مولوی صاحب: ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): فی الحال ان کے گھر میں اطلاع نہیں دینا۔

مولوی صاحب: ٹھیک ہے۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): زبردست کارروائی کی ہے۔ بڑے دلیر لڑکے تھے جنہوں نے اس کو ماری ہے۔

مولوی صاحب: ماشاءاللہ! جب میں آجاؤں تو تمہیں تفصیل سے آگاہ کردوں گا۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): میں آپ کا انتظار کروں گا۔ مبارک ہو۔ ایک دفعہ پھر مبارک۔

مولوی صاحب: خیر مبارک۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): کوئی خدمت؟

مولوی صاحب: بڑی مہربانی۔

امیر صاحب (بیت اللہ محسود): السلام علیکم!

مولوی صاحب: وعلیکم السلام!

o

پیپلز پارٹی نے اس کانفرنس کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے الزام لگایا کہ حکومت اصل قاتلوں کو چھپانے کا ڈھونگ کر رہی ہے اور یہ سب جھوٹ ہے۔ پیپلز پارٹی کا مطالبہ تھا کہ اس قتل کی تحقیقات کسی غیر ملکی تحقیقاتی ایجنسی سے کروائی جائے۔ حکومت نے بینظیر بھٹو قتل کیس کی تحقیقات غیر ملکی اداروں سے کرانے کا مطالبہ مسترد کر دیا ہے۔ نیشنل کرائسس مینجمنٹ سیل کے سربراہ بریگیڈیئر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے گزشتہ شام ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ بینظیر بھٹو کا قتل معمول کی مجرمانہ کارروائی نہیں ہے۔ یہ دہشت گردی ہے جس کی کڑیاں وزیرستان سمیت دیگر قبائلی علاقے سے ملتی ہیں۔ عالمی برادری پاکستان کے مخصوص حالات کو نہیں سمجھتی۔ سکارٹ لینڈ یارڈ سمیت کوئی غیر ملکی ادارہ ان علاقوں میں جا کر تحقیقات نہیں کر سکتا جہاں پشتو بولی جاتی ہے۔ اپنے ملکی حالات کو ہم سمجھتے ہیں اس لئے تحقیقات ہم خود کریں گے۔ ایک سوال کے جواب میں بریگیڈیئر (ر) چیمہ نے یہ تاثر مسترد کیا کہ ملک میں فوج مخالف جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے حالیہ ہنگاموں کو روکنے کے لئے فوج کی تعیناتی دانشمندانہ فیصلہ نہیں ہے۔ بریگیڈیئر چیمہ نے صحافیوں کو محترمہ بینظیر بھٹو کی موت کے بعد ملک بھر میں ہونے والے ہنگاموں کی تفصیلات بتائیں اور کہا کہ دو دنوں میں مختلف جیلوں سے ایک سو سے زائد مجرم فرار ہو گئے۔ اسی قسم کے شرپسند عناصر نے بینظیر بھٹو کے قتل کے خلاف احتجاج کی آڑ میں 174 بینک جلا دیئے۔ 26 بینکوں کو جزوی نقصان پہنچا۔ 58 دفاتر مکمل جل گئے۔ 23 کو جزوی نقصان پہنچایا گیا۔ 34 پٹرول پمپ جلا دیئے گئے۔ 2 کو جزوی نقصان ہوا۔ 370 گاڑیاں مکمل طور پر جلا دی گئیں۔ 72 بوگیوں کو آگ لگائی گئی۔ 18 ریلوے سٹیشن جلائے گئے۔ 4 کو جزوی نقصان ہوا۔ 765 دکانیں جل کر خاکستر ہو گئیں۔ 19 کو جزوی نقصان ہوا۔ دو دنوں میں 38 افراد ہنگاموں میں مارے گئے جبکہ 53 زخمی ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہفتے کو صدر اور وزیر اعظم کی زیر صدارت اجلاس میں چاروں صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ شرپسندوں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ انہیں گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمات قائم کئے جائیں۔ انہوں نے

امن و امان کی مجموعی صورتِ حال کو تسلی بخش قرار دیا اور کہا کہ ہفتے کو اکا دکا واقعات کے علاوہ مجموعی طور پر امن رہا۔ ایک دو دن میں حالات معمول پر آ جائیں گے۔ حکومت نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد متاثرین کو معاوضے کی ادائیگی کا فیصلہ کرے گی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ مسلم لیگ (ق) پنجاب کے صدر چوہدری پرویز الٰہی اور سرحد کے صدر انجینئر امیر مقام بھی دہشت گردوں کی موت کی وجوہات سے متعلق مختلف سوالات پر انہوں نے کہا کہ یہ اہم نہیں کہ بی بی کی موت کی وجہ کیا بنی، اصل بات یہ ہے کہ بی بی کی موت کی صورت میں قومی نقصان ہوا۔ حکومت نے سانحہ لیاقت باغ سے متعلق متعدد شواہد اکٹھے کر لئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم بینظیر بھٹو قتل کے حوالے سے میڈیا کو بیت اللہ محسود کی گفتگو بھی سنوائیں گے۔ بریگیڈیئر چیمہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اس قتل کے بعد ملک میں امن و امان کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے حکومت نے تمام انتظامات کر لئے ہیں۔ وفاقی و صوبائی حکومت کسی کو حالات بگاڑنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ اگر پیپلز پارٹی بینظیر بھٹو کی موت کی وجوہات پر مبنی رپورٹس پر یقین نہیں کرتی تو پیپلز پارٹی کے کہنے پر محترمہ کا پوسٹ مارٹم کروایا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان۔29 دسمبر 2007ء)

بریگیڈیئر جاوید اقبال چیمہ کے بیان کی نفی کرتے ہوئے محترمہ کو غسل دینے والی شیریں رحمٰن کا بیان اگلے روز آیا۔

اسلام آباد، واشنگٹن (آن لائن) پیپلز پارٹی کی مرکزی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمان نے کہا ہے کہ وزارتِ داخلہ کا بیان غیر ذمہ دارانہ اور پیپلز پارٹی کے ماتم کرتے کارکنوں اور سوگوار عوام کے زخموں پر نمک پاشی ہے۔ بینظیر کی شہادت کا مذاق نہیں اڑانے دیں گے۔ حکومت کو خون کا حساب دینا ہوگا۔ نجی ٹی وی اور امریکی ٹی وی کو انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ حکومت امن چاہتی ہے تو غیر ذمہ دارانہ بیانات سے گریز کرے۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کی گردن میں گولی لگی ہے۔ میں خود عینی شاہد ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت ہر چند گھنٹے بعد اپنے بیانات بدل رہی ہے۔ بینظیر بھٹو کی سیکورٹی مناسب نہیں تھی اور مجرمانہ غفلت کی ذمہ دار حکومت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم غیر جانبدارانہ تحقیقات چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 18 اکتوبر کے حملوں کے ملزمان کا بھی سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر نے صدر

مشرف کو نام بھی دیئے تھے لیکن حکومت صرف ریلی میں جانے سے روکتی رہی۔ سیکورٹی فراہم نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ باقی سیاست دانوں کے جلسوں میں دھماکے کیوں نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت عوام کے جذبات سے کھیل رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے جمہوریت کے لئے جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وزارتِ داخلہ کا بیان غیر ذمہ دارانہ اور سوگوار عوام کے زخموں پر نمک پاشی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر کے خون کا حساب لیں گے اور حکمرانوں کو بیانات بدل کر مذاق اُڑانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ راولپنڈی میں خودکش حملہ نہیں تھا۔

(روزنامہ پاکستان۔29دسمبر 2007ء)

اگلے روز بیت اللہ محسود کے حوالے سے یہ بیان شائع ہوا۔

پشاور (نیوز ایجنسیاں) قبائلی علاقہ جات میں مقیم جنگجو کمانڈر بیت اللہ محسود نے سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو کو قتل کرنے کے الزام کو مسترد کر دیا ہے۔ ہفتہ کو امریکی خبر رساں ادارے کو بیت اللہ محسود کے ترجمان نے بتایا کہ بینظیر بھٹو کے قتل میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ خبر رساں ادارے کے مطابق بیت اللہ محسود کے ترجمان مولانا عمر نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ان کا اس حملے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ ان کے خلاف جعلی اور من گھڑت الزامات لگائے جا رہے ہیں اور یہ حکومت، فوج اور ایجنسیوں کی سازش ہے۔ ترجمان نے کہا کہ کسی عورت پر حملہ کرنا قبائلی روایات کے منافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی طرف سے جاری کی گئی ٹیلی فونک گفتگو ایک ڈرامہ ہے۔ ہمیں بینظیر بھٹو کی موت پر افسوس ہے۔ ترجمان نے کہا کہ سیکورٹی کا گھیرا توڑ کر ریلی میں یہ حملہ کرنا عسکریت پسندوں کے لئے ایک ناممکن کام ہے۔ ترجمان نے کہا کہ بینظیر بھٹو صرف پاکستان کی نہیں بلکہ بین الاقوامی رہنما تھیں۔ ہمیں ان کے انتقال کا انتہائی دُکھ ہے۔ طالبان یا القاعدہ کی بینظیر بھٹو سے کوئی لڑائی نہیں۔ مولوی عمر نے کہا ہے کہ بینظیر بھٹو حکومت میں نہیں تھیں اور نہ ہی القاعدہ یا طالبان خاتون پر حملہ کرتے ہیں۔ ادھر مولوی عمر نے کسی نامعلوم مقام پر بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ بینظیر کا قتل ایک سیاسی معاملہ ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس میں حکومت یا اس کی ایجنسیاں ملوث ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ بھٹو خاندان کے ساتھ کافی عرصہ سے یہ سلسلہ جاری ہے، پہلے اس خاندان کے تین افراد ذوالفقار علی بھٹو، شاہنواز بھٹو اور مرتضٰی بھٹو کو قتل کیا گیا اور اب بےنظیر کو ہلاک کیا گیا

تو یہ وہی پرانی دُشمنی کا تسلسل ہے جو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے حکومت پاکستان نے دعویٰ کیا تھا کہ بینظیر بھٹو کی خودکش حملے میں ہلاکت کے ذمہ دار قبائلی علاقوں مین طالبان کے کمانڈر بیت اللہ محسود ہیں۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے بھی حکومت کے اس دعوے کو مسترد کیا ہے کہ حملے کے لئے بیت اللہ محسود ذمہ دار تھے۔ تحریک طالبان کے ترجمان مولوی عمر کے مطابق حکومت قبائلیوں کے لئے مشکلات پیدا کرنے اور انہیں کچلنے کے لئے اس قسم کے الزامات لگا رہی ہے۔ پہلے بھی حکومت نے یہ الزام لگایا کہ اسامہ بن لادن باجوڑ میں ہیں اور اب یہ الزام عائد کیا گیا ہے تو ان سب باتوں کا مقصد قبائلیوں کو بدنام کرنا ہے۔

(روزنامہ ایکسپریس۔30دسمبر 2007ء)

عالمی پریس کا خراجِ تحسین

امریکہ کے ممتاز ہفت روزہ جریدے ''نیوز ویک'' نے محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت پر شاندار الفاظ میں انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ جریدے کے سینئر اخبار نویس ایون تھامس نے بینظیر سے وابستہ یادوں کی باز آفرینی کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میں آج سے 35 برس قبل 1972ء میں پہلی بار بینظیر بھٹو سے ملا تھا۔ ہم دونوں امریکہ کے ممتاز ترین تعلیمی ادارے ہارورڈ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ بینظیر بھٹو میری ہم جماعت تھیں لیکن وہ کلاس فیلوز میں بینظیر بھٹو کے نام سے نہیں بلکہ پنکی کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ پنکی سے میرا مقابلہ اور مسابقہ رہتا تھا۔ ہم دونوں ہارورڈ یونیورسٹی کے میگزین ''دی کرمزن'' کے ایڈیٹر بننے کی دوڑ میں شامل تھے کیونکہ کرمزن کا ایڈیٹر بننا اس وقت بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔'' ایوان تھامس نے مزید لکھا ہے: ''خاصے عرصے بعد میں بینظیر بھٹو سے اس وقت ملا جب وہ پہلی بار وزیراعظم بننے سے قبل واشنگٹن آئی تھیں۔ ''واشنگٹن پوسٹ'' اور ''نیوز ویک'' کی مالک ایڈیٹر کیتھرین گراہم انہیں اپنے ساتھ نیوز ویک کے صدر دفتر لائیں تو میں نے ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ انہوں نے پہلی نظر میں ہی مجھے پہچان لیا۔ یہ ایک خوشگوار ملاقات تھی اور کیتھرین گراہم کے لئے ایک حیرت خیز خبر بھی کہ میں اور بینظیر کبھی ہارورڈ یونیورسٹی میں کلاس فیلو رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بینظیر بھٹو ایک نہایت ذہین، اعلیٰ بصیرت کی مالک اور مدبر سیاست دان بن چکی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور وہ شاندار سیاسی ورثہ جوان کے وزیراعظم والد چھوڑ کر گئے تھے، اسے انہوں نے احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ 27 دسمبر کو ان کی اچانک موت کی خبر سن کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔ انہیں قتل کر کے پاکستان کو بہت بڑا نقصان پہنچایا گیا ہے۔''

برطانیہ سے شائع ہونے والے معروف اخبار روزنامہ ''گارڈین'' نے محترمہ بینظیر بھٹو

کی شہادت کے حوالے سے ایک خصوصی رپورٹ شائع کی ہے۔ اخبار لکھتا ہے: ''پاکستان کی سیاسی تاریخ خون کے لاتعداد دھبوں سے مزین ہے۔ اس نے اپنے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کا خون کیا۔ دوسرے منتخب وزیراعظم کو پھانسی دی اور اب تیسرے سابقہ وزیراعظم کو قتل کر دیا ہے۔ بینظیر بھٹو کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی بھی طرح پر نہیں کیا جا سکے گا۔ بینظیر بھٹو کی انتہائی کوشش تھی کہ اپنے کردار سے پاکستان کے 16 کروڑ عوام کو حقیقی جمہوریت کے تحفے سے نوازیں۔ اسی لئے بہت سے خطرات اور خدشات اور بہت سی بہی خواہوں کے منع کرنے کے باوجود وہ پاکستان آئیں اور انہیں آتے ہی کراچی میں پونے دو سو کارکنوں کی شہادتوں سے نواز دیا گیا لیکن وہ ڈری نہیں۔ وہ اپنے ملک سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور اسی محبت میں انہوں نے جان ہار دی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اقتدار حاصل کرنے پاکستان آئی تھیں، بے بنیاد اور تعصب کی بات کرتے ہیں۔ بینظیر بھٹو کی موت عالمی برادری کو بتاتی ہے کہ پاکستان کس قدر خطرناک ملک بن چکا ہے اور یہاں دندنانے والے دہشت گردوں کو گھومنے پھرنے کی کتنی آزادی ہے۔ بینظیر بھٹو کا قتل اس امر کو بھی ظاہر کر رہا ہے کہ پرویز مشرف کی حکومت ایک ناکام انتظامیہ ہے اور یہ کہ وہ عالمی برادری کو آئے روز یہ جو باور کراتے رہتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کے خاتمے میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں یہ دعویٰ کس قدر خام ہے۔''

نیویارک سے شائع ہونے والے روزنامہ ''نیویارک پوسٹ'' نے بینظیر صاحبہ کی المناک شہادت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''پاکستان کا سیاسی نظام گل سڑ چکا ہے اور اس کی بنیادوں میں نفرت کارفرما ہے۔'' مذکورہ اخبار میں این ایس وینکٹ رامن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گولی نے بینظیر بھٹو کی زندگی کا تو خاتمہ کر دیا ہے لیکن وہ ان کے بینظیر کردار اور میراث کا خاتمہ نہیں کر سکتی، ہم عالمی برادری انہیں ایک بہادر اور غیور خاتون کی حیثیت میں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ان کی شہادت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم سب ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دہشت گردی کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالیں۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل کے حوالے سے امریکی روزنامہ ''واشنگٹن پوسٹ'' نے مختلف سیاست دانوں کے تاثرات شائع کئے ہیں۔ امریکہ کے صدارتی انتخاب کی دوڑ میں شریک مائیک ہکابی کا کہنا ہے کہ ہمیں پاکستان میں پیش آمدہ دہشت گردی کے واقعات پر سخت تشویش ہے، ہمیں افسوس ہے کہ پاکستان میں حالات دن بدن خطرناک صورتِ حال اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

اس موقع پر ہمیں پاکستانی عوام اور محترمہ کے خاندان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر ہم اس پر معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنا سکتے کیونکہ پاکستان میں ایمرجنسی اُٹھائے جانے کے باوجود ابھی تک مارشل لاء کے سے ہی حالات ہیں۔ ہیکابی کے مطابق پاکستان کے اندرونی حالات کی وجہ سے ہی وہاں کے باشندے اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک امریکہ ہے جہاں پاکستان سے آنے والے غیر قانونی تارکین وطن کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور یہ صورتِ حال امریکہ کے لئے خوش آئندہ نہیں کیونکہ آنے والوں میں مبینہ دہشت گردوں کی شمولیت کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔ اقوامِ متحدہ میں سابق امریکی نمائندے حالیہ میکسیکو کے نئے گورنر بل رچرڈسن نے پاکستان کی تازہ ترین صورتِ حال کے تناظر میں بش انتظامیہ پر زور دیا کہ وہ دہشت گردوں کے خلاف اپنے عزائم پر مضبوطی سے قائم رہے اور محترمہ بینظیر بھٹو کے ان عزائم کی تکمیل کے لئے پاکستان کے ساتھ تعاون کو مضبوط بنائے جو وہ دہشت گردی کے خلاف رکھتی تھیں۔ امریکہ کی طرف سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار دنیا کا دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ کے بارے میں منفی تاثر دور کرنے کے لئے امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں دی جانے والی امداد کے علاوہ پاکستان کی ہر قسم کی امداد بند کردے۔

محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے حوالے سے برطانوی اخبار فنانشل ٹائمز کے مصر ناطول لائیون کا کہنا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی شناخت بڑی حد تک موروثی جماعت کی سی ہے اور بینظیر بھٹو سیاسی لحاظ سے خانوادے کی آخری باا ثر نمائندہ تھیں۔ ان کے بغیر پارٹی کا متحد رہنا مشکل ہے اور غالب امکان یہ ہے کہ پی پی پی اب بکھر جائے گی۔ فی الحال اس سے صدر پرویز مشرف اور فوج کو فائدہ پہنچے گا لیکن مستقبل قریب میں بالآخر اسلامی قوتیں فائدہ اُٹھائیں گی۔ اخبار لکھتا ہے کہ اگر پی پی پی کی شکست و ریخت ہوئی تو مخلوط حکومتوں کی سرپرستی سے فائدہ اُٹھانے کی فوج کی صلاحت بہت بڑھ جائے گی جن میں پی پی پی کے افراد شامل ہوں گے۔ جنرل مشرف کو واشنگٹن سے معاملات طے کرنے میں غالباً زیادہ آسانی ہوگی، ان پر امریکی دباؤ کم ہو جائے گا کیونکہ امریکیوں کے پاس مشرف کی جگہ بٹھانے کے لئے کوئی مضبوط امریکی نواز سویلین لیڈر نہیں رہا۔ اس وقت جبکہ امریکہ جنرل مشرف کی انتظامیہ سے زیادہ سے زیادہ بیزار ہورہا ہے اور صدارتی اُمیدوار اوباما کھلم کھلا پاکستان کے خلاف تقریر کر

رہے ہیں، امریکی آپشنز بہت محدود ہو گئے ہیں۔ جنرل مشرف سے ہاتھ دھو بیٹھنا جس سے دہشت گردی کے خلاف ''جنگ'' اور جنگ افغانستان پر تباہ کن اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ میاں نواز شریف کے بارے میں اناطول کی رائے یہ ہے کہ ''وہ بہتر لیڈر کی ضرورت کے پیش نظر امریکی سرپرستی میں اُبھر سکتے ہیں، تاہم بینظیر کے برعکس جنرل مشرف اور نواز شریف میں اسلامی انتہا پسندی اور طالبان کے خلاف کوئی اتحاد نہیں ہوسکتا۔ نواز شریف نے یہ جانتے ہوئے کہ جنرل مشرف انہیں بطور وزیر اعظم قبول نہیں کریں گے۔ انہوں نے پارلیمانی انتخابات کا بائی کاٹ کر دیا ہے جو اب شاید ملتوی کر دیئے جائیں گے۔ تاہم ایک روز مسٹر شریف وزیر اعظم بننے کی بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ شمالی پنجاب میں ان کی مقبولیت بہت زیادہ ہے اور وہ قومی قد کاٹھ کے واحد اپوزیشن رہنما رہ گئے ہیں۔ اگر فوجی ہائی کمان نے کسی وقت جنرل مشرف کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے اور ملک کو جمہوریت کی پٹری پر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو وہ ان نواز شریف ہی کو آگے لائے گی۔'' اخبار کے مطابق اگر پی پی پی کے حصے بخرے ہوئے تو کہیں بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ سندھ کے لوگ اینٹی مہاجر ایجنڈے کے ساتھ خالص سندھی قوم پرست جماعتوں کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے۔ بینظیر بھٹو کی موت سے اسلام پسندوں کے لئے فوج اور پی پی پی کے اتحاد کا بڑا خطرہ دور ہوگیا ہے۔ اسلام پسند جماعتیں پاکستان کے کرپٹ اور ناکارہ نظامِ حکومت کی اصلاح کی علمبردار واحد قوت بن کر اُبھر سکتی ہیں لیکن اتنے انتہا پسند، مشتعل اور ہمسایہ افغانستان کی جنگ سے قوت یافتہ اتنے زیادہ انتہا پسند عناصر کی موجودگی میں داخلی بدامنی کا حقیقی خطرہ جنم لے سکتا ہے جس کا نتیجہ امریکی مداخلت اور ریاستی تباہی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کو قومی اتحاد کی حکومت درکار ہے جسے فوج کی حمایت حاصل ہو اور جس میں سرکردہ سیاست دان شامل ہوں۔

عالمی شہرت یافتہ ہفت روزہ جریدہ ''ٹائم'' نے بینظیر بھٹو کی شہادت پر اپنے احساسات اور تاثرات شائع کرتے ہوئے یوں لکھا ہے: ''27 دسمبر 2007ء بروز جمعرات بینظیر بھٹو کا بہیمانہ قتل دراصل بش انتظامیہ کی بھی ناکامی ہے۔ بش انتظامیہ مشرق وسطیٰ اور پاکستان میں جس انداز میں جمہوریت متعارف کروانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بینظیر بھٹو کی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ صدر بش کی پالیسیاں نہایت تلخ انداز میں ناکامی سے دوچار ہوئی ہیں۔ لبنان، عراق، افغانستان اور غزہ میں بھی بش انتظامیہ کے سیاسی اقدامات نامراد ہوئے

ہیں۔'' ہفت روزہ ٹائم نے مزید لکھا ہے: ''بینظیر بھٹو کے قتل کی ذمہ داری ایک طرح سے بش انتظامیہ پر بھی عائد ہوتی ہے کہ اس نے بینظیر بھٹو اور پرویز مشرف کے درمیان ایک ایسا معاہدہ کرایا جس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔'' ٹائم نے مزید لکھا ہے کہ بش انتظامیہ نے صدر پرویز مشرف پر ڈالروں کی شکل میں امداد کی برسات کر کے بہت بڑی غلطی کی کیونکہ مشرف پاکستان کے عوام میں کبھی مقبول نہیں تھے۔ مذکورہ جریدے نے یہ بھی لکھا ہے کہ بینظیر بھٹو کو مبینہ طور پر القاعدہ نے ہلاک کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امریکہ کے بہت قریب تھیں اور سیکولر بھی تھیں۔ بینظیر بھٹو نے جامِ شہادت نوش کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ جمہوریت کی پرستار تھیں۔

پاکستان واپسی سے قبل اپنے قتل کئے جانے کے خدشات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں محترمہ بینظیر بھٹو نے کہا تھا کہ درحقیقت میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ کیا مجھے ان سے ڈر کر اپنا مشن اُدھورا چھوڑ دینا چاہئے؟ کیا میں دہشت گردوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دوں؟ اور آج ہر پاکستانی کے لبوں پر یہی سوال ہے کہ کیا وہ دہشت گردوں کی کارروائیوں سے ڈر کر گھروں میں رہیں یا پھر میدان میں نکل کر ان کا مقابلہ کریں۔

محترمہ بینظیر بھٹو نے جمہوریت کے لئے اپنی لازوال قربانی سے درس دیا ہے کہ جمہوریت کے نفاذ اور ملک سے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے جان تک کی پرواہ کرنا ہی ایک لیڈر کی شان ہوتی ہے اور اعلیٰ سیاسی اقدار جمہوریت کے فروغ کے لئے محترمہ نے جان کا نذرانہ پیش کر کے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ محترمہ بینظیر بھٹو کے بے مثال جدوجہد اور قربانی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اولین طور پر صدر پرویز مشرف محترمہ کے ساتھ پیش آنے والے سانحہ کی صاف و شفاف تحقیقات کرانے کے لئے غیر جانبدار لوگوں پر ایک ایسا پینل تشکیل دیں جس پر سب کو اعتماد ہو تا کہ اصل مجرمان کو بے نقاب کر کے نشانِ عبرت بنایا جائے۔

اس قتل کے پیچھے اصل ہاتھوں کو بے نقاب کر کے ہی ہم دُنیا کو بتا سکتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ تنہا امریکہ کی جنگ نہیں بلکہ پوری دُنیا کی جنگ ہے جس میں پاکستان ہراوّل ملک کا کردار ادا کر رہا ہے۔

o

اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے دنیا کا معروف روزنامہ فنانشل ٹائمز لکھتا ہے۔

دو مرتبہ وزیراعظم رہنے والی بینظیر بھٹو کا قتل پاکستانی سالمیت کے لئے مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔ بینظیر بھٹو جو اپنی واپسی کے بعد قومی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے بعد پرجوش انتخابی مہم چلا رہی تھیں ان کا قتل پاکستان کے لئے صرف اس حوالے سے تباہ کن نہیں کہ انہوں نے خود اپنے لئے'' بحالی جمہوریت اور پاکستان کے محافظ کا سکرپٹ تیار کر رکھا تھا اور اس کے لئے صدر پرویز مشرف کے ساتھ ڈیل کے راستے پر چلتے ہوئے جنرل کو صرف صدر اور ان کے ساتھیوں کو ملٹری کمانڈ تک محدود کر دیا، خود اپنے لئے معافی کی صورت میں کرپشن کے مقدمات سے نجات پائی جس نے ان کے سیاسی کردار کو آلودہ سا کر دیا۔ بلکہ محترمہ بینظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل سے پاکستان کی قومی سیاست میں ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جو برسا برس تک فوجی اور سول حکمرانی کے غیر آئینی اور بے اُصولی ادوار کا شکار رہنے کے باعث اپنے وجود کی سالمیت کے خطرے سے دوچار رہنے والے ملک کو مزید خطرات میں ڈال سکتا ہے۔ پاکستان کو اب کس کردار کی ضرورت ہے؟ پاکستان کو اب اس کردار کی ضرورت ہے کہ صدر مشرف، پاکستان پیپلز پارٹی اور نواز شریف ذاتی مفادات، دُشمنیوں اور شکر رنجیوں سے بلند ہوتے ہوئے پاکستان کی سالمیت پر لہرانے والے اس ننگے خطرے کا مقابلہ کریں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایسی سیاسی عظمتوں کا ریکارڈ نہ ہونے کے برابر ہے، الم انگیز وقوعہ یہ بھی ہے کہ بینظیر بھٹو کی ناگہانی موت سے بش انتظامیہ بھی خلجان کا سامنا کر رہی ہے۔

صدر مشرف دہشت گردی کے حوالے سے واشنگٹن کے لئے ایک قیمتی اثاثہ کا درجہ رکھتے ہیں جس کے باعث واشنگٹن نے مشرف اور بینظیر بھٹو کے مابین سمجھوتے کے سلسلے میں پیش رفت کا ماحول پیدا کرنے کی کوششیں کیں تاہم یہ ایک اور قسم کی محدود نظری کا نتیجہ تھا کیونکہ بجائے سول سوسائٹی، وکلاء کی تحریک جیسے اجتماعی محاذوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے واشنگٹن نے خود کو بینظیر بھٹو تک محدود کر دیا جس کی وجہ سے صورتِ حال نے مشرف کے دُشمنوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا۔

پاکستان کے تناظر میں محترمہ بینظیر بھٹو کی بلند پایہ شخصیت، مغرب میں ان کے اثرات، پاکستان کی سیاست میں وہ میانہ روی اور لبرل ازم کے قیام کی ایک طویل جدوجہد اپنی

جبکہ لیکن صدر مشرف کے ناپسندیدہ انداز حکمرانی نے پہلے سے خطرات میں گھرے ہوئے پاکستان کو مذہبی شدت پسند اور انتہا پسند گروہوں کی مرغوب غذا بنا دیا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ صدر مشرف اپنے انداز فکر میں تبدیلی پیدا کریں۔

بلاشبہ محترمہ بینظیر بھٹو کے دردناک قتل سے پیدا ہونیوالے خطرات اس ملک اور اس قوم کو ناقابل تلافی آزمائش سے دوچار کر سکتے ہیں، صدر مشرف قومی مشاورت میں لے جانے کے بجائے خود کو مزید ناگزیر ثابت کرنے کا مشن اپنا سکتے ہیں۔ نواز شریف غیر متنازعہ اپوزیشن رہنما کے طور پر اُبھر سکتے ہیں اور پیپلز پارٹی قیادت سے محروم ایک لاوارث جماعت کے طور پر نشیب و فراز کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہوگی تاہم ہمارا مشورہ ہے کہ پاکستانی سیاست دان اور رہنما دوبارہ مجتمع ہوں خود کو متحد کریں اور انتہا پسندی کو شکست دینے کے لئے ایک متفقہ قومی نصب العین پر اکٹھے ہوں۔

پاکستان اور پاکستانی قوم کو اب دراصل دوبارہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عہد شروع کرنا ہوگا۔ یہی طرزِ عمل پاکستان کو بچا سکتا ہے۔

(بشکریہ فنانشل ٹائمز 29 دسمبر 2007)

ڈاٹر آف ایسٹ کے مصنف پیٹر گلبرائتھ کہتے ہیں

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کے پیٹر گلبرائتھ نے اپنے تجزیے میں لکھا ہے کہ بینظیر بھٹو اپنے ملک میں جمہوریت کی تحریک کو انجام تک نہیں پہنچا سکیں۔ لہٰذا بہت ممکن ہے کہ ان کا ملک بھی اب جانبر نہ ہو سکے۔ گلبرائتھ کے مطابق پاکستان کی موجودہ حالت زار صحیح معنوں ادراک حاصل کرنے کی خاطر ہم امریکیوں کو اپنی یہ پرانی عادت بدلنا ہوگی۔ پاکستان کے بارے میں ہم نے ایک ہی مؤقف اختیار کر رکھا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارا صف اوّل کا اتحادی ہے۔ جبکہ وہ ایٹمی طاقت کا حامل بھارت کا مخالف ملک ہے۔ پاکستانی لوگ بالعموم خود کو صوبائی یا لسانی حوالے سے دیکھتے ہیں جبکہ بینظیر واحد سیاست دان تھیں جن کو ان کے آبائی صوبے سندھ کے علاوہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں بھی بھرپور پذیرائی حاصل تھی۔ اگرچہ پاکستانی فوج یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ قوم کی پاسبان ہے اور اسی بہانے سے پاکستان کے فوجی جرنیل اقتدار پر قبضہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ فوج کوئی قومی ادارہ نہیں ہے کیونکہ اس فوج کے افسروں کی 90 فیصد کھیپ پنجاب سے آتی ہے جبکہ سندھ کے فوجی افسروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور زیادہ تر سندھیوں کے نزدیک فوج کی حکومت کا پنجاب کی حکومت ہی ہے اور اب جبکہ محترمہ بینظیر بھٹو رخصت ہوگئی ہیں تو عین ممکن ہے ان کے پرخلوص پیروکار اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ مزید رہنا ہی نہیں چاہتے۔

اس صوبائی عصبیت نے ملک کو اور زیادہ تقسیم کر دیا ہے۔ جہاں فوجی ڈکٹیٹر شپ پوری شدومد کے ساتھ اقتدار کو چمٹی ہوتی ہے جبکہ ملک کو عالمی برادری میں دُنیا کی سب سے زیادہ کرپٹ ریاست قرار دیا گیا ہے اور جہاں دُنیا بھر کے دہشت گردوں کی بھی ایک بھاری تعداد موجود ہے۔

پیٹر گلبرائتھ مزید رقم طراز ہیں کہ بینظیر میری دوست تھیں اور جب میں نے ان کے قتل کی ٹی وی پر نان سٹاپ کوریج دیکھی تو میں یہ یاد کئے بغیر نہ رہ سکا کہ 16 نومبر 1988ء میں جب

انہوں نے دُنیا کی پہلی اسلامی وزیراعظم کے طور پر حلف اُٹھایا تھا تو وہ کس قدر پراُمید تھیں۔ اس وقت میں ان کے لاڑکانہ والے آبائی گھر میں ایک مہمان کے طور پر مقیم تھا اور میں نے الیکشن کی رپورٹنگ کی تھی اور بعد میں جب انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالا تو میں نے سینیٹ کی امور خارجہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے کئی گھنٹے ان کے ساتھ ان کے دفتر میں گزارے۔ پہلی بار اپنی وزارتِ عظمیٰ کی برطرفی میں ان کی بھی چند لرزشیں شامل تھیں۔ وہ 35 سال کی عمر میں وزیر اعظم بن گئی تھیں جبکہ ان کا تجربہ بے حد محدود تھا اور غیر ضروری لڑائیوں میں اُلجھنا بھی ان کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ تھا لیکن ان کی ناکامی اور بالآخر ان کی موت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے ملک میں کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں ہوتا۔

بینظیر کی انتخابی کامیابی فوجی آمر جنرل ضیاء کی طیارے کے حادثہ میں ہلاکت کے بعد عمل میں آئی۔ جس نے بینظیر کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کا فوجی بغاوت کے ذریعے تختہ اُلٹا تھا۔ ضیاء کی ہلاکت کے بعد فوجی غلبے والی نگران حکومت نے اس یقین کے ساتھ انتخابات کا ڈول ڈالا کہ بینظیر کی پاکستان پیپلز پارٹی ہرگز نہ جیت سکے گی۔ انتخابات کی رات وہ لاڑکانہ والے آبائی گھر کے ایک چھوٹے کمرے میں اپنے شوہر آصف زرداری کے ہمراہ انتخابی نتائج کا انتظار کر رہی تھیں اور جب یہ واضح ہوگیا کہ پیپلز پارٹی جیت رہی ہے تو پاکستان ٹیلی ویژن نے نتائج کا اعلان بند کر دیا۔

اس پر بینظیر نے ملک بھر میں پھیلے اپنے انتخابی ایجنٹوں سے رابطہ کر لیا۔ دوسری طرف امریکہ میں ریگن انتظامیہ نے فوجی حکمرانوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ عوامی انتخاب کے نتائج کو تسلیم کریں جس پر فوج نے بادل ناخواستہ بینظیر کی فتح کو تسلیم کیا۔ اس سے قبل جنرل ضیاء نے 5 سال تک بینظیر کو قید رکھا۔ نیز امریکی حکومت کو باور کرادیا کہ بینظیر روس نواز ہے لہٰذا اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ مگر 1984ء میں جب امریکی کانگریس نے جنرل ضیاء پر دباؤ ڈال کر بینظیر کو آزاد کرنے پر مجبور کیا اور وہ امریکی حکومت کو اپنی وضاحت کے لئے وہاں پہنچیں تو ان سے ملنے والا سحر زدہ ہوگیا۔ تب ریگن انتظامیہ نے بھی ضیاء کی آمریت کی بجائے بینظیر کو اپنا اتحادی بنانا زیادہ بہتر خیال کیا۔

بینظیر نے پہلی بار اقتدار میں آنے کے بعد اپنے اہداف پر تبادلہ خیال کیا جن میں فوج کو منتخب رہنماؤں سے احکامات لینے اور بصورتِ دیگر بیرکوں میں رہنے کا فیصلہ بھی شامل تھا۔ نیز وہ

سماجی بہبود اور بہبودی نسواں پر زیادہ توجہ دینا چاہتی تھیں۔ یہ تمام اہداف اگرچہ وہ حاصل نہ کر سکیں تاہم انہوں نے اس کے لئے تگ و دو ضرور کی۔

1988ء کے انتخابات میں فتح کے بعد بینظیر نے رات مجھے کہا کہ میں بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے کے بارے میں تجاویز تیار کروں، جو آدھی رات کے تین بجے کے بعد میں نے بینظیر کو تیار کر کے دے دیں۔ جنہیں بینظیر نے اپنے ہاتھ سے دوبارہ لکھا اور مجھے دے کر کہا کہ میں انہیں راجیو گاندھی کو پہنچا دوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب ان دونوں سربراہ کی ملاقات ہوئی تو دونوں کا رویہ تین جنگیں لڑنے والے دُشمنوں کا نہیں بلکہ پرانے دوستوں کا تھا۔ لیکن بعد میں پھر فوج نے دخل در معقولات کر دیا۔ اب بینظیر کو سمجھ آ چکی تھی کہ پاکستانی فوج کو سویلین کنٹرول میں لائے بغیر ملک میں جمہوریت کی گاڑی رواں دواں نہیں ہو سکتی۔ لیکن فوجی جرنیل قومی بجٹ میں سے فوج کا سب سے بڑا حصہ نکالنے کا اختیار چھوڑنے پر کسی طور پر بھی آمادہ نہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پاکستان اپنی ساٹھ سالہ تاریخ میں قومی اداروں کو پروان نہ چڑھا سکا۔ دوسری طرف پاکستان کے مسائل کی بڑی ذمہ داری امریکہ پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ زیادہ مسائل خود امریکہ کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ لیکن اب امریکہ کا یہ فرض ہے کہ وہ بینظیر کے قتل کی منصفانہ بین الاقوامی تحقیقات پر زور دے اور صدر بش کو بھی اپنے جملوں کے انتخاب میں احتیاط برتنی چاہئے۔ بار بار مشرف کی بے جا تعریف سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس طرح خود امریکہ کی اپنی بے عزتی ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 70 ایٹمی ہتھیار رکھنے والے پاکستان کا ناکام ریاست بننا بھی امریکہ کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

(واشنگٹن پوسٹ)

فاطمہ بھٹو کے تاثرات

میرے اور میری پھوپھی (بے نظیر بھٹو) کے تعلقات اگرچہ طویل مدت سے پیچیدہ رہے ہیں تو یہ واقعی ایک حقیقت ہے لیکن افسوس ناک حقیقت! سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ سال کا عرصہ کچھ خوشگوار نوعیت کا نہیں رہا لیکن اب وہ مجھے مختلف انداز میں یاد آتی رہیں گی۔ ان کی یادیں تو ہمیشہ آئیں گی کیونکہ میں آخر کار اپنے گھرانے، خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ تشدد کا شکار ہوئیں اور تشدد کسی بھی شکل میں ہو بہت ظالمانہ ہوتا ہے۔ میں آنکھوں میں آنسو لئے اور دل میں غم وغصہ لئے انہیں الوداع کہتی ہوں۔ بچپن میں میں اپنی پھوپھی کو ''وڈی بوا'' کہا کرتی تھی۔ سندھی میں باپ کی ہمشیرہ کو اسی لقب سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ وڈی بوا کو کچھ ہوا ہے اور پھر فون پر مجھے افسوس ناک اطلاع دی گئی۔ بچپن کی باتیں ہیں کہ میں اور پھوپھو اکٹھے مل کر بچوں کی کتابیں پڑھا کرتی تھیں اور سیب اور دیگر میٹھی چیزیں بہت پسند کرتی تھیں۔ میں اور بینظیر پھوپھو سالہا سال اکٹھے رہتی رہیں، میں نے کبھی کوئی ایسا مضمون نہیں لکھا جو ناممکن دکھائی دے۔ وہ مضامین لکھنے کا بے پناہ شوق رکھتی تھیں لیکن میرے اور ان کے اندازِ تحریر میں فرق تھا تاہم بعض لوگ ہم دونوں کا اسی حوالے سے مقابلہ کرتے تھے۔ میرے لئے دو افراد کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل ہے۔ ایک حال سے متعلق اور دوسرے ماضی کے بارے میں۔ درحقیقت میں نے ان کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں کیا اور نہ ہی ان کے گرد جمع لوگوں سے کسی بات پر اتفاق کیا۔ ان لوگوں میں موقع پرست اور ابن الوقت شامل ہوتے تھے اور ایسے افراد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بینظیر آنٹی کی پالیسیوں سے بھی کبھی متفق نہیں رہی تھی اور اب وہ موت سے ہمکنار ہوگئی ہیں تو وقت آگیا ہے کہ سکون سے یہ صدمہ برداشت کیا جائے۔ میں اس وقت سوگوار ہوں کیونکہ ہمارے خاندان کو ایک بڑا صدمہ دیکھنا پڑا ہے۔ میں بلاول کے لئے اور بختاور اور آصفہ کے لئے بھی سوگوار ہوں۔ میں ان کے لئے اس وجہ

سے بھی سوگوار ہوں کہ میں بھی چھوٹی عمر ہی میں باپ سے محروم ہوگئی تھی۔ میں باپ یا ماں کی موت جیسا دُکھ برداشت کرچکی ہوں۔

مجھے ان پارٹی ورکروں کی موت پر بھی گہرا دُکھ ہے جو 27 دسمبر کے المیے میں جان دے بیٹھے اور یقیناً ان کے پسماندگان سے بھی گہری ہمدردی ہے۔ گرجا گھر ہو یا مندر یا مسجد ہو، وہاں عبادت کرنے والے اپنے ان پیاروں کے لئے دُعا کرتے ہیں جو دور بہت دور جاچکے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کے ترانے بھی گاتے ہیں جو اُمید سے بھرے ہیں اور مذہبی گیتوں میں اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر اندھیرا ہے تو روشن سویرا بھی آئے گا۔ پریشانیوں کے بعد اچھا وقت بھی آئے گا۔

وڈی بوا میں آپ سے ہمیشہ مخلص رہی ہوں اور بچپن میں میں آپ سے اس کا وعدہ بھی کرچکی ہوں۔ آپ کے دنیا سے چلے جانے پر میں بہت دُکھی ہوں اور صدمے کی حالت میں ہوں۔ ہمارے خاندان کے چار قریبی رشتہ دار اور بھی ہیں جن کی موت پر ہم سوگوار ہیں اور جنہیں وحشیانہ طور پر قتل کیا گیا۔

میں اپنے دادا ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی۔ میں بچپن میں دادا شہید کی دھواں دھار تقاریر کی بلیک اینڈ وائٹ ویڈیو کیسٹ بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ میرے والد اس وقت نوجوان تھے جب ان کے باپ کو قتل کیا گیا لیکن میرے باپ نے اپنے والد کے قتل کا انتقام لینے کو تادم مرگ یاد رکھا۔ جب میرے چچا شاہنواز کو قتل کیا گیا تو میری عمر تین سال تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب پورا کنبہ پولیس کی حراست میں تھا تو وڈی بوا مجھے سہارا دیتی تھی اور کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ میں چودہ سال کی عمر تک پہنچی تو مجھ سے سب کچھ چھن گیا یعنی میرے باپ میر مرتضیٰ بھی قتل ہوگئے۔ وڈی بوا اب میں 25 سال کی ہوچکی ہوں اور میری سوچ کا مرکز گڑھی خدا بخش کا قبرستان ہے جہاں خاندان کے افراد کی قبریں بڑھتی جارہی ہیں۔ میں دُعا کرتی ہوں کہ آپ کے بعد کسی اور کو الواع نہ کہنے والی بنوں۔

(بشکریہ دی نیوز)

○

محترمہ بینظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف صحافی نجم سیٹھی نے مستقبل کے سیاسی منظرنامے کی نشاندہی بھی کردی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بینظیر بھٹو کا قتل دو اہم سوال سامنے لایا ہے۔ پہلا یہ کہ انہیں کس نے اور کیوں قتل کیا؟ دوسرے پاکستان پیپلز پارٹی کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور یہ سانحہ پاکستانی سیاست پر کس قسم کے اثرات مرتب کرے گا؟ اکثر پاکستانیوں کا ''جبلی رجحان'' یہ ہے کہ وہ ''ایجنسیوں'' کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس ملک میں رونما ہونے والے ہر ''ناقابل توضیح'' یا ''ناخوشگوار'' واقعے کی یہ آسان ترین وضاحت ہے۔ اس کے اندر جو بھی سیاسی قتل ہوئے آج کے دن تک ناقابل توضیح رہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں یا تو سچ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اور اگر ان تحقیقات کے نتیجے میں سچ مل بھی گیا تو اسے منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ مسز بھٹو کے قتل کی تہہ میں کارفرما یہ سچ بھی ممکن ہے لاشعوری طور پر بہت سے پاکستانیوں کے لئے قابل قبول نہ ہو کہ اس ناخوشگوار واقعے کے پس منظر میں کسی مذہبی یا اسلام پسند عنصر کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

اس ردعمل کا جزوی باعث پاکستان کی ''ہمہ جا موجود'' ایجنسیوں کا وہ کردار ہے جو وہ 1980ء کی دہائی سے لے کر آج کے دن تک ملکی سیاست کے خدوخال اور جہتوں کو متشکل کرنے میں ادا کررہی ہیں۔ مختلف حکومتوں کا قیام یا عدم قیام اور انتخابات کا انعقاد بھی انہی ''ایجنسیوں'' کے مذکورہ کردار کا حصہ بنا رہا۔ لہٰذا اگر ہم ان ''ایجنسیوں'' کو الزام دیں یا اپنے نیم پختہ نظریات کو اپنی سوچ کا حصہ بنالیں تو اس پر ہمیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

صدر مشرف کی سیاسی اپوزیشن یقیناً چاہے گی کہ ہر شخص انہی خطوط پر سوچے، یہ سوچ سیاست دانوں کے مقصد سے ہم آہنگ ہے کیونکہ وہ مشرف حکومت کو رسوا اور بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایک مقبول اور عوامی راہنما کے قتل کے ردعمل کے طور پر وسیع پیمانے پر غم وغصہ اور اشتعال پھیلے تاکہ عوامی جذبات کو ان کی حکومت گرانے کی کوشش میں معاون کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ لیکن اگر ''ایجنسیوں'' نے یہ فعل صرف مشرف کے ایماء پر انجام دیا ہو تو کوئی شخص یہ پوچھنا کیوں گوارا نہیں کرتا کہ اس اقدام کے پس منظر میں ان کی کیا نیت یا کون سے ارادے کارفرما ہیں اور یہ قتل ان کے لئے کس طرح مفید ثابت ہوسکتا ہے؟

اس امر کو ذہن میں رکھنا ازبس ضروری ہے کہ یہ سانحہ ان کی حکومت کے خلاف کسی عوامی اور مقبول تحریک کے آغاز کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں سوچا جاتا کہ بینظیر بھٹو کے

قتل، صدر مشرف پر دو، کراچی کے سابق کور کمانڈر پر ایک، سابق وزیراعظم شوکت عزیز پر ایک اور سابق وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ پر دو عدد قاتلانہ حملوں کے درمیان ایسا رابطہ ہوسکتا ہے جس کا ایجنسیوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو؟ یقیناً یہ شرفا ایجنسیوں کے اہداف نہیں تھے (یا نہیں ہوسکتے)۔

18 اکتوبر کو جب بینظیر بھٹو پر قاتلانہ حملہ ہوا تو انہوں نے ضیاء دور کی چند ایسی باقیات کی سمت انگشت نمائی کی جو مشرف انتظامیہ کا حصہ تھیں اور جن میں ایجنسیوں کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ بلاشبہ انہوں نے کوئی ایسی وضاحت پیش نہیں کی جسے سمجھنا آسان ہو۔ بظاہر انہیں یہ سب باور کرایا گیا تھا لیکن یہ کس کا کام تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا؟ ہم کبھی نہیں جان پائیں گے۔

اس موقع پر بینظیر کی سمت سے جو الزامات سامنے آئے، ممکن ہے ان میں سیاسی مصلحت کا کوئی عنصر مضمر ہو (ان دنوں) وہ اس کوشش میں مصروف تھیں کہ اپنے اور صدر مشرف کے درمیان فاصلہ قائم رکھیں تاکہ عوام کی نظر میں ایک مرتبہ پھر قابل اعتماد اور معتبر ہو جائیں، جو آخرالذکر کے ساتھ ان کی کسی ''ڈیل'' کے امکان پر ناخوش تھے۔

بے شک اس امر کا مشاہدہ کیا گیا کہ ایک ایسے وقت پر صدر مشرف کے ساتھ مل کر کام کرنے کے عوض ان کے خلاف قائم کئے جانے والے بدعنوانی کے مقدمات ختم کئے جارہے تھے جب وہ عدلیہ سے متعلقہ اپنی فاش غلطیوں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران اپنے امریکہ موافق موقف کے باعث خوفناک حد تک غیر مقبول ہوچکے تھے کیونکہ اکثر پاکستانی اس جنگ کو ''مبنی برانصاف'' پاکستانی جنگ کی بجائے ''غیر منصفانہ'' امریکی جنگ خیال کرتے ہیں۔

تاہم بعد ازاں مسز بھٹو نے نوشتہ دیوار کو پڑھتے ہوئے اپنی حکمت عملی تبدیل کرلی اور کہنا شروع کردیا کہ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی پاکستان کے لئے بے تحاشا خطرات کی حامل ہیں۔ ان کا واضح اشارہ القاعدہ کی سمت تھا جو عراق کے بعد افغانستان کی بھی دوبارہ دعویدار بن چکی تھی۔ یہ اس کی عالمی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں کے اندر اپنی جڑوں کو مضبوط اور گہرا کرنے کی کوشش کرے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے پاکستان بنیادی سرزمین بنالے۔ بینظیر کے پاکستان واپس لوٹنے سے کچھ ہی دن قبل ڈیلی ٹائمز نے وزیرستان میں القاعدہ، طالبان کے ایک ''وارلارڈ'' بیت اللہ محسود کے بیان پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ مذکورہ بیان کے مطابق اس نے سینکڑوں خودکش بمبار تیار کر لئے تھے اور بینظیر بھٹو کو ہلاک کرنے پر تلا بیٹھا تھا کیونکہ وہ امریکی ایجنٹ تھیں۔ ڈیلی ٹائمز نے جس بنیاد پر وہ کہانی شائع کی وہ پاکستانی

سینٹ کے ایک حاضر سروس رکن کے ساتھ ڈیلی ٹائمز کا وہ انٹرویو تھا جس کے دوران مذکورہ رکن نے بیت اللہ محسود کے محولہ بالا بیان کا حوالہ دیا۔ اس رکن نے حال ہی میں محسود سے ملاقات کی تھی۔

ڈیلی ٹائمز میں شائع شدہ اس رپورٹ کی دو ہفتوں تک نہ تو کوئی تردید سامنے آئی اور نہ ہی اس پر اس وقت کوئی دھیان دیا گیا جب تک بینظیر بھٹو قاتلانہ حملے کے نتیجے میں پاکستان بھر میں غم وغصہ کی لہر نہیں دوڑ گئی اور القاعدہ ایک مرتبہ پھر توجہ کا مرکز نہیں بن گئی۔ لیکن میڈیا کے جو حصے القاعدہ کے لئے اس لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں کہ آخر الذکر امریکہ مخالف ارادوں اور عزائم کی حامل ہے۔ وہ یکا یک ڈیلی ٹائمز پر جھپٹ پڑے اور الزام عائد کیا کہ اس انگریزی اخبار نے جان بوجھ کر ایک غلط رپورٹ شائع کی۔

مذکورہ سینیٹر کو کھینچ کر ایک ٹی وی سٹوڈیو میں لے جایا گیا اور مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے بیان سے باضابطہ طور پر مکر جائے۔ اس کہانی کی اشاعت کے حوالے سے ڈیلی ٹائمز کے ارادوں کے متعلق اور بھی بہت کچھ کہا گیا۔ بعد ازاں بیت اللہ محسود سے منسوب ایک بیان پھیلا دیا گیا کہ 18 اکتوبر کے قاتلانہ حملے میں وہ ملوث نہیں تھا۔ تاہم گزشتہ ماہ بیت اللہ محسود نے تمام تر بہلاووں سے دستبردار ہوتے ہوئے ایک رسمی بیان جاری کر دیا کہ پاکستان کے اندر طالبان تحریک کا سربراہ وہ خود ہے۔

اول الذکر تینوں حضرات دہشت گردی کے خلاف جنگ میں برملا اور کھلم کھلا ملوث رہے ہیں کہ بینظیر بھٹو نے متعدد مرتبہ اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ اگر وہ واپس اقتدار میں آ گئیں تو انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کا صفایا کر دیں گی۔ ان سب کو امریکی ایجنٹ یا امریکہ کی کٹھ پتلیاں سمجھا جا رہا تھا۔

صدر مشرف پر جو قاتلانہ حملے ہوئے بعد میں ایک انکشاف سامنے آیا کہ ممکن ہے ایجنسیوں اور فورسز میں شامل وہ غیر ذمہ دار عناصر ان کے پس منظر میں فعال رہے ہوں جو القاعدہ کے مددگار اور اس کی تقویت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ القاعدہ کی طرف سے مسلح افواج اور نیم فوجی دستوں پر ہونے والے حملے، بالخصوص جو اسلام آباد اور راولپنڈی میں ہوئے ان میں نچلی سطح کے وہ اندر کے لوگ ملوث تھے جن کا اس لال مسجد کے ساتھ تعلق تھا جو القاعدہ کے نیٹ ورک کا ایک حصہ تھی۔ اسلام آباد میں القاعدہ نے آئی ایس آئی کی بسوں پر جو حملے کئے ان کی وضاحت اور

کس طرح کی جائے؟ ان بسوں پر حملوں کے نتیجے میں جو لوگ جاں بحق ہوئے وہ اس ایجنسی کے سویلین ملازمین تھے۔

صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کے اندر فعال القاعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف عربوں، ازبکوں اور تاجکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں پاکستانی بھی شامل ہیں اور وہ پاکستانی پنجابیوں اور پٹھانوں دونوں پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے کہ پاکستانی طالبان میں اردو بولنے والے بھی شامل ہوں۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ متعدد فرقہ وارانہ اور جہادی سنی تنظیمیں جن کا تعلق پاکستان سے ہے، وہ اس وقت القاعدہ کے نیٹ ورک کا حصہ بن گئیں جب بھارت کے ساتھ امن مذاکرات کا آغاز ہوا اور حکومت نے انہیں دھرم بھرم کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت القاعدہ اتنی ہی پاکستانی بن چکی ہے جتنی یہ ایک عرب یا غیر ملکی تنظیم ہے۔

اس معاملے میں شکوک وشبہات کی زیادہ معقول وجوہات موجود نہیں ہیں کیونکہ القاعدہ کا دوسرا بڑا راہنما، ایمن الظواہری پاکستانیوں کو برملا نصیحت کر چکا ہے کہ وہ مشرف حکومت سے جان چھڑا لیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بن لادن نے گزشتہ ستمبر میں مشرف حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا۔ اب 27 دسمبر کو مسز بھٹو کے قتل کے بعد القاعدہ کے ایک ترجمان نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی تنظیم نے انہیں اس لئے قتل کیا ہے کہ وہ ایک قیمتی امریکی اثاثہ تھیں۔ اس بات سے پاکستانیوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا ملک دہشت گردی کے خلاف عین وسط میں انتہا پسندوں کے نرغے میں آ چکا ہے لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ اس بات کو سمجھا نہیں جا رہا۔

مسز بھٹو 18 اکتوبر کو خود قاتلانہ حملے کے بعد ضیاء دور کی باقیات کے بارے میں کہا تھا کہ وہ انہیں بندوق کا نشانہ بنانا چاہتی تھیں۔ 27 دسمبر کو بھی انہوں نے یہی کہا کہ انتہا پسندوں اور دہشت گردوں نے انہیں اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ ان دونوں بیانات کے درمیان کوئی عدم مماثلت نہیں پائی جاتی۔ اب القاعدہ کے بنیادی اہداف صدر مشرف اور مولانا فضل الرحمٰن ہیں اور اس کا واحد مقصد پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار اور ایک اعتدال پسند جمہوریت کی سمت سفر کے دوران رکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ اسی مقصد کے لئے انتشار کے بیج بو رہی ہے۔

(بشکریہ ڈیلی ٹائمز 29 دسمبر 2007ء)

عمران خان نے محترمہ بے نظیر کی شہادت پر لکھا

کیا بینظیر بھٹو کی موت کے بعد پاکستان کے حالات بدل سکتے ہیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ایک عام پاکستانی کے مطابق نہیں اور کبھی نہیں پر مشتمل ہوگا۔ اتنا ضرور ہوگا کہ جس خطرے کے پیش نظر اے پی ڈی ایم انتخاب کا بائی کاٹ کر رہی تھی اس بہیمانہ قتل کے بعد وہ تمام خدشات درست نکلے کہ حکومت الیکشن کا کھیل رچا کر اصل حقائق سے عوام کی توجہ ہٹانا چاہ رہی تھی۔ محترمہ کا قتل حکومتی غلط پالیسیوں خواہ ملکی سطح پر ہوں یا پھر بین الاقوامی سطح پر کی ناکامیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس موت کے بعد پیپلز پارٹی کو جو ناقابل تلافی نقصان ہوا سو ہوا لیکن اصل میں پاکستان کی سالمیت کا سوال ہے۔ عالمی استعماری قوتوں کا ہمیشہ سے شیوا رہا ہے کہ چند مفاد پرستوں کو خرید کر اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیونکر ان کے مطالبات پر سر تسلیم خم کر لیتے ہیں؟ بد سے بدترین جمہوریت اعلیٰ سے عالی شان آمریت سے ہزار درجے بہتر ہوتی ہے۔ مغربی حلقوں کو پوری دُنیا میں آمریت کے سائے میں پناہ گیر جمہوریت صرف ارضِ پاکستان میں درکار ہے، میری تمام تر اپیلوں اور بروقت فیصلوں کے باوجود اپوزیشن پارٹیاں ایک نقطے پر جمع نہ ہو سکیں۔ بد قسمتی سے نواز شریف بھی بائی کاٹ کا اعلان کر کے انتخابات میں جا کودے اور اسی حکومتی پالیسی کی بھینٹ چڑھ گئے جن سے میں انہیں بچانا چاہتا تھا۔ کل کے بائی کاٹ اور آج کے بائی کاٹ میں یہ فرق پڑا کہ ہم ایک بڑی سیاسی جماعت کی قائد سے محروم ہو گئے۔ ایک شہر جو ابھی تک ذوالفقار علی بھٹو کے داغ نہیں دھو پایا تھا اس کے ماتھے پر بینظیر بھٹو کے خون سے نئی تاریخ رقم کر دی گئی۔ اتنی نا اہلی لاپرواہی اور فرائض سے غفلت پہلی مرتبہ دیکھنے میں نہیں ملی۔ امن و امان کا سلسلہ مہنگائی، بدامنی کی بڑھتی ہوئی صورت حال، ارضِ پاک پر پھیلی انارکی، عدلیہ کی بربادی صفِ اوّل کے اتحادیوں

کے شاندار کارناموں کی وہ تفصیل ہے جس کے سہارے وہ ظلم کی حکومت کو طوالت بخشتے جا رہے ہیں۔ بینظیر بھٹو سے پہلے میاں نواز شریف کے قافلے پر حملہ ہوا۔ ان کے کئی کارکن مارے گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بینظیر بھٹو جان لیوا حملے کی نظر ہو گئیں۔ کیا یہ بہترین مثال نہیں ایک ناکام حکومت کی پالیسیوں کی؟ میاں نواز شریف عدلیہ کی بحالی کی خاطر میدان میں جا اُترے۔ ہمارا مؤقف کل بھی وہی تھا اور آج بھی وہی ہے کہ ججوں کو بحال کئے بغیر، الیکشن کمیشن کو آزاد کئے بغیر، آئین کو بحال کئے بغیر الیکشن لڑنا حکومتی مؤقف کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو ہم کبھی نہیں کریں گے۔ آگے کی حکمت عملی کیا ہوگی آئندہ چند دنوں میں ہم مل کر اے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم سے نیا لائحہ عمل طے کریں گے۔ میں ذاتی طور پر درخواست کرتا ہوں کہ تمام جماعتیں الیکشن کا بائی کاٹ کر کے نئے اور آزاد پاکستان کی خاطر قدم بڑھائیں۔ آمریت کا نمائندہ آخری سانسیں لے رہا ہے اس سے پہلے کہ یہ آمریت کے پنجوں سے کسی اور کی جان لے لے ہمیں مل کر ان تمام حربوں کو ناکام بنانا ہوگا جو پاکستان کی سالمیت، اسلام کی حاکمیت اور بنیادی انسانی حقوق کو پامال کئے ہوئے ہیں۔ میں پاکستان کی تمام عوام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ظلم کی اس حکومت کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اگر پاکستان کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ہم کسی قابل نہیں رہیں گے۔ اگر ملک سلامت رہا تو بہت سے انتخابات لڑے جا سکتے ہیں۔ حکومتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ دُشمن جو چاہتا ہے وہ پالیتا ہے جو ہمیں نہیں کرنا چاہئے وہ ہم کر رہے ہیں۔ کیا ابھی ہمارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش موجود ہے؟ میں آج پورے ملک کی عوام سے اس ناگہانی موت پر بالعموم اور پاکستانی پیپلز پارٹی کے کارکنان سے بالخصوص دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ یہ ایک انتہائی نازک گھڑی ہے۔ اگر آج کوئی بھی جذباتی اور غیر دانشمندانہ قدم اُٹھایا گیا تو اس کے اثرات انتہائی مضر اور ناقابل برداشت ہوں گے۔ بھٹو خاندان کی جمہوریت کے لئے قربانیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، خدا اس سانحے کے بعد انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ملک کو دُشمنوں کی نظر سے محفوظ رکھے۔ آج ہمیں دیکھنا ہے کہ اس قتل سے کس کو کیا فائدہ ہوا؟ یاد رکھئے کہ الطاف حسین کو بھٹو سے بڑا لیڈر کہنے والوں کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے کہ وہ کس قسم کے احمقانہ بیانات صرف حکومت بنانے کے لئے دے رہے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی قائداعظمؒ کے مقابلے میں بال ٹھاکرے کو لے آئے

کہ اس کی خوشنودی لے کر ہم ایک صوبے میں حکومت بنا لیں گے آج طاقت نہیں فراست کی ضرورت ہے۔

کراچی سے خیبر تک پورا ملک زخموں سے چور کراہ رہا ہے اور یہ اپنے عارضی اقتدار کے لئے خوشحالی کے شادیانے بجاتے انتخاب انتخاب کھیل رہے ہیں۔ اصل حقیقت میں یہ اپنے سپہ سالار کی خوشنودی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ اب ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ اس خانہ جنگی کا خطرہ پہلے سے موجود تھا۔ محترمہ کے انتخابی جلسوں میں مدارس کے خلاف آنے والے بیانات کو بنیاد بنا کر اس واقعے کو القاعدہ سے جوڑنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہر برے کام کے بعد کریڈٹ میں پہلے ان کا نام استعمال کیا جاتا تھا۔ تمام قومی املاک ہماری ملکیت اور سالمیت کی علامت ہیں۔ انہیں جلانے، توڑنے پھوڑنے سے ملک کمزور ہوگا۔ بینظیر بھٹو واپس نہیں آ سکتی۔ لہٰذا ہمارا مقابلہ ان قوتوں سے ہے جو جبراً آئین، عدلیہ، میڈیا اور جمہوریت پر قابض من مرضی کے فیصلے کر رہے ہیں۔ اتنے بڑے سانحے کے بعد حکومت کا الیکشن کرانا انتہائی احمقانہ اور بزدلانہ فیصلہ ہے۔ کیونکہ ان کی بقاء ان کے نزدیک انتخاب لڑنے میں پوشیدہ ہے جبکہ ہماری سوچ کے مطابق انتخابات میں حصہ نہ لینا ملک کو بچانے کے متراف ہے۔ میں ذاتی طور پر تمام سیاسی رنجشوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کی قیادت سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اب بھی انہوں نے کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہ کیا تو وفاق کی علامت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ انتخابات ملک کی ضرورت نہیں بلکہ مشرف اور اس بے رحمانہ نظام کی ضرورت ہیں جسے یہ بچانا چاہتا ہے۔ یقین مانئے کہ یہ آخری معرکہ ہوگا اگر ہم مل کر کسی ایک نکاتی ایجنڈے پر مل بیٹھیں۔ آج تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ اور ملک سے اُٹھنے والی تمام ہوائیں آپ کو پکار رہی ہیں کہ ہمیں وقتی اقتدار نہیں ملکی سالمیت اور شہید ذوالفقار علی بھٹو والی جمہوریت درکار ہے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتا ہوں کہ آپ مشرف کے سائے تلے الیکشن لڑنا چاہتے ہیں یا پھر آزاد پاکستان کی خاطر فیصلہ کن لڑائی لڑنا چاہتے ہیں۔

میں اپنے تمام کارکنان سے، ہمدردگان سے کہتا ہوں کہ وہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے ساتھ ان کے دُکھ میں برابر کے شریک ہوں۔ ہم اس قومی المیے پر انہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے۔ خدا محترمہ کو غریق رحمت کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا

کرے، امین۔ ہمیں بطور پاکستانی پہلے اپنا ملک عزیز ہے اور بعد میں کسی قسم کی سیاست۔ آج قومی مشاورت کے بغیر ہم اس بحران سے نہیں نکل سکتے۔ اعتزاز احسن سمیت تمام وکلاء اور ججوں کو رہا کئے بغیر بات نہیں بنے گی۔ عدلیہ آزاد ہوتی تو اس قتل کے محرکات کو تلاش کرنا ممکن ہوتا لیکن اب ایسا ممکن نہیں رہا۔ میں بطور چیئرمین پاکستان تحریک انصاف وکلاء، طلباء، ججوں سمیت سب کو دعوت دیتا ہوں کہ امن و انصاف اور وطن کی سالمیت کی خاطر تحریک انصاف کا ساتھ دیں تاکہ اس معرکے کو بھرپور طور پر لڑا جا سکے۔ آج سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔

بے نظیر اور ذوالفقار علی بھٹو کی آخری ملاقات

3 اپریل 1979ء کو ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں سہالہ سے راولپنڈی جیل پہنچا دیا گیا۔ جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی۔ ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانہ سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی جیل پہنچیں۔

''آج تم دونوں اکٹھی کیوں آئی ہو؟'' میرے والد نے کال کوٹھڑی کے دوزخ سے آواز دی۔

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

اس وقت میری والدہ جواب دینے کی سکت نہ رکھتی تھیں۔

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا تھا۔

(یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے)۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''ہاں!'' جواب میں جیلر کہتا ہے۔ حکومت کا پیغام دیتے ہوئے شرمسار محسوس ہوتا ہے۔

''کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے؟''

''کل صبح۔'' جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

''کتنے بجے؟''

''جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے۔''

''یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟''

''کل رات۔'' اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

میرے والد اسے نظر بھر کر دیکھتے ہیں۔

''اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے؟''

''نصف گھنٹہ۔''

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے۔'' وہ کہتے ہیں۔

''صرف نصف گھنٹہ۔'' سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔

''یہ میرے احکامات ہیں۔''

''غسل اور شیو کرنے کے لئے انتظامات کرو۔'' میرے والد اسے کہتے ہیں۔

''دُنیا خوبصورت ہے، اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔''

''صرف نصف گھنٹہ۔'' اس شخص سے ملاقات کے لئے ..... صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ مجھے رونا نہیں چاہئے۔ مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہئیں کیونکہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی فرنیچر باقی رہ گیا ہے۔ جیل حکام کرسی اور میز لے جا چکے ہیں۔ چارپائی بھی وہاں سے اُٹھائی جا چکی ہے۔ میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لئے لاتی رہی تھی وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''انہیں لے جاؤ، میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔''

وہ چند سگار جو ان کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں آج شب کے لئے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون کی شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی بھی مجھے دینا چاہتے ہیں لیکن میری والدہ انہیں کہتی ہیں۔

''اسے پہنے رکھیں۔'' وہ کہتے ہیں۔

''اچھا! ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بینظیر کے حوالے کر دی جائے۔''

''میں نے ایک پیغام باہر کی دُنیا تک پہنچا دیا ہے۔'' میں نے بہت آہستہ آہستہ انہیں بتایا۔ (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

میں تفصیلات بتاتی ہوں، وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

''یہ سیاست کے اسرار ورموز میں ماہر ہو چکی ہے۔'' ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے۔ میں انہیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں ان کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں کرتے ہیں۔

''میر، سنی اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی ہے اور میری خواہش ہے کہ کاش انہیں بھی الوداع کہہ سکتا۔'' میری والدہ سر ہلاتی ہیں، منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

''تم دونوں نے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں۔'' وہ کہتے ہیں۔

''وہ آج مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے اور مارشل لاء نافذ ہے۔ اگر تمہیں ذہنی سکون چاہئے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔''

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں)۔

''نہیں نہیں۔'' ممی کہتی ہیں۔

''ہم نہیں جا سکتے۔ ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت بھی کرے گا یا نہیں۔ ہم باہر چلی جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لئے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔''

''اور تم پنکی!'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''میں کبھی نہیں جا سکتی۔'' میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں۔

''میں بہت خوش ہوں۔ تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔''

''تم میری لعل ہو اور ہمیشہ ہی رہی ہو۔''

''وقت ختم ہو چکا۔'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔

''وقت ختم ہو چکا؟''

میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

''برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو۔'' میں اسے کہتی ہوں۔

''میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ میں دوبارہ التجا کرتی ہوں۔

''میرے والد پاکستان کے منتخب وزیر اعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے ان سے مل لینے دو۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں۔ ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کھانے کی وجہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے لیکن وہ سیدھا اُٹھ بیٹھتے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

''آج شب ملائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا۔'' چہرے پر ایک چمکتی روشنی لئے کہتے ہیں۔

''میں اپنی والدہ اور والد کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا، اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔''

''خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی۔ میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔

''لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔''

''میں وہاں ایک سائبان تعمیر کر دوں گی۔'' میں بمشکل کہہ سکی۔ جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

''الوداع پاپا!'' میں والدہ کی طرف دیکھ کر پکار اُٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے ان کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن

حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کرسکوں گی۔

''ہم جب پھر ملیں گے، اس وقت تک خدا حافظ۔'' مجھے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں۔ جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لے جاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعددوٹینٹ ایستادہ ہیں۔ میں مدہوشی کے عالم میں چلی جارہی ہوں۔ صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس ہے۔

''سر بلند رہنا چاہئے۔ وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔''

مقفل دروازے کے اندر کار ہماری منتظر ہے تاکہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہوگیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پراچانک میری نظر پڑتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لئے خوراک کا ٹفن کیریر ہے۔

''یاسمین! وہ آج رات انہیں مار دیں گے۔'' میں کار کے شیشوں میں سے چلائی۔

''کیا اس نے میری آواز سنی؟ کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں؟ کیا کہہ سکتی ہوں؟''

صبح کے پانچ بج گئے، پھر چھ بجے۔ ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کی آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔

''اے خدا! کوئی معجزہ رونما ہوجائے۔'' میری ماں اور میں نے دُعا مانگی۔

''کچھ نہ کچھ ہوجانا چاہئے۔'' میری چن چن جسے میں اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی وہ بھی تناؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم ناقابل یقین اُمید کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ مزید برآں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کردیا جائے لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے رہنماؤں نے بھی یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کردے گا لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے مواعید سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا، سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیراعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔

''کیا انہوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟ کیا ابھی بھی ان کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟''

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کراسکیں گے؟

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس وحرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا، اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کردیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ وہ ان کی زندگی ختم کردیں گے، میں متواتر سوچتی رہی۔ وہ ان کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے جبکہ ان کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ صرف ایک سگار ان کے پاس تھا۔ میرا گلا گھٹن سے جڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی لیکن میں ان پہریداروں کو جو ہماری کھڑکی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے، اپنی چیخوں سے استہزاء کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

''ممی! میں برداشت نہیں کرسکتی، بالکل نہیں کرسکتی۔'' آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی۔ وہ میرے لئے مسکن دوائی کی گولیاں لائیں۔

''سونے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر پر اچانک اُٹھ بیٹھی۔ والد کے گلے میں پھندا میں نے اپنے گلے کے اردگرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی قبرستان میں فوجی دستوں کی ہلچل سے لوگ جاگ اُٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں، میرے والد کی میت گڑھی میں دفنانے کے لئے بذریعہ طیارہ لے جائی جا رہی تھی۔

قومی اخبارات کے تبصرے

بے نظیر شہادت۔حکومت اور قومی قیادت کا اوّلین فرض

راولپنڈی میں فائرنگ اور خودکش دھماکے میں پیپلز پارٹی کی سربراہ اور سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو کی شہادت پر پورا ملک سوگوار ہے اور تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین کے علاوہ عالمی رہنماؤں نے بہیمانہ قتل کو پاکستان کے علاوہ جمہوریت کے خلاف سازش قرار دیا ہے جبکہ ملک کے مختلف حصوں میں ہنگامے پھوٹ پڑے جس کے بعد سندھ میں فوج اور ملک کے دوسرے حصوں میں بعض مقامات پر رینجرز طلب کی گئی۔

حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سخت سیکورٹی کے باوجود پاکستان کی سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو پر قاتلانہ حملہ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور خفیہ ایجنسیوں کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے جبکہ بینظیر بھٹو اور ان کے ساتھی کئی روز سے مسلسل یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ راولپنڈی میں ان کی جان کو خطرہ ہے۔ اس لئے فول پروف سیکورٹی انتظامات کئے جائیں۔ بینظیر بھٹو کو سیکورٹی ایڈوائزر رحمان ملک وزارتِ داخلہ کو خط بھی لکھ چکے تھے جبکہ اسی روز راولپنڈی میں سابق وزیر اعظم نواز شریف کے استقبالیہ جلوس پر فائرنگ بھی ہو چکی تھی۔

ایک ایسی حکومت جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتی کہ اس نے امریکہ کے تعاون اور اربوں ڈالر کی نقد امداد سے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی ہے اور ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ملک میں امن و امان کی صورتِ حال مثالی ہے، بینظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل کو القاعدہ کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ ابھی تک القاعدہ کی طرف سے جاری بیان کی بھی تصدیق نہیں ہوئی۔ تاہم صرف سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو ہی نہیں، ملک کے تمام شہریوں کی جان و مال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری تھی جس کی ادائیگی میں وہ ناکام ہوئی اس سانحہ کے بعد پیپلز پارٹی نے چالیس روزہ سوگ کا اعلان کیا ہے جبکہ حکومت نے بھی تین روزہ سوگ کا اعلان کر کے محترمہ بینظیر بھٹو کے

لواحقین، کارکنوں اور وابستگان کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے، تاہم بینظیر بھٹو کی شہادت
کے بعد ملک جس بے چینی، عدم استحکام اور سیاسی بحران کا شکار ہو گیا ہے، اس سے نجات کے لئے
کسی مؤثر اقدام اور فیصلہ کا اعلان نہیں کیا۔

عالمی برادری کے علاوہ قومی رہنماؤں کی طرف سے اس سانحہ کو انتخابی عمل کو سبوتاژ
کرنے اور ملک کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی سازش قرار دیا جا رہا ہے جو سو فیصد درست بات
ہے۔ پیپلز پارٹی کے لئے تو اب 8 جنوری 2008ء کے انتخابات میں حصہ لینا ممکن ہی نہیں لیکن
پیپلز پارٹی سے یکجہتی کے اظہار اور موجودہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر میاں نواز شریف نے بھی
انتخابی مہم ختم کر کے بائی کاٹ کا اعلان کیا ہے۔ وفاقی کابینہ کے غیر معمولی اجلاس کے بعد اعلان کیا
گیا ہے کہ عام انتخابات ملتوی کرنے کا فیصلہ نہیں ہوا اور سیاسی جماعتوں سے وسیع تر مشاورت کے
بعد کوئی مناسب فیصلہ کیا جائے گا۔ تاہم موجودہ حالات میں 8 جنوری 2008ء کو انتخابات کا
انعقاد مشکل ہے اور میاں نواز شریف نے اسے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف قرار دیا
ہے۔ میاں صاحب کا فیصلہ ملکی استحکام، یکجہتی اور سلامتی کے حوالے سے مناسب ہے اور سندھ کے
عوام کو مثبت پیغام ملا ہے، اب حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اتنے بڑے سانحہ پر پیدا شدہ
ردعمل کو انتظامی اقدامات کے ذریعے کنٹرول کرنے کے بجائے سیاسی فیصلوں اور اقدامات پر توجہ
دے۔

یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بار بار کی فوجی اور شخصی حکمرانی اور جمہوری اداروں کی توڑ پھوڑ کے
علاوہ وفاق کی سیاست کرنے والی سیاسی جماعتوں کے خلاف انتقامی کارروائی کی وجہ سے نہ صرف
ملک کا انتظامی ڈھانچہ کمزور ہوا ہے بلکہ تمام اداروں کی کارکردگی بھی صفر ہو کر رہ گئی ہے اور سیاست
میں پڑ کر خفیہ ایجنسیاں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے دہشت گردوں اور ملک دشمن عناصر کا
مقابلہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ عوامی حمایت سے محروم حکومتیں اور ریاستی ادارے ایک نیوکلیئر
اسلامی ریاست کو چلانے کے قابل نہیں، اس لئے وقت آ گیا ہے کہ اداروں کی از سر نو تشکیل اور
تنظیم پر توجہ دی جائے۔ پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ کے آئینی ادارے اپنی اپنی حدود میں کام
کریں اور ان کے مقصد عوام کو انصاف، جان و مال کا تحفظ اور محفوظ اقتصادی و معاشی مستقبل فراہم
کرنا ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اُمور ریاست عوام کی بھرپور شرکت
اور مؤثر مشاورت سے چلانے کی عادت نہیں ڈالی جاتی۔ منتخب وزراءاعظم کی ایوان اقتدار سے

تذلیل آمیز رخصتی، انہیں گولی، پھانسی، جلاوطنی اور خودکش حملوں کا نشانہ بنا کر ایک مصنوعی قیادت
پیدا کرنے اور جعلی جمہوریت کے ذریعے ملک چلانے کی پالیسی کا نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ
صدر، وزیراعظم اور سابق وزراء اعظم میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔ لہٰذا صدر جنرل (ر) پرویز
مشرف سب سے پہلے پاکستان کے اپنے نعرے کی لاج رکھتے ہوئے ٹی وی پر آئیں، اپنی ذات کو
بالائے طاق رکھ کر تمام سیاسی قائدین کو مل بیٹھنے اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کی دعوت دیں،
جس میں اتفاق رائے کی قومی حکومت کی زیرنگرانی دو اڑھائی ماہ کے اندر منصفانہ انتخابات کے
انعقاد کے لئے غیر جانبدار خود مختار اور آزاد الیکشن کمیشن کی تشکیل کی منصوبہ بندی کی جائے تاکہ
شفاف انتخابات کے بعد نہ صرف انتقال اقتدار کا مرحلہ طے ہو بلکہ نئی اسمبلیاں آئین کے مطابق
صدارتی انتخاب میں بھی حصہ لے سکیں۔

بینظیر بھٹو کی شہادت سے اگر کسی شخص، جماعت یا ادارے کو یہ خوش فہمی لاحق ہے کہ وہ
اب اطمینان سے اقتدار پر اپنا قبضہ برقرار رکھ کر اپنی مرضی کے انتخابات کرانے اور من مانے نتائج
حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اسے احمقوں کی جنت سے باہر نکل کر زمینی حقائق کا ادراک کرنا
چاہئے اور کوئی بھی فیصلہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے علاوہ دیگر سیاسی و مذہبی جماعتوں کی
مسلمہ قیادت کے بامقصد مشورے کے بغیر نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت ملک و قوم کو مصالحت،
مفاہمت اور اتفاق رائے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، یہ قومی بقاء اور استحکام کے حوالے سے
ہر شخص کے کردار اور فرض ادا کرنے کا وقت ہے اور شہید جمہوریت بینظیر بھٹو کی قربانی کا تقاضا ہے،
جسے کسی قیمت پر رائیگاں نہیں جانا چاہئے۔

اس موقع پر سندھ اور دیگر مقامات پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جو ردعمل ظاہر کیا، وہ
فطری ہے لیکن قومی زندگی میں پیش آنے والے ایسے ناخوشگوار، تکلیف دہ اور ناقابل برداشت
واقعات کو صبر حوصلے سے برداشت کرنا اور ردعمل کے اظہار میں کسی قسم کے بے اعتدالی کا شکار نہ
ہونا ہی آدمیت کی معراج ہے۔ اس سانحہ پر پورا ملک سوگوار ہے لیکن قومی املاک کو تباہ کرنا اور ملکی
نظام میں خلل ڈال کر اپنے ہی بھائی بندوں کی مشکلات میں اضافہ کرنا غم کے اظہار کا صحیح طریقہ
نہیں۔ اس لئے پیپلز پارٹی کی قیادت کو اس حوالے سے بھی اپنا قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئے اور
اعتدال پر مبنی ردعمل کے ذریعے غیر جمہوری قوتوں کو اپنے عزم و اتحاد کا تاثر دینا چاہئے تاکہ اس
قربانی سے ملک کے استحکام، جمہوریت کی بحالی اور آئین و قانون کی بالادستی کا مقصد حاصل کیا جا

سکے، جو بینظیر بھٹو کے پیش نظر تھا۔

بینظیر بھٹو ایک بہادر خاتون کی طرح غیر جمہوری حالات اور غیر سیاسی قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ان کی شہادت سے پیپلز پارٹی میں قیادت کا خلاء پیدا ہوا ہے جو بھٹو خاندان کا کوئی فرد یقیناً پر کرے گا اور قوم کو اُمید ہے کہ پیپلز پارٹی وفاق کی سیاست کر کے ان عناصر کی سازشوں کو ناکام بنادے گی، جو اسے سندھ تک محدود کرنے اور بھٹو خاندان کی قیادت سے محروم کرنے کے لئے مسلسل کوشاں رہی ہیں۔ بینظیر بھٹو نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آج خیبر سے کیماڑی تک طاری سوگ اس بات کا ثبوت ہے کہ غیر جمہوریت قوتوں نے ملک کو صوبوں، علاقوں، زبان ونسل اور فرقوں طبقوں میں بانٹنے کے لئے اب تک جو کوششیں لیں وہ ناکام ہوگئی ہیں اور یہ قوم متحد ہو کر ایک مقبول عوامی قائد کا سوگ منا رہی ہے۔ پوری قوم بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی کے اس غم میں شریک ہے، پیپلز پارٹی کے قائدین، کارکنوں اور بہی خواہوں کو ثابت کرنا چاہئے کہ بینظیر بھٹو کی شہادت سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ وہ بھٹو اور بینظیر بھٹو کی قربانیوں کو ملک میں حقیقی جمہوریت، آئین اور آزاد عدلیہ ومیڈیا کی بحالی کے لئے استعمال کریں گے اور غیر جمہوری قوتوں پر واضح کرنا چاہئے کہ

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

(روزنامہ نوائے وقت۔ 29 دسمبر 2007ء)

■ ■ ■

بے مثال زندگی۔ بے نظیر شہادت

آج پاکستان پھر رنج وغم میں ڈوبا ہوا ہے۔ قوم کا ایک ایک فرد سوگوار ہے۔ آج گڑھی خدا بخش میں ایک اور بھٹو کو مٹی کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ جمعہ کے مبارک دن صرف محترمہ بینظیر بھٹو کو نہیں ایک سیاسی عہد کو دفن کیا گیا ہے۔ جمہوریت کے لئے طویل جدوجہد کو زمین کے حوالے کیا گیا ہے۔ جمعرات کو جب سورج ڈوب رہا تھا تو پاکستان کے سیاسی اُفق پر تین دہائیوں سے چمکنے والا ایک ستارہ بھی ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ جمہوری اداروں کے استحکام، پاکستان کی بقاء، عوام کی حکمرانی، انتہاپسندی کے خاتمے کے عزائم لے کر آٹھ سالہ خود جلاوطنی ختم کر کے وطن واپس آنے والی دختر مشرق کو ایک دہشت گرد نے اپنی سفاکی کا نشانہ بنالیا۔ اسی لیاقت باغ میں 56 سال پہلے پاکستان کے پہلے وزیراعظم قائد ملت لیاقت علی خان کو بھرے جلسے میں گولی مار کر شہید کیا گیا تھا۔ جمعرات کی شام لیاقت باغ پھر مقتل بن گیا۔ مسلم دُنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم بننے کا شرف حاصل کرنے والی، لاکھوں کارکنوں کی عقیدتوں اور محبتوں کی مرکز محترمہ بینظیر بھٹو پر اس وقت فائرنگ کی گئی جب وہ ایک بڑے انتخابی جلسے سے خطاب کے بعد رہائش گاہ واپسی کے لئے روانہ ہوتے وقت کارکنوں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ یہ ان کی زندگی کا آخری الوداعی منظر بن گیا۔ جدوجہد سے عبارت ایک عہد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ملکی بقاء اور سلطانی جمہور کی لگن اُبھارنے والی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کردی گئی۔

انتہاپسند کتنے طاقتور ہوگئے ہیں۔ تمام تر حفاظتی اقدامات بے اثر رہ جاتے ہیں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی بے بس ہو جاتی ہے۔ دہشت گرد اپنے ہدف تک پہنچ جاتے ہیں۔ مملکت، حکومت، عوام محض تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایک طرف جلسے میں شرکت کرنے والے کئی ہزار، دوسری طرف ایک تنہا خودکش بمبار اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک فرد کو نہیں ایک عہد کو، ایک ادارے کو قتل کر رہا ہے۔ جمہوریت، سیاسی جدوجہد،

اعتدال پسندی، تہذیب وثقافت کی اعلیٰ اقدار کا خون بہا رہا ہے۔ پورا ملک مایوسیوں میں ڈوب گیا ہے۔ گاڑیاں، دُکانیں جل رہی ہیں۔ بینظیر بھٹو کے عقیدت مند ماتم کر رہے ہیں، سکتے میں ہیں، انتہا پسند ملک میں یہی ہنگامے، بلوے، فساد دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ نوجوانوں کو خودکش حملوں کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ قوم کی رہنمائی کرنے، دلوں پر حکومت کرنے والی شخصیتوں کو منظر عام سے ہٹا رہے ہیں۔ آج صرف بلاول، بختاور، آصفہ ہی نہیں ہیں۔ دُنیا بھر کے مدبرین، رہنما کی شہادت بینظیر بھٹو کے المناک سانحہ پر دُکھ کا اظہار کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ پاکستانی قوم کے رویوں پر ماتم بھی۔ جہاں اپنے قائدین کو گولیاں ماری جاتی ہیں، پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے، اظہار خیال پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، عدلیہ، میڈیا جبر کا نشانہ بنتے ہیں۔ جہاں سے دُنیا کو اچھی خبریں کبھی کبھار، ہلاکتوں، شہادتوں، حراستوں کی خبریں اکثر ملتی ہیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو صرف 70 روز قبل ہی آٹھ سالہ جلاوطنی ختم کر کے آئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہوئے کہا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے لیکن میں اپنے وطن کے لئے، اپنے لوگوں کے لئے اپنی سرزمین پر واپس آ رہی ہوں۔ ہم ڈریں گے نہیں، انتہا پسندی کا مقابلہ کریں گے۔ آمریت انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے، تحفظ دیتی ہے۔ زندگی کے ان آخری 70 دنوں میں سیکورٹی کے حوالے سے بار بار تنبیہ کے باوجود وہ جلسوں سے خطاب کرتی رہیں۔ شدت پسندی، دہشت گردی اور آمریت کو للکارتی رہیں۔ لیاقت باغ پنڈی کے جلسے میں خودکش حملے کا خطرہ ظاہر کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ اپنے اُصولوں، آدرش، سچائی، وطن کی بقاء اور مکمل جمہوریت کی بحالی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیا۔ صرف 54 سال کی عمر میں وہ ایک شان سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ایک لافانی مقام ان کو حاصل ہو گیا۔

آج ہم سب ان کی مغفرت کے لئے دست دُعا بلند کر رہے ہیں تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ قائداعظم کے ساڑھے 16 کروڑ عوام کے پاکستان کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ معاشرے کو درپیش مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ فی الحال تو انتخابی عمل بے معنی ہو گیا ہے۔ تمام اعتدال پسندوں اور سیاسی جماعتوں کو غور کرنا چاہئے کہ غیر سیاسی، غیر جمہوری عناصر معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط کر رہے ہیں۔ وہ جہاں جو چاہیں کر سکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ بہت سے دوسرے عوامی رہنماؤں، دانشوروں کو بھی دھمکیاں مل چکی ہیں۔ وہ بھی دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ کیا پاکستانی معاشرہ یونہی بے بس خاموش تماشائی بنا حقیقی دُشمن کا تعین کئے بغیر روایتی

تضادات میں اُلجھا رہے گا۔ کیا سب پاکستانیوں کو حقیقی جمہوریت کے قیام، جمہوری اداروں کے استحکام، انتہا پسندی کے خاتمے کے لئے اتفاق رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔ مصلحت کو خیرباد نہیں کہنا چاہئے۔ معصوم لوگوں کا خون بہانے والوں کے خلاف متحد ہو کر کارروائی نہیں کرنا چاہئے۔ شدت پسند پاکستان سمیت پورے عالم اسلام کو دانش، تدبر اور حکمت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ بہت خون بہہ چکا، بہت تباہی بربادی ہو چکی، مذہب کے نام پر انسانیت کو بہت کچلا جا چکا۔ محترمہ بینظیر بھٹو کے لئے ان کے پیروکاروں، جمہوری کارکنوں کا بہترین خراجِ عقیدت یہی ہو سکتا ہے کہ سب مل کر ایسی حکمت عملی اختیار کریں جس سے مزید نوجوان انتہا پسندی کا ایندھن نہ بنیں۔ دہشت گردوں کے سرپرست ہمارا مستقبل ہم سے چھیننا چاہتے ہیں۔ آیئے ان بے چہرہ، بے نام دُشمنوں کی طاقت کا ادراک کریں۔ یہ انسانیت، تہذیب وتمدن، زندگی کی خوشبوؤں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اپنا دُشمن سمجھ رہے ہیں، آپس میں لڑ رہے ہیں جس سے یہ طاقتور ہو رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ اور عوام ان مملکت دُشمنوں کا مقابلہ اسی وقت زیادہ اعتماد اور قوت سے کر سکتے ہیں جب سازگار ماحول میسر ہو۔ ماحول آزاد اور ذمہ دار عدلیہ، میڈیا سے سازگار ہو سکتا ہے۔ مملکت کا ہر ادارہ اپنا اپنا فرض پوری آزادی اور ذمہ داری سے انجام دے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی صورت میں پاکستانی قوم نے بہت بڑی قربانی دی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اب صرف پاکستان کی بقاء کو سامنے رکھا جائے۔ حکمراں اور اپوزیشن رہنما ذاتی اقتدار اور مفادات کی خاطر ملک کو مزید خطرات سے دوچار نہ ہونے دیں۔

(روزنامہ جنگ۔ 29 دسمبر 2007ء)

سانحے کے بعد

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بینظیر بھٹو کو جمعہ کے روز ہزارہا عقیدت مندوں کی موجودگی میں ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اس المناک سانحے نے پوری قوم پر ایک سکتہ ساطاری کر دیا ہے۔ حادثے کے دوسرے روز بھی سارے ملک پر غم کے بادل چھائے رہے۔ سکول، کالج، سرکاری و کاروباری دفاتر اور مارکیٹیں مکمل طور پر بند رہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ، اجتماعی سرگرمیاں اور کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ مشتعل جذباتی کیفیت نے لوگوں کو ابھی تک سنجیدگی سے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ قاتل کون ہے؟ اور قتل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟ یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ بینظیر بھٹو کے قتل سے پاکستان کے قومی وجود کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی شاید کبھی نہ ہو سکے۔ اس ظالمانہ قتل نے پاکستانیوں کو شدید بے یقینی، عدم تحفظ اور بداعتمادی کے بحران میں دھکیل دیا ہے۔ وہ مشتعل جذباتی کیفیت میں مختلف جانب انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ مختلف شہروں میں بپھرے ہوئے ہجوموں نے سوچے سمجھے بغیر ریلوے اسٹیشنوں، ریل گاڑیوں، سینکڑوں موٹر کاروں، بسوں اور سرکاری دفاتر سمیت متعدد عمارات کو نذرِ آتش کر دیا۔ انہیں اس کیفیت سے نکالنے اور مزید المیوں سے بچاؤ کے لئے لازم ہے کہ اس واردات کی بے لاگ اور سائنٹفک تحقیقات کا فوری اہتمام کیا جائے۔ ماضی کی متعدد خون ریز وارداتوں کی طرح اسے بھی حسبِ سابق خودکش حملہ قرار دے کر تحقیقات کے فرض سے سبکدوش ہونے کی روش قوم کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔ تحقیقات میں خصوصاً اس امر کا جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مبینہ حفاظتی تدابیر کے باوجود تخریب کاروں کو حفاظتی حصار توڑنے کا موقع کیسے ملا اور وہ کیسے ایک قومی رہنما کو قتل کر کے روپوش ہو گئے۔ قومی یکجہتی کے نقطہ نظر سے اس قتل کا سراغ لگایا جانا ناگزیر حد تک ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر باہمی اعتماد تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

بینظیر بھٹو پر حملہ اس وقت کیا گیا جب وہ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسہ عام سے

خطاب کرنے کے بعد پارک سے باہر آ رہی تھیں۔ بعض چشم دید گواہوں اور پولیس اہلکاروں کے مطابق نامعلوم حملہ آور نے پہلے گن فائر سے حملہ کیا اور پھر اپنے آپ کو دھماکے سے اُڑا لیا۔ گواہوں نے کہا کہ انہوں نے گن شاٹس کی آوازیں اس وقت سنیں جب بینظیر بھٹو مرحومہ استقبال کرنے والے ہجوم کو ہاتھ ہلا کر نعروں کا جواب دینے کے لئے بلٹ پروف گاڑی میں سن روف سے سر باہر نکال کر کھڑی ہوئیں۔ دھماکے کی آواز سے پہلے ہی ان کا چہرہ منظر سے غائب ہو گیا۔ جبکہ دھماکے کے بعد جائے واردات موت کے میدان میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت کسی کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ بینظیر بھٹو کو گولی لگ چکی ہے۔ انہیں فوراً قریبی ہسپتال میں لے جایا گیا لیکن وہ وہاں پہنچنے سے قبل ہی انتقال کر گئی تھیں۔ مخدوم امین فہیم نے بھی جو مس ناہید کے ہمراہ اسی کار میں سوار تھے، اخبار نویسوں کو بتایا کہ انہوں نے بھی اس وقت چار فائروں کی آواز سنی۔ جب بینظیر بھٹو گاڑی کی سن روف سے نعرے لگانے والے ہجوم کے جواب میں ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو بلاشبہ بڑی بہادر خاتون تھیں لیکن ذرا سی چوک نے قاتلوں کو کاری وار کرنے کا موقع دے دیا اور بلٹ پروٹ گاڑی بھی ان کی جان نہ بچا سکی۔

اس المناک حادثے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور سول سوسائٹی کو اس ماحول کا صحیح ادراک نہیں ہو سکا، جس نے پاکستان کو گھیر رکھا ہے۔ انہوں نے سنجیدگی سے اس بات کا نوٹس ہی نہیں لیا کہ انہیں کیسے کیسے سنگین خطرات کا سامنا ہے اور کس طرح دہشت گرد ان کے اردگرد موجود ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کے باعث سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں نے اپنے تحفظ کے لئے سنجیدہ کارروائیاں کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ راولپنڈی میں بینظیر بھٹو پر حملے سے یہ بات واضح ہے کہ کراچی میں بھی درحقیقت انہی کو نشانہ بنایا گیا تھا لیکن ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ کراچی میں خوفناک حملے کے بعد بھی ایسے حفاظتی انتظامات نہ کئے جا سکے جو قومی سطح کے رہنماؤں کے لئے لازم ہونے چاہئیں۔ جمعرات ہی کو اس سے قبل اسلام آباد میں مسلم لیگ (ن) کے جلسے پر فائرنگ میں پانچ افراد جاں بحق ہوئے۔

ہمیں بڑے دُکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حکومت اور سیاست دانوں کے درمیان عدم اعتماد کی خلیج حائل رہی جس کی وجہ سے سیاست دانوں کو ممکنہ خطرات کی سنگینی کا احساس ہو سکا نہ انہوں نے خود اپنی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر ملحوظ رکھیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومت اور

سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کے درمیان اس بارے میں مکمل مفاہمت وجود میں لائی جاتی اور اس کی روشنی میں جلسے جلوسوں اور دوسری انتخابی سرگرمیوں کی نوعیت اور حدود طے کی جاتیں، لیکن اس کے برعکس فریقین میں غلط فہمیاں اور بے اعتمادی حاوی رہی۔ بہرحال اب بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اب سب ملک کی سلامتی کو درپیش خطرات سے نپٹنے کے لئے حکمت عملی طے کریں۔

کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ان ظالمانہ تخریبی کارروائیوں کے پیچھے کس قوت کا ہاتھ ہے تاہم یہ واضح ہے کہ جو کوئی بھی ہے اس کا مقصد پاکستان کو انتشار، افتراق اور خانہ جنگی کی بھٹی میں دھکیلنا ہے۔ ایسے پراسرار حادثات سے بچنے کے لئے لازم ہے کہ بلا تاخیر قومی سطح پر مشاورت کا اہتمام کیا جائے۔ دریں اثناء رہنماؤں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں گے کہ گھیراؤ جلاؤ سے قومی اثاثوں کے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور بالآخر اس کا بوجھ غریب عوام ہی پر منتقل ہوگا۔ عام لوگوں اور قوم کے اثاثوں کو جلانے اور لوٹنے والے بینظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے ہمدرد اور خیر خواہ نہیں ہوسکتے، ان کا راستہ روکا جانا چاہئے۔

ایک قومی رہنما کے قتل کا سانحہ بلاشبہ ہوش و حواس گم کردینے والا سانحہ ہے، لیکن قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ جمہوری عمل کو بہرحال جاری رکھا جائے۔ میاں محمد نواز شریف نے الیکشن کا بائی کاٹ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات میں انتخابی مہم جاری رکھنا بہت مشکل ہے، تاہم مناسب ہوتا کہ وہ یہ اعلان کرنے سے قبل اپنی پارٹی کا اجلاس طلب کرتے اور دوسری جماعتوں سے بھی مشورے کا اہتمام کرتے۔ موجودہ سنگین صورتِ حال کا مقابلہ جذباتی ردعمل سے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا جائے۔

(روزنامہ پاکستان۔29دسمبر2007ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو کا بہیمانہ قتل......ایک بھیانک سانحہ

جمعرات کی شام پاکستان پیپلز پارٹی کی تاحیات چیئرپرسن اور سابق وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو کا قتل ہماری سیاسی تاریخ کا ایک انتہائی المناک، افسوس ناک اور اندوہناک واقعہ ہے۔ خاص طور پر جن حالات میں یہ سانحہ ہوا ان حالات میں پاکستان کی سیاسی بنیادیں پہلے ہی اپنی جگہ پر کمزور ہوتی نظر آرہی تھیں لیکن محترمہ کی واپسی اور جمہوری عمل میں حصہ لینے کے دانشمندانہ فیصلے سے کچھ اُمید بندھی تھی کہ الیکشن کے بعد پاکستان نئے جمہوری دور میں داخل ہوگا، جمہوری ادارے مستحکم ہوں گے اور آئین و قانون کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ مقبول عام لیڈر شپ کی قومی سیاست میں واپسی سے سیاسی زندگی میں نکھار آئے گا۔ یوں فوجی حکومت کے بعد نیم فوجی حکومت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا لیکن اس بہیمانہ قتل نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے چند ایک المناک سانحوں کی یاد تازہ کردی۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائد ملت اور وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کا راولپنڈی کے ہی کے ایک جلسہ عام میں سنگدلانہ قتل، جس کے اسرار سے آج تک پردہ نہ اُٹھ سکا۔ عدالت عظمٰی کے ایک فیصلے کے نتیجے میں جس میں تمام جج متفق بھی نہیں تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہی کے بانی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے ایک مقدمے میں سنائی جانے والی پھانسی کی سزا اور دُنیا بھر کے ممالک سے پھانسی روکنے کے مشوروں اور پیپلز پارٹی کے لاکھوں، کروڑوں حامیوں کے پرجوش مطالبوں کے باوجود راولپنڈی ہی کی جیل میں دی جانے والی پھانسی، پھر کچھ عرصہ بعد صدر ضیاء الحق کے طیارے کا بہاولپور کے قریب سفارت کاروں، فوجی جرنیلوں اور افسروں سمیت فضاء میں پھٹ جانا اور سب کا جاں بحق ہونا اور اب الیکشن سے بارہ دن پہلے پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی ایک مقبول سربراہ کا جلسہ عام میں ظالمانہ قتل، اس قتل نے پہلے تین واقعات کی طرح ایک بار پھر پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جو بھی اس دُنیا میں آیا اسے ایک دن جانا ہے

لیکن جناب فیض احمد فیض کے اس شعر کے مصداق۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بینظیر بھٹو اپنے والد مرحوم کی طرح بہادروں کی طرح زندہ رہیں اور بہادروں کی طرح ہی اس دُنیا سے رخصت ہوئیں۔ اخبارات کی خبریں گواہ ہیں کہ طویل غیر حاضری اور جلاوطنی کے بعد واپس وطن آنے لگیں تو اس اندیشے کا اظہار کیا گیا کہ ان کی جان خطرے میں ہوگی۔ اس سلسلے میں ان کے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور طالبان کے حوالے سے امریکی فوج کے بارے چند ایک بیانات کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا کہ اندیشہ ہے کہ پاکستان میں ان پر خودکش حملہ نہ ہو جائے لیکن بھٹو کی بیٹی نے شاید ڈرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو نے کہا میں پاکستان جاؤں گی اور پھر وہ پاکستان آنے لگیں تو ایوانِ صدر کی طرف سے انہیں پیغام بھیجا گیا کہ وہ صرف چند روز رُک جائیں کیونکہ خفیہ ایجنسیوں کی اطلاع ہے کہ ان کی آمد پر جو جلوس نکلے گا اس پر خودکش حملے کا اندیشہ ہے لیکن محترمہ نے اپنی آمد کی تاریخ بدلنے یا ہفتہ دس دن مزید باہر رُکنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ ان کی سیکورٹی کے لئے سرکاری مشینری کی طرف سے خود ان کے نمائندوں نے بالخصوص سابق چیف انٹیلی جنس بیورو رحمان ملک نے تفصیلات طے کیں۔ محترمہ کے لئے کھلے ٹرک پر ایسے مخصوص شیشے کا کیبن تیار کیا گیا جو بلٹ پروف تھا لیکن محترمہ نے استقبالی جلوس میں مسلسل کئی گھنٹے شیشے کے اس محفوظ کیبن سے باہر کھڑے ہو کر اپنے مداحوں اور جانثاروں سے باتیں کیں لیکن جلسہ گاہ تک نہ پہنچ سکیں۔ کیونکہ عوام کا سمندر راستے میں حائل تھا اور ان کا قافلہ جیسے چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ آٹھ گھنٹے میں وہ بمشکل کارساز تک پہنچیں۔ صبح سے شام ہو گئی تھی اور رات کے سائے پھیل رہے تھے۔ کارساز کے مقام پر ہی ان کے استقبالی جلوس کے سامنے ایک چھوٹی کار میں دھماکہ ہوا جو دھماکہ خیز مواد سے لدی ہوئی تھی۔ اس دھماکے سے پہلے بھی گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ جیسے خودکش حملہ آور نے محترمہ اور ان کے ساتھیوں پر گولی چلانے کی کوشش کی ہو اور بعد میں ان کے ٹرک کو اُڑانے کے لئے بارود سے بھری ہوئی کار کو اُڑا دیا گیا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ محترمہ حملے سے کچھ دیر پہلے ذرا آرام کے لئے ٹرک کے نچلے حصے میں چلی گئی تھیں ورنہ ان پر حملہ جان لیوا ثابت ہوتا۔ محترمہ کو بمشکل ساتھیوں سمیت بلاول ہاؤس تک پہنچایا گیا اور کم و بیش ایک سو پچاس جانوں کا نذرانہ دینے کے بعد ان کے لاکھوں جانثار منتشر ہو گئے اور جلسہ ملتوی کر دیا

گیا۔ اس کے باوجود محترمہ بینظیر بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ ایسے حملوں سے نہیں ڈرتیں اور اپنے والد کے مزار کے علاوہ وہ سندھ کا دورہ بھی کریں گی۔ الیکشن کی آمد سے قبل انہوں نے بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا۔ صرف چند روز پہلے پشاور کے جلسہ عام میں پولیس نے محترمہ کے جلسہ گاہ کے عقب سے ایک مشتبہ شخص کو گرفتار کیا جس کی جیکٹ میں دھماکہ خیز مواد بھرا ہوا تھا۔ اس مشتبہ شخص کی گرفتاری اور تھانے میں تفتیشی حکام کو سپردگی کی خبریں ٹی وی چینلوں پر چلیں اور اخبارات میں شائع ہوئیں۔ پھر محترمہ کے راولپنڈی کے جلسہ عام کا اعلان ہوا۔ وزارتِ داخلہ کی طرف سے نگران وزیر داخلہ نے اعلان کیا کہ خفیہ ایجنسیوں کی اطلاع کے مطابق پرویز مشرف، بینظیر بھٹو، نواز شریف اور فضل الرحمٰن پر خودکش حملوں کا خطرہ ہے لیکن محترمہ کا حوصلہ ہمیشہ کی طرح بلند رہا اور انہوں نے جمعرات کی شام راولپنڈی کے جلسہ عام میں بھرپور خطاب کیا جو ان کی زندگی کا آخری خطاب ثابت ہوا۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق پہلے انہیں گولیاں لگیں پھر ایک خودکش حملہ میں تیس سے زائد جانیں تلف ہو گئیں اور بے شمار لوگ زخمی ہو گئے۔ محترمہ کو سخت سیکورٹی میں ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ جاں بحق ہو گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے والد صاحب جناب بھٹو المناک حالات میں دُنیا سے رخصت ہوئے اور قائداعظم کے بعد پاکستان کے عوام کے صحیح معنوں میں مقبولِ عام لیڈر کو پھانسی کے تختہ پر جھولنا پڑا۔ محترمہ کے بھائی شاہنواز بھٹو پیرس میں پراسرار حالات میں وفات پا گئے۔ ان کے دوسرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور ستم یہ کہ اس وقت ان کی بہن وزیراعظم پاکستان تھیں۔ ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو ایک مدت سے شدید علیل ہیں اور ان کی یادداشت جواب دے چکی ہے۔ محترمہ کے بیٹے بلاول برطانیہ میں زیرِ تعلیم ہیں اور ان کی دو بیٹیاں بختاور اور آصفہ دبئی میں اپنے والد آصف علی زرداری کے ساتھ مقیم تھیں۔ جو اس واقعہ کے بعد پاکستان پہنچ گئی ہیں۔ یہ خاندان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ باپ کے بعد بیٹی کو بھی عوام میں بے اندازہ پذیرائی ملی لیکن اس لحاظ سے بدقسمت ہے کہ اس کے اکثر ارکان خاندان نے زندگی میں جاں گسل جدوجہد کے باعث دُکھ اور مصیبتیں برداشت کیں اور اس سے زندگی کا خاتمہ المناک حالات میں ہوا۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی چھوٹی بہن صنم بھٹو بھی دبئی ہی میں ان کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ تاہم وہ شروع سے ہی سیاست سے الگ تھلگ رہیں۔ یوں بھٹو خاندان کی سیاسی طور پر آخری نشانی محترمہ بینظیر بھٹو بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔

پیپلز پارٹی جو نہ صرف پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت سمجھی جاتی ہے بلکہ چاروں صوبوں میں اس کی مؤثر موجودگی کی وجہ سے محترمہ کو وفاق کی زنجیر بھی کہا جاتا تھا۔ یہ زنجیر ٹوٹنے سے وفاق کو کس قدر نقصان پہنچا ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بھٹو صاحب کی اصل میراث پیپلز پارٹی ہے۔ مخدوم امین فہیم سینئر نائب صدر، جہانگیر بدر سیکرٹری جنرل ہیں۔ آصف علی زرداری غیر اعلانیہ طور پر محترمہ بینظیر بھٹو کے بعد بھٹو خاندان کے سیاسی وارث ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی پیپلز پارٹی کو یہ لیڈر شپ سیاسی طور پر سنبھال سکے گی یا نہیں؟ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا۔ کیونکہ جو شخصیت اس دُنیا سے رخصت ہوگئی اس کی ذہانت، قادر الکلامی، سیاسی زیرک پن نے بہت بڑا خلا پیدا کر دیا ہے۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا ردعمل بھی قدرتی امر ہے اور اس غم و غصے کا اظہار کسی ایسی بڑی تحریک کی شکل میں بھی یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے کہ مرحومہ ایک جمہوری اور پرامن معاشرے کے قیام کی خواہاں تھیں اور پرامن سیاسی جدوجہد ان کا راستہ تھا۔ پیپلز پارٹی کے کارکن اپنے غم و غصے کو بھٹو صاحب اور ان کی بہادر بیٹی کے خوابوں کی تعبیر میں ملک کو جمہوری راستے پر بھی ڈال سکتے ہیں لیکن یہ غم و غصہ برداشت سے باہر ہو جائے اور صبر و تحمل کی دیواروں کے اندر نہ رہ سکے تو نتیجے میں سامنے آنے والی توڑ پھوڑ ملک عزیز کو جو پہلے ہی بحرانوں کی زد میں ہے، کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کرے اور ان کے اہل خانہ بالخصوص جناب آصف علی زرداری، بلاول، بختاور، آصفہ اور صنم کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے اصل بچوں اور بھائیوں یعنی پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو جن کی وہ لیڈر ہی نہیں بڑی بہن بھی تھیں، اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے اور اپنی قوت کو مثبت راستوں پر چلانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(روزنامہ خبریں۔ 28 دسمبر 2007ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو کی یادگار تحریریں

ذوالفقار علی بھٹو...... پاکستان میں جمہوریت کی پیش رو

ہمیشہ کی زندگی قربانیاں دینے والوں کے حصے میں آتی ہے

پاکستان کو معتدل ملک بنانے والے ذوالفقار علی بھٹو نے تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان کے کارناموں میں 1973ء کا آئین، کا شملہ سمجھوتہ جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے درمیان سب سے لمبے عرصے کے لئے امن قائم رہا، ایک جمہوری معاشرہ کی تعمیر کے لئے سماجی تبدیلیاں، غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی، نیوکلیئر پروگرام اور ملک میں سماجی، معاشی اور فوجی تعمیر و ترقی کا تانا بانا شامل ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو انتہائی اعلیٰ درجہ کے دانشور تھے۔ وہ ایک دانشور، ایک مصنف اور ایک مقرر تھے۔ وہ قابل اور انتہائی غور و غوص کرنے والے شخص تھے۔ ایمانداری، صاف بات کہنا اور اپنے وعدے کو پورا کرنا ان کی خصوصیات تھیں۔ وہ اُصولاً غریبوں اور کچلے ہوئے عوام کے دوست تھے۔ وہ ایک عوامی آدمی تھے جنہیں کسی کا خوف نہیں تھا سوائے خدائے بزرگ و برتر کے۔ وہ اس قدر باہمت تھے کہ انہوں نے اپنے نظریات کے لئے موت کو گلے لگا لیا۔ ان کے نظریات میں سب سے بڑا نظریہ آزادی کا نظریہ تھا جو وہ بنی نوع انسان کے لئے چاہتے تھے۔ ان کے دورِ حکومت میں پاکستان نے افریقی قوموں کی ہر طرح سے مدد کی جو اس وقت نسل پرستی کا شکار تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک مسلمان قوم پرست تھے۔ بہت لوگ اسی وجہ سے انہیں ایک پکا مسلمان کہتے ہیں۔ وہ ایک واحد مسلم اُمہ پر یقین رکھتے تھے جس کی ایک ہی فوج یورپ کے ساحلوں سے لے کر افریقہ اور ایشیا کے ریگزاروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک معتدل شخص تھے اور قوم پرستی ان کی نظر میں اتحاد سے تعبیر تھی جس میں انتہا پسندی کا راستہ بند تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ہر مسلمان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ وہ تیسری دُنیا کے لیڈر تھے جنہوں نے نہایت بے باکی سے نسل پرستی اور استعماریت کے خلاف بات کی۔ ان کی تقریروں سے لوگ سحر زدہ ہو جاتے تھے۔ ان کی آواز لوگوں کے دلوں کی گہرائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی باتوں میں شاعری اور جذبہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ ان کی باتوں سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ آج تک لوگوں کے دلوں میں وہ باتیں نقش ہیں۔ ان کی یادداشت بلا کی تھی۔ وہ نام، واقعات اور مقامات یاد رکھتے تھے جس کی وجہ سے لوگ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ وہ بات چیت کی تفصیل تک یاد رکھتے تھے۔ انہیں تاریخ از بر تھی اور اسی سے انہوں نے رہنمائی کا سبق سیکھا تھا۔ وہ لاڑکانہ میں پیدا ہوئے جو صوفیاء کی سرزمین ہے۔ وہ غریبوں سے محبت کرتے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی غریبوں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

انہوں نے بلاخوف قوم کی آزادی کی حمایت کی۔ جب 1973ء میں مشرق وسطیٰ میں جنگ چھڑ گئی تو مسلمان ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے پاکستانی فوجیں بھیجیں جن میں گولان کی پہاڑیوں کی حفاظت بھی شامل تھی۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل کی مدد سے انہوں نے دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کی۔ اس کانفرنس میں فلسطین کے مسئلہ کو مسلمانوں کا مسئلہ قرار دیا گیا جس کے بعد بالآخر مشرق وسطیٰ میں امن کی بات چیت شروع ہوئی۔ قائد عوام کی پچاس سالہ زندگی بین الاقوامی، علاقائی اور ملکی خدمات سے بھرپور ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے عوام کو جمہوریت سے روشناس کرایا اور ان کے دلوں میں جمہوریت کی شمع روشن کی۔ انہوں نے عوام کو جمہوریت کے نظریہ سے جو کہ طاقت اور اختیار کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، روشناس کرایا۔ انہوں نے عوام کو بااختیار بنانے، ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جدوجہد اور ملک میں فوجی آمریت ختم کرنے کی مہم کی قیادت کی۔ انہوں نے غاصبوں کی مخالفت کی اور بندوق کی مدد سے حکومت کرنے والوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ انہوں نے ہاریوں اور کسانوں کو، مزدوروں کو، طالب علموں کو، خواتین کو اور معاشرے کے غریب کچلے ہوئے عوام کو ان کی اہمیت اور ان کے حقوق کا احساس دلایا کیونکہ یہی احساس عوام کو ان کی زندگی بہتر کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو جمہوریت اور جمہوری اقدار سے نہایت لگاؤ تھا اور بالآخر انہوں نے اپنی زندگی آزادی کے لئے دے دی۔ 1969ء میں جب پاکستانی عوام ایوب خان کی آمریت

ختم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی۔ اس موقع پر عدالت میں انہوں نے عوام کے جمہوری حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔ جمہوریت سے بہار کے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ یہ آزادی کا نغمہ ہے اور ہر احساس سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ احساس سے ماسوا ہے کیونکہ جمہوریت بنیادی حق ہے۔ آزاد پریس، تنظیموں سے تعلق رکھنے کی آزادی، عدلیہ کی آزادی، قانون ساز اداروں کی آزادی با اختیار ہونے کی آزادی جمہوریت ہے۔ یہ وہ آزادی ہے جو حکومت وقت کے دور میں ناپید ہے۔

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب ''جنگ اور امن'' کے آخری حصہ میں لکھا ہے کہ تاریخ خیالات کا بہاؤ جن میں سیاسی لیڈر ایک چھوٹا سا کردار ادا کرتا ہے۔ میں یہاں بات کو آگے بڑھانا چاہتی ہوں کہ بعض اوقات خیالات بہت تیزی سے آتے ہیں لیکن کبھی یہ خیالات اتنے آہستہ آتے ہیں جیسے کہ برف کا تودہ آہستہ آہستہ پگھلتا ہے۔ خیالات کا بہاؤ ایک آزاد جمہوری فضاء میں ہوتا ہے۔ اس فضاء میں مخالفت اور کسی بات سے اتفاق نہ کرنے کی آزادی ہوتی ہے جبکہ ڈکٹیٹر شپ میں تاریخ منجمد ہو جاتی ہے جیسا کہ پاکستان میں قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو سے پہلے تھا۔ بھٹو وہ شخص تھے جنہوں نے منجمد اور ڈکٹیٹر شپ کے معاشرے کو ایک متحرک جمہوری معاشرہ بنا دیا، جس کی قیمت انہوں نے اپنی جان دے کر ادا کی۔

انہوں نے فوجی حکومت کی مخالفت کی کیونکہ وہ اس معاشرے کے لئے کینسر کی بیماری سمجھتے تھے، وہ پاکستان کے لئے فوجی حکومت کو بنیادی طور پر سم قاتل سمجھتے تھے کیونکہ پاکستان جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں بنا تھا وہ سرد جنگ کے زمانے میں زندہ تھے جبکہ گرم پانی تک رسائی کے لئے سوویت یونین کوشاں تھا اور کشمیر میں سوویت یونین کے حامیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا اس لئے وہ دفاع کو مضبوط بنانا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ناقابل تسخیر پاکستان کے لئے انہوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی دی اور کامرہ میں ایروناٹیکل فیکٹری بنائی۔ انہوں نے ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا بنایا اور پاکستانی فوج کا مورال بلند کیا۔ وہ بھارت کے کیمپوں سے نوے ہزار پاکستانی جنگی فوجی واپس ملک میں لائے اور 1971ء کے جرنیلوں کو جنگی مقدمات سے بچایا تاکہ ملک کی عزت و وقار باقی رہے۔ انہوں نے فوج کو بدنامی کے داغ سے بچایا جو چند جنرلوں کی وجہ سے ملک کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ یہ

جنرل طاقت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے ملک کو داؤ پر لگا رہے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا ایمان تھا کہ فوج کی سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے فوج اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے محروم ہو جاتی ہے اور اس ادارہ کی کارکردگی تباہ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ پاکستانی فوج ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی ذمے داریوں سے صرف نظر نہیں کر سکتی۔ پاکستان کی عزت و وقار اسی میں ہے کہ فوج سیاسی گورکھ دھندوں میں نہ پھنسے جو فوجی اپنی بیرکوں کو چھوڑ کر حکومت کے ایوانوں میں جاتے ہیں وہ جنگ ہار جاتے ہیں۔

ان کے یہ الفاظ 1981ء میں سچ ثابت ہوئے جب جنرل ضیاء نے سیاچن گلیشیئر ہار دیا اور 1999ء میں جب پاکستانی فوج یکطرفہ طور پر کارگل سے پسپا ہوئی۔ یہ الفاظ 2001ء میں بھی سچ ثابت ہوئے جب پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی تو انہیں پتا چلا کہ شمالی اتحاد کابل میں اقتدار میں آ گیا حالانکہ پاکستان نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔

بہت سارے لوگوں کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مغربی پاکستان بھی تتر بتر ہو جائے گا۔ پاکستان کی یہ دوسری زندگی جو 1971ء میں شروع ہوئی ذوالفقار علی بھٹو کی دور اندیش قیادت کے نتیجے میں ہوئی جنہوں نے ایک مایوس قوم کو دوبارہ عزت سے جینا سکھایا۔ پاکستان ان کی قیادت میں مسلم دُنیا کا محور بن گیا جہاں سائنس، کلچر اور دانشورانہ مہارت کے حامل لوگ اپنی توانائیاں بہتری کے لئے استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔ عالمی لیڈروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیونکہ انہوں نے مسلم دُنیا میں ایک معتدل قیادت دی تھی جو دُنیا میں امن اور ترقی قائم کرنے میں بہت مددگار تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان طاقتور ہوا۔ ملک میں ایک ترقی کے راستے کا تعین ہو گیا تھا۔ ترقی کی رفتار بڑھی اور غیر ملکوں میں مقیم پاکستانیوں نے سرمایہ ملک میں بھیجنا شروع کر دیا۔ عوام کو پاسپورٹ بنوانے کا حق دیا گیا اور وہ ملک سے باہر جانے کے قابل ہو سکے۔ مسلم دُنیا پاکستان کو تقریباً 500 بلین ڈالر سالانہ دے رہی تھی جس کی وجہ سے پاکستان کا عالمی مالیاتی اداروں پر انحصار کم ہو گیا تھا۔ عوام کو نوکریاں اور مواقع ملے۔ انہوں نے پاکستان میں بنیادی انسانی حقوق کو متعارف کروایا۔ خواتین کو آزادی دی اور انہیں پولیس، دفتر خارجہ اور عدلیہ میں جگہ دی گئی۔

انہوں نے پہلے ہی ان ڈکٹیٹروں سے خبردار کر دیا تھا جو جمہوریت کو بنیادی جمہوریت

سے بدلنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ہم جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں اور ڈکٹیٹر ہمیں بنیادی جمہوریت دیتے ہیں اگر بنیادی جمہوریت ہی جمہوریت ہے تو دُنیا کے ہر ملک میں جمہوریت کے بجائے بنیادی جمہوریت کیوں رائج نہیں؟

وہ اعلیٰ اقدار کے پیروکار تھے، جب وقت آیا تو انہوں نے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اپنی جان دینے کو ترجیح دی۔ وہ اس قوت کو بہت دہراتے تھے کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“ انہوں نے کہا کہ وہ دُنیا کو دکھائیں گے کہ ایک عوامی لیڈر کس طرح زندہ رہتا ہے اور کس طرح مرتا ہے، دُنیا نے ان کی زندگی کے لئے التجاء کی کیونکہ یہ شخص دُنیا میں امن اور ترقی کے لئے بہت اہم تھا لیکن ایک جنرل نے اسے ٹھکرا دیا اور رات کی تاریکی میں ان کو پھانسی دینے کا حکم جاری کر دیا۔

ساری دُنیا حیرت زدہ رہ گئی اور بھٹو پھانسی کے پھندے تک پہنچ گئے۔ ساری دُنیا اپنے عظیم بیٹے کے بچھڑ جانے پر حیرت زدہ اور غمزدہ تھی۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی پھانسی کی شدید مذمت کی گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو تاریخ میں ان عظیم لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں جنہوں نے تاریخ رقم کی۔ ان کی شہادت نے دُنیا کے کئی ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا۔ دُنیا کے دارالحکومتوں میں کروڑوں افراد قائد عوام کی پھانسی کی مذمت کے لئے جمع ہوئے۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے وہ جانتے تھے کہ ہمیشہ کی زندگی مقاصد کے لئے قربانیاں دینے والوں کے حصے میں آتی ہے اور ان مقاصد میں سب سے بڑا مقصد ظلم اور جبر سے انسانوں کو آزادی دلانا ہے۔

بھٹو 1928ء میں پیدا ہوئے اور 1979ء میں شہید کر دیئے گئے۔ لیکن وہ ابھی تک عوام کے ذہنوں اور دلوں میں زندہ ہیں اور آسمان پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہے ہیں اور ظلم و جبر میں پھنسے ہوئے انسانوں کے لئے اُمید کا چراغ ہیں۔

انصاف کی اپیل

میرے لئے منصفانہ مقدمات کے امکانات ہی ختم کردیئے گئے

کئی سال قبل جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا تختہ اُلٹا گیا تھا، اس کے خلاف کرپشن کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ دو سال تک اخبارات میں یہی الزامات بار بار دہرائے جاتے رہے۔ اس دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے کسی رہنما کے خلاف (کرپشن کے الزام میں) کوئی مقدمہ عدالتوں میں پیش نہ کیا گیا۔ مڑ کر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میڈیا کی اس دو سالہ مہم کا بعض اہم اور قابل عزت شہریوں پر بھی اثر پڑا۔ ان لوگوں نے جو قانون اور انصاف پر گہرا یقین رکھتے ہیں، کرپشن کے الزامات سے غلط نتائج اخذ کئے۔ دراصل یہ شہری میڈیا کی مہم کے ذریعے ان کی لاعلمی میں برین واشنگ کے عمل سے گزارے گئے جب اخبارات میں ظلم و جبر، تشدد اور ناانصافی پر مبنی واقعات کی خبریں شائع ہوئیں تو ان خبروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اگر ملک کے خزانہ سے ''اربوں ڈالر'' لوٹ لئے گئے ہیں تو اس وقت تک جب تک یہ مال وزر تلاش کر کے واپس ملک میں نہ لایا جائے، قانون تو مذاق بنا رہے گا۔

یہ سب کچھ انصاف کے تقاضوں کے منافی تھا اور اس کے تحت ایک وزیر اعظم اور اس کے شوہر کو سزا سنا دی گئی۔ جب انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے ایک ادارے نے ان کے خلاف تحقیقات کو سیاسی ہونے کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا تو اس ادارے کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ ان الزامات کی تحقیقات کرنے والے نے ایک برطانوی اخبار کے نمائندے کے روبرو متکبرانہ انداز میں کہا کہ انہوں نے گواہوں پر تشدد بھی کیا تھا لیکن اسے تو کچھ نہ کہا گیا بلکہ مظلوموں کو ہی سزا دے دی گئی۔ ایسے خصوصی قوانین بنائے گئے جو ماضی سے مؤثر قرار دیئے گئے اور انصاف کے اُصولوں کو ہوا ہی اُڑا دیا گیا۔ صفائی کے گواہوں کو تو موقع نہ دیا گیا۔ اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع کرائے گئے جن میں مدعا علیہان کو عدالتی فیصلے سے قبل

ہی مجرم قرار دیا گیا تھا۔

اس سب کچھ کے باوجود ان لوگوں نے بھی جو کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھے، خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔ انہیں تو اخبارات میں شائع کرائی جانے والی مختلف خبروں اور دستاویزات کی اشاعت کے ذریعے خاموش کر دیا گیا۔ انہیں غیر ملکی عدالتوں کے فیصلے دکھا کر بے حس بنا دیا گیا۔ اس طرح مخالفوں کے بارے میں حکومت کی گپوں اور جھوٹ کو گویا قانونی شکل دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی بیرونی (غیر ملکی) عدالت میں میرے خلاف کوئی مقدمہ زیر سماعت ہی نہیں، فیصلے کہاں سے آئے۔

سوئزرلینڈ میں اسلام آباد والوں کے غلط اور جھوٹے الزامات کی بنیاد پر تحقیقات شروع کی گئیں۔ برطانیہ میں اسلام آباد کے حکمرانوں نے حکومت سے درخواست کر رکھی ہے کہ وہاں کے مقامی باشندوں کے بیانات حاصل کئے جائیں۔ ہاں اس طرح کے (جھوٹے) پروپیگنڈے کے ذریعے بعض لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا گیا کہ غیر ممالک میں میرے خلاف عدالتی کارروائی ہو رہی ہے۔

قانون کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے خلاف آزادانہ اور منصفانہ فضا میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔ بہت سے مقدمات تو عوامی ماحول کو انصاف کے تقاضوں کے خلاف خراب کر کے اور ہلے گلے کے ذریعے ختم کرا دیئے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈے کے باعث میرے لئے انصاف اور منصفانہ مقدمات کے امکانات ہی ختم کر دیئے گئے۔ میرے خلاف جو الزامات عائد کئے جاتے رہے ہیں۔ انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لئے شہادتوں کے پہاڑ موجود ہیں لیکن میرے خلاف پروپیگنڈا بہت زیادہ کیا گیا اور نفسیاتی جنگ کے ذریعے میرے خلاف عوام میں نفرت پیدا کی گئی۔ صفائی پیش کرنے والوں کو شدید ذہنی دباؤ کا سامنا ہے۔ ہمارے خلاف اسلام کے تصورات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غلط مقدمات کھڑے کئے گئے جن کے نتیجے میں ہماری رُسوائی ہوئی اور بے توقیری کی گئی۔

میں نے جمہوریت کے حق میں مہم چلانے کے لئے واپس پاکستان آنے کا اعلان کیا تو حکومت نے میرے خلاف دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سنا کہ انہوں نے یہ منصوبہ بنا لیا ہے کہ میرے خلاف جو سزا سنائی گئی ہے، سپریم کورٹ سے اس کی توثیق کرا دی جائے گی۔ اگرچہ پاکستان کی سپریم کورٹ میں متعدد دیانتدار اور باوقار، معزز جج صاحبان موجود ہیں لیکن میرے

لئے یہ بات باعث تشویش تھی کہ مقدمہ منصفانہ انداز میں نہیں سنا جائے گا۔ پاکستان کی عدلیہ تو بڑے دباؤ اور جبر کے ماحول میں کام کرتی ہے۔ جج برطرفی کی تلوار کے نیچے کام کرتے ہیں۔ فوج نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی نصف کے قریب ججوں کو تو گھر بھیج دیا تھا۔ فوجی حکومت نے پروپیگنڈا اور شدید مخالفت کے ذریعے جو ماحول پیدا کر رکھا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ فوجی حکومت تو جو چاہے وہی کرے گی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے کام کرنے کے اپنے انداز ہیں۔ ایک ایسا معجزہ رونما ہوا کہ میں جب بھی اس بارے میں سوچتی ہوں تو مجھ پر اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کے ایک افسر نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔ اس نے جب کابینہ کے وزراء اور جج کے درمیان مکالمہ کے ٹیپ سنے تو اس نے صدر پاکستان کو اس بارے میں (خط) لکھنے کا فیصلہ کیا۔ سنڈے ٹائمز کو بھی یہ ٹیپس مل گئے، جس نے ان کی بنیاد پر ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کر دی۔ واشنگٹن میں جب میں پریس سے ملاقات کر رہی تھی تو مجھے بھی یہ رپورٹ مل گئی۔ چنانچہ میں نے پریس والوں کو بھی اس کی نقول فراہم کر دیں۔

جنرل پرویز مشرف کے پاس تین ہفتوں کا وقت تھا کہ وہ مجھے عدالت کے ذریعے اقتدار میں آنے سے روکنے کے لئے فوجی طاقت کا استعمال کریں۔ غالباً پرویز مشرف بھی ان کہانیوں سے متاثر ہوئے تھے جو انہوں نے سن رکھی تھیں۔ میں نے مطالبہ کیا کہ ججوں اور عدلیہ کے بارے میں اقوامِ متحدہ سے تحقیقات کرائی جائیں۔ متعلقہ جج اور کابینہ کے وزراء ایسی تحقیقات سے خوفزدہ ہیں۔ انہوں نے میری بات کی کوئی تائید نہیں کی۔ پاکستان میں بھی یہ تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوگئی۔ جس سے ایوانِ حکومت کے در و دیوار ہل کر رہ گئے۔ اس سے ملک کے دانشوروں کے ضمیر بھی جاگے، جنہوں نے فوراً مطالبہ کیا کہ ان ججوں کو (جن کا ٹیپس سے تعلق ہے) مستعفی ہو جانا چاہئے اور اس پورے معاملے کی تحقیقات ہونی چاہئے۔

سنڈے ٹائمز کی تحقیقاتی رپورٹ میں دھماکا خیز مواد تھا۔ اس سے ججوں اور وزراء کی ٹیپ شدہ بات چیت سامنے آگئی، جس سے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ثابت ہوگئی کہ ججوں کو بلیک میل کیا گیا تھا کہ وہ مجھے سزا سنائیں۔ ان (جج صاحب) کو تو اہلیہ کو بھی یقین ہے کہ حکومت ججوں سے چاہتی تھی کہ وہ میرے مقدمہ میں ناانصافی ضرور کریں۔ یہ بڑے صدمے کی بات ہے کہ ملک کے وزیر قانون نے مقدمہ کا چارج سنبھال رکھا تھا۔ کابینہ کا وزیر برائے احتساب ججوں کو

فیصلہ لکھوا رہا تھا اور (مجھے سزا دلانے کے لئے) ان سے تکرار کر رہا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب مقدمہ کی سماعت کرنے والے جج کو ہلاشیری دے رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ''انصاف کو چھوڑ دو'' ورنہ تمہاری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔

یہ افسوس ناک کہانی، انصاف کی کہانی ہے، جسے ایک ایسی خاتون کے لئے ''قتل'' کر دیا گیا جو ملک کی وزیر اعظم رہ چکی تھی۔ لیکن یہ کہانی انصاف کے ساتھ ارتکاب جرم کی اس کہانی سے کوسوں دور تھی جو پہلی بار رونما ہوئی تھی۔ یہ افسوس ناک، الم ناک کہانی وزیر اعظم سہروردی کو سزا سنانے سے شروع ہوئی اور اس کا خاتمہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی لگانے پر ہوا۔ ان پر ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا جو آج بھی زندہ ہے۔

وزیر اعظم کے حق میں گواہی کا پہاڑ معزز اور نامور قانون دانوں کی طرف سے آیا ہے، جو دُنیا کے تین براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت کے فیصلے کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کیا ہے۔ اس مقدمے کا مواد پہلے پریس میں چھپوایا گیا اور پھر عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس سارے مواد کا مطالعہ کرنے اور کسی بھی معاملے میں ثبوت پیش کرنے کے اُصولوں کی روشنی میں اس تجزیے کے بعد انہوں نے رائے دی کہ اس مواد کے مطابق تو فردِ جرم کی تیاری بھی محال ہے، پھر مقدمہ کی منصفانہ اور آزادانہ ماحول میں سماعت نہیں ہوئی اور یہ کہ مدعا علیہان دلائل کی بنیاد پر بے گناہ ثابت ہوئے ہیں۔

سابق حکومت نے لوگوں کی جو بات چیت ٹیپ کی، اسے سننے کے بعد بین الاقوامی قانون دانوں کی رائے کی توثیق ہوتی ہے۔ ان قانون دانوں میں جو امریکہ اور برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو سابق چیف جسٹس، برطانیہ کا ایک سابق اٹارنی جنرل، پاکستان سپریم کورٹ کے ایک جج اور امریکہ و برطانیہ کی ایک معروف قانونی فرم کے لوگ، شامل ہیں۔ سچ کا سامنا کرنا گویا ان (جن کو سزائیں سنائی گئیں) کی بریت کا ثبوت ہے، لیکن ان لوگوں کو جو تکلیف پہنچی ہے، جس اذیت سے وہ گزرے ہوں، یہ اس کا درماں تو نہیں ہے۔ یہ شفاف، احتساب کا دور ہے۔ انسان ذہنی اذیت بھگت سکتا ہے، برداشت کر سکتا ہے، بشرط یہ کہ اس کے بعد منصفانہ، شفاف، منصفانہ عمل ہوتا نظر آئے۔

پاکستان کی عدلیہ میں جو کرپشن ظاہر ہوئی ہے، اس سے عدلیہ کے ادارے کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ اپنا وقار بحال کرے۔ اس مقصد کے لئے ان کرپٹ ججوں کے خلاف کارروائی کی جاتی

چاہئے جن کا اس معاملے سے تعلق ہے۔ اس سے ملک (پاکستان) کو بھی یہ موقع ملا ہے کہ وہ اپنے اداروں کی اس طرح تعمیر نو کرے، جس کی 21 ویں صدی میں ضرورت ہے۔

سابق وزیر داخلہ اور سابق چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سابق حکومتی زعماء نے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے احکام جاری کئے تھے مجھے یقین ہے کہ میں جب وزیر اعظم تھی تو میرے دفتر بلکہ میری رہائش گاہ کے ٹیلی فون اور بات چیت بھی ٹیپ کی جاتی تھی۔ آج بھی جب میں یہ سب کچھ لکھ رہی ہوں، میرے شوہر کی بات چیت ٹیپ کی جا رہی ہے۔ ان کی ویڈیو فلم بنائی جا رہی ہے۔ حالانکہ وہ جیل کے ایک کمرے میں قید تنہائی میں ہیں۔ جس کی کھڑکیوں کے شیشے سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ کسی کی تنہائی میں یہ بے جا مداخلت ختم ہونی چاہئے۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں تو ہر ملک کا حصہ ہوتی ہیں لیکن انہیں قانون کا پابند بنایا جاتا ہے، رکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایسا ہی کرنے کی ضرورت ہے لیکن ایسا ہونا تب ہی ممکن ہے، جب اسلام آباد ان ٹیپس کو صدائے جرس تصور کرے اور ریاستی اداروں کی صفائی پر کمر بستہ ہو جائے۔ ادارے تو بہت سے ہیں، جن میں پارلیمنٹ، عدلیہ، انٹیلی جنس ایجنسیاں اور مسلح افواج بھی شامل ہیں۔

اسلام الزام تراشی کی سیاست کا مخالف ہے، لیکن دوسرے سب سے بڑے اسلامی ملک میں جھوٹی الزام تراشی، گپ بازی اور کردار کشی کا کھیل بدستور جاری ہے، جو راست بازی اور انصاف کی کسوٹی پر کبھی پورا نہیں اتر سکتا۔ اپنے حالیہ دورۂ مغرب کے دوران میں نے دیکھا کہ وہاں کے رہنما صرف مثبت نکتہ چینی کرتے ہیں اور ذاتی نوعیت کے حملوں سے احتراز کرتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ ری پبلکن حکومت اپوزیشن والوں کو اس بات پر مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ انسانی بھلائی اور باہمی محبت کا ماحول پیدا کرنے کے لئے مل کر کوشش کی جائے۔ امریکہ کے صدر بش نے ڈیموکریٹک سینیٹر کینیڈی کو ایوانِ صدر آنے کی دعوت دی تاکہ وہ مل کر فلم دیکھیں۔ دوستی کا ایسا اقدام یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ سیاست دانوں کے درمیان اختلافات تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہئے۔

جب رہنما سیاسی ایجنڈے پر عمل کرنے کے لئے باہمی احترام سے محروم ہو جاتے ہیں، تو افراد سے زیادہ انسانی معاشرہ اس سے بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ جب سے میں نے وزارت عظمیٰ چھوڑی ہے، ہمارا ملک مالی دیوالیہ پن میں مبتلا ہے۔ اس کے مستقبل پر فوج کا طویل سایہ لہرا رہا ہے۔ جب تک جمہوریت کی گاڑی کو واپس پٹڑی پر نہیں ڈالا جاتا، مستقبل میں مزید سیاسی عدم

استحکام پیدا ہوگا۔ ایسے عدم استحکام نے ملک کو اس حد تک کنگال کر دیا ہے کہ ملک کے نوجوان خود کشی پر مجبور ہو چکے ہیں۔ یہ بڑی اندوہناک بات ہے کہ پاکستان میں ایسے بہت سے غریب لوگ ہیں، جن کے پاس زندہ رہنے کے لئے مالی سکت نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کی بلند و بالا عمارت میں جو میں نے بھاری رقوم صرف کر کے بنوائی تھی اور جس کا میں نے ہی افتتاح کیا تھا، بیٹھنے والے ججوں کو آزادانہ طور پر انصاف کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا۔ انصاف تو پاش پاش ہوتا رہے گا۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ فوج میرے مقدمہ کی از سر نو سماعت کے لئے اسے واپس اسی عدالت میں بھیجنے کو ترجیح دے گی جس نے اولین فیصلہ سنایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے مزید دکھوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ مزید خصوصی عدالتیں قائم کریں گے اور سیاسی ادارے مزید ججوں کو بلیک میل کریں گے، میں تو ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے باعزت بری کیا جانا چاہئے۔ میں اپنی اپیل میں یہی کہوں گا کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ میری اپیل یہ ہے کہ مجھے باعزت بری کیا جائے۔ انصاف کا مزید مضحکہ نہ اڑایا جائے جیسا کہ میرے اور میرے باپ کی روح کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ میں ان لوگوں کی روحوں کو اپنے ساتھ، اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں جو صرف اس لئے موت کے گھاٹ اتر گئے کہ قانون انہیں زندہ رہنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ ان روحوں کی خاطر میں اپنے لئے انصاف کی اپیل کرتی ہوں۔

▪ ▪ ▪

بے نظیر کے خلاف سازشیں

محترمہ بینظیر بھٹو کو روزِ اوّل ہی سے بے پناہ مسائل کا سامنا رہا
اسٹیبلشمنٹ نے بالآخران کی حکومت ختم کر دی

صدر غلام اسحٰق خان نے گیارہ سال کے بعد جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی قومی اسمبلی 6 اگست 1990ء کو توڑ دی۔ وزیر اعظم بینظیر بھٹو اور ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا۔ نومبر 1988ء کے انتخابات کے بعد بینظیر بھٹو نے 2 دسمبر 1988ء کو وزیر اعظم کے عہدہ کا حلف اُٹھایا تھا۔ اپنے فیصلہ کی وجوہات بیان کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ حکومت اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ ذاتی اور سیاسی مفادات حاصل کئے جا رہے تھے۔ صوبائی حکومتوں کے اختیارات سلب کئے گئے۔ شہری اور دیہی علاقوں میں خوف و ہراس کی حکمرانی ہے۔ سرکاری خزانہ موروثی جائیداد کی طرح استعمال کیا جاتا رہا۔ اعلیٰ عدالتوں کی آزادی سلب کی گئی۔ میرا یہ فیصلہ پاکستان کے کروڑوں بے زبان عوام کے اُمنگوں کا مظہر ہے۔ اس کا مقصد غیر آئینی، غیر جمہوری اور غیر قانونی طریقوں کا سد باب کرنا ہے۔ صدر نے اعلان کیا کہ نئے انتخابات اسی سال 24 اکتوبر کو ہوں گے جو گزشتہ انتخابات کی طرح آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوں گے۔ انہوں نے احتساب کے لئے پچاس دن کی حد مقرر کر دی۔ اس اعلان کے ایک گھنٹے کے اندر غلام مصطفیٰ جتوئی نے نگران وزیر اعظم کے عہدہ کا حلف اُٹھالیا۔ صوبہ پنجاب میں میاں اظہر گورنر اور غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ، سندھ میں محمود اے ہارون گورنر اور جام صادق وزیر اعلیٰ، سرحد میں گلستان جنجوعہ گورنر اور میر افضل خاں وزیر اعلیٰ اور بلوچستان میں جنرل موسیٰ گورنر اور سردار اکبر بگٹی کے داماد میر ہمایوں مری وزیر اعلیٰ نامزد کر دیے گئے۔ بینظیر بھٹو نے اس اقدام کو آئین سے بغاوت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان پر لگائے گئے تمام الزامات لغو اور بے بنیاد ہیں۔ جس اسمبلی نے صدر کو منتخب کیا تھا،

اس کے ختم ہونے پر صدر کا اپنے عہدہ پر باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ مستعفی ہوں۔ 6 اگست کے صدارتی حکم نے قومی خزانے کو پانچ کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ نگران حکومتوں میں پیپلز پارٹی کے کٹر دشمن اور مسلم لیگ کے حامی شامل کئے گئے ہیں۔ ان کی تشکیل میں ملٹری انٹیلی جنس ملوث ہے۔ لیکن جنرل اسلم بیگ نے اس کی تردید کی۔ بینظیر بھٹو نے صدر سے ملاقات کر کے اپنی شکایات بیان کیں اور کہا کہ پنجاب کی سابقہ حکومت کا کوئی احتساب نہیں کیا جا رہا ہے۔

امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کی قیادت میں کئی مغربی ممالک کے سفراء نے صدر سے ملاقات کر کے کہا کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے سے محروم نہ کیا جائے اور نہ ہی اسے کسی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ 1985ء سے 1988ء تک کا دور بھی احتساب میں شامل کیا جائے۔ رابرٹ اوکلے نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے بحالی جمہوریت کے لئے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ امریکی وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے یہ بھی کہا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف بلا جواز تادیبی کارروائی کا امریکہ ساتھ نہیں دے گا۔

اپنی برطرفی کے بعد پہلی مرتبہ لاہور آمد کے موقع پر بینظیر بھٹو نے کہا چوروں کو چور دروازے سے اقتدار میں لایا گیا ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر کو میرے خلاف استعمال کرنے کے لئے وفاقی کابینہ میں شامل کیا گیا ہے۔ لاہور ہائی کورٹ اور سندھ ہائی کورٹ نے صدر مملکت کے 6 اگست کے حکم کو درست قرار دے دیا۔ لیکن پشاور ہائی کورٹ نے سرحد اسمبلی توڑنے کے حکم کو کالعدم قرار دے کر صوبائی کابینہ کو بحال کر دیا۔ سپریم کورٹ نے ایک حکم امتناعی کے ذریعہ اس پر عملدرآمد روک دیا۔ نگران حکومت نے بینظیر حکومت پر کرپشن کے سنگین الزامات عائد کئے۔

سنگین الزامات لگانے کے باوجود حکومت نے احتسابی عمل میں سست روی اور اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔ قومی اسمبلی کی تحلیل کے ایک ماہ بعد صدر نے کرپشن کے الزامات میں تین سابق وزراء کے خلاف ریفرنس دائر کئے۔ 10 ستمبر کو بینظیر بھٹو کے خلاف دو ریفرنس داخل کئے گئے جو بالکل بے جان تھے۔ سیاسی تجزیہ نگاروں نے کہا کہ احتساب کا ایسا ناقص عمل بینظیر بھٹو کو شہید کا درجہ دلا دے گا۔ بینظیر بھٹو نے خود خصوصی عدالت کے سامنے پیش ہو کر کہا کہ مقدمات کے باعث ان کی انتخابی مہم متاثر ہو رہی ہے۔ صحافیوں نے صدر سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ابھی تک وہ سابقہ حکومت کی کرپشن کا کوئی ایک ثبوت بھی پیش نہیں کر سکے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ قتل کے 80 فیصد کیسوں میں بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے برعکس پیپلز پارٹی نے نواز شریف کے

خلاف 100 الزامات پر مشتمل ایک چارج شیٹ جاری کردی۔

وزیر اعلیٰ جام صادق نے جی ایم سید کو رہا کر کے ان کے خلاف تمام مقدمات واپس لے لئے۔ لیکن اپنی رہائی کے موقع پر بھی جی ایم سید نے کہا کہ میں بھارت کے ساتھ وسیع اتحاد کا حامی ہوں۔ آزاد سندھ کا قیام میری اولین ترجیح ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بینظیر بھٹو نے دوسری جماعتوں کی سیاسی تائید حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کردیا۔ انہوں نے مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کر کے اشتراک عمل اور اتحاد کے بارے میں بات چیت کی پیپلز پارٹی، تحریک استقلال اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ میں ایک انتخابی اتحاد ہوگیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ایم کیو ایم کی پوزیشن بحال ہوگئی۔ الطاف حسین نے وطن واپسی کا اعلان کردیا لیکن 22 اگست 1990ء کو ایم کیو ایم کے استقبالیہ کیمپوں پر فائرنگ کر کے 31 افراد کو ہلاک اور 50 کو شدید زخمی کردیا گیا۔ حملہ آور گرفتار نہیں کئے جا سکے۔ 23 اگست کو الطاف حسین واپس آگئے۔ ان کی رہائش گاہ پھر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ وزیر اعلیٰ جام صادق، وفاقی وزیر زاہد سرفراز اور نگران وزیر اعظم جتوئی نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ لیکن یہ بات باعث تعجب تھی کہ اب بھی ایم کیو ایم کے کارکنان کی گرفتاری کا سلسلہ جاری تھا۔ کراچی کے ایک ماہنامہ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایم کیو ایم کے ناپسندیدہ افراد کی گرفتاری کی فہرست خود الطاف حسین نے جام صادق کو مہیا کی ہے۔

مسلم لیگ کے صدر جونیجو نے اپنی پارٹی کی عاملہ کے اجلاس میں کہا کہ نواز شریف ہمیں اعتماد میں لئے بغیر یکطرفہ طور پر بھی خود ہی اہم فیصلے کر لیتے ہیں۔ نگران حکومت میں شمولیت کے بارے میں بھی عاملہ سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سندھ میں ایم کیو ایم کے حق میں تمام اُمیدواروں کو دستبرداری کرانے میں بھی انہوں نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ اسلامی اتحاد کے پہلے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے نواز شریف نے اتحاد کے انتظامی ڈھانچہ کو مضبوط بنانے، دوسری جماعتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے اور ٹکٹوں کی بروقت تقسیم کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر پیپلز پارٹی آٹھویں ترمیم ختم کردیتی تو ہم سب بھی ختم ہو جاتے۔ لیکن عملاً 10 ستمبر تک ٹکٹوں کی تقسیم کے بارے میں اتحاد اور اس کی حلیف جماعتوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا گو کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ 11 ستمبر تھی۔ مسلم لیگ اور اتحاد کے حامیوں کے لئے یہ خبر انتہائی دُکھ کا باعث تھی کہ 19 ستمبر کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے

اجلاس میں نواز شریف اور جونیجو کے حامی باہم متصادم ہوگئے۔ لاٹھیوں اور ڈنڈوں کا استعمال ہوا اور بعض ناراض کارکنوں نے فائرنگ بھی کی۔

24 نومبر 1990ء کو قومی اسمبلی کے لئے ہونے والے انتخابات میں اسلامی اتحاد کو 106 اور پی ڈی اے کو 44 نشستیں ملیں۔ اتحاد کو 62 نشستوں کی برتری حاصل ہوگئی حالانکہ ووٹوں کے لحاظ سے اتحاد کے مقابلہ میں پی ڈی اے کو محض سوا لاکھ ووٹ کم ملے تھے اور 1988ء کے مقابلہ میں پیپلز پارٹی کو اس مرتبہ ڈھائی لاکھ ووٹ زیادہ ملے۔ ووٹوں کے اس تقابلی جائزہ سے ظاہر تھا کہ کم نشستیں حاصل کرنے کے باوجود پیپلز پارٹی کی عوامی حمایت میں کوئی واضح کمی نہیں ہوئی ہے۔ اسی بناء پر غالباً انتخابات کے فوراً بعد بینظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ عوام کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ انتخابات میں دھاندلی کی گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں تشکیل پانے والی حکومت غیر نمائندہ ہوگی۔ ملک ایک نئے سیاسی بحران سے دوچار ہو جائے گا۔ انہوں نے 100 نشستوں پر دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن امریکہ، کینیڈا اور دوسرے غیر ملکی مبصرین نے انتخابات کو منصفانہ قرار دیا۔

سابقہ وزیر اعظم کا تعلق صوبہ سندھ سے تھا۔ اس لئے جتوئی کے حامی چاہتے تھے کہ انہیں ملک کا نیا وزیر اعظم منتخب کیا جائے۔ لیکن انتخابی مہم میں پورے ملک میں نواز شریف ہی پیش پیش تھے اور اس منصب کے لئے وہی مناسب اُمیدوار تھے۔ اسی صورتِ حال کے پیش نظر یکم نومبر کو اسلامی اتحاد اور حلیف جماعتوں کے ایک اجلاس میں جتوئی نے خود وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے نواز شریف کا نام تجویز کردیا۔ جونیجو نے اس کی تائید کی۔ اتفاق رائے سے اسے منظور کر لیا گیا۔ ممبران نے نواز شریف کو پیپلز پارٹی کے مقابلہ میں دلیرانہ جدوجہد کرنے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے پر مبارکباد دی۔ نواز شریف نے کہا کہ ہم صاف ستھری سیاسی روایات کو فروغ دیں گے، وفاق اور صوبوں کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ ہم خیال جماعتوں کو نظرانداز نہیں کریں گے۔ اپنی اکثریت پر فخر نہیں کریں گے۔ پیپلز پارٹی کے خلاف کوئی نیا ریفرنس داخل نہیں کیا جائے گا۔ میں محصورین کی واپسی کے اعلان پر قائم ہوں۔ نواز شریف نے کہا کہ ہم ملکی وسائل پر انحصار کریں گے۔ نئے قرضے لینے کے بجائے سابقہ قرضے بھی واپس کردیں گے۔ اس موقع پر جونیجو نے کہا کہ مسلم لیگ میں یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ پارٹی اور حکومت کے عہدوں کو الگ الگ رکھا جائے۔

1990ء کی انتخابی مہم میں میاں صاحب کی قیادت میں اسلامی جمہوری اتحاد نے مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ لیکن وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو کر میاں صاحب نے اتحاد کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ پہلے کی طرح اتحاد پھر غیر متحرک اور غیر فعال ہو کر محض ایک کاغذی تنظیم کے طور پر باقی رہ گیا۔ میں نے اس وجہ سے دسمبر 1990ء میں سیکرٹری جنرل کی ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن جماعت اسلامی اتحاد میں شامل رہی۔ اتحاد کے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میاں صاحب نے بغیر کسی مشورہ کے پہلے آغا مرتضیٰ پویا اور پھر غلام مصطفیٰ جتوئی کو اتحاد سے خارج کر دیا۔ اپنی رہائش گاہ پر ایک نشست میں نواز شریف نے اپنے اس اقدام کو درست قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اتحاد میں شامل بعض دوسری جماعتیں بھی غیر مؤثر ہیں اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی باہم مل کر کام کریں۔ قاضی حسین احمد نے اتحاد کو اپنی موجودہ شکل میں برقرار رکھنے پر زور دیا۔ لیکن میاں صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اتحاد کو نظر انداز کرنے کی بناء پر اس میں شریک جماعتیں بددل ہوتی گئیں۔ مولانا سمیع الحق بطور احتجاج اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ جماعت اسلامی اور جمعیت اہل حدیث نے اتحاد سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

1992ء کے وسط تک اسلامی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔ اتحاد کی تحلیل میاں صاحب کی ایک سنگین سیاسی غلطی تھی۔ اس دوران تمام اپوزیشن جماعتیں متحد اور منظم ہو کر حکومت پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں لیکن حکومت کا دفاع صرف چند وفاقی وزراء تک محدود تھا۔ خود وفاقی کابینہ بھی یکسوئی سے محروم تھی۔ وزیر اعظم کابینہ کے اجلاسوں میں بھی کسی اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ کابینہ میں اختلاف رائے کی بناء پر انہوں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ وزیر اعظم کے مشیر اجلال حیدر زیدی بھی جلد ہی علیحدہ ہو گئے۔ سینٹ کی رُکنیت ختم ہونے کی وجہ سے صاحبزادہ یعقوب بھی کابینہ میں شامل نہیں رہے۔ ان کو سینٹ کا ٹکٹ نہیں دیا گیا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد اسلام کے بارے میں بھی میاں صاحب کے خیالات میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی۔ انہوں نے متعدد بار یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھا کہ وہ بنیاد پرست اور قدامت پسند نہیں ہیں۔ اسلامی شریعت عدالت نے جب سود کے خلاف فیصلہ صادر کیا تو حکومت نے اس کے مطابق عمل کرنے کے بجائے سپریم کورٹ میں اپیل داخل کر دی۔ جب کبھی میاں صاحب کو متوجہ کیا جاتا کہ اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں ان کی حکومت کی کارکردگی مایوس کن ہے تو وہ فرماتے کہ لوگ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، زکوٰۃ دیں اور حج کریں اسلام نافذ ہو

جائے گا۔ اگر یہی اسلامی نظام ہے تو انتخابی مہم کے دوران نواز شریف کے ان اعلانات کا مقصد کیا تھا کہ 24 اکتوبر کو اسلامی نظام کا سورج طلوع ہوگا۔

اٹھارہ سال کے طویل انتظار، جدوجہد اور آزمائشوں کے بعد نومبر 1988ء میں جماعتی بنیادوں پر ملک گیر انتخابات منعقد ہوئے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی سب سے بڑی پارٹی بن کر اُبھری۔ اسے قومی اسمبلی میں 93 نشستیں مل گئیں جبکہ اسلامی جمہوری اتحاد نے 54 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ اپنے دستوری اختیارات کے تحت صدر غلام اسحٰق خان نے بینظیر بھٹو کو ملک کا وزیر اعظم نامزد کرتے ہوئے کہا کہ وہ عوام کی پسند اور قوم کا انتخاب ہیں۔ قائد حزب اختلاف میاں نواز شریف نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ ان کی دانش مندانہ قیادت میں ملک ترقی کے نئے اُفق چھوئے گا۔ بینظیر بھٹو نے 2 دسمبر 1988ء کو اپنے عہدہ کا حلف اُٹھایا اور کہا کہ سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے کئی سمتوں میں محاذ آرائی کر کے اپنی حکومت گنوا دی تھی۔ میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ لیکن وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالتے ہی وہ خود بھی ایک عوامی رہنماء سے ناعاقبت اندیش حکمران میں تبدیل ہو گئیں۔ انہوں نے جلد ہی سینٹ، صوبائی اسمبلیوں، صدر اور فوج سے محاذ آرائی شروع کر دی، جمہوریت کا یہ نیا تجربہ بھی بہت جلد ناکامی سے دوچار ہو گیا اور قومی اسمبلی چھٹی بار اپنی مدت پوری کئے بغیر قبل از وقت توڑ دی گئی۔ 6 اگست 1990ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر غلام اسحٰق نے کہا کہ انہوں نے قومی اسمبلی توڑ دی ہے، وزیر اعظم بینظیر بھٹو اور ان کی کابینہ کو برطرف کر دیا ہے، نئے انتخابات اسی سال 24 اکتوبر کو ہوں گے اور حزب اختلاف کے لیڈر غلام مصطفیٰ جتوئی کو عبوری حکومت کا نگران وزیر اعظم مقرر کیا گیا ہے، اسی شب صدر نے اندرونِ ملک تشویش ناک صورتِ حال اور بیرونی جارحیت کے خطرہ کے پیش نظر ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان بھی کر دیا۔ صدر نے اپنے ان انتہائی اقدامات کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ حکومت عوامی اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کے دور اقتدار میں سیاسی وفاداریاں کھلی منڈی میں مویشیوں کی طرح بیچی اور خریدی گئیں۔ قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ جاری رہی۔ صوبائی حکومتوں کی آئینی خودمختاری سلب کی گئی، اعلیٰ عدالتوں کی آزادی کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے یہ فیصلہ غیر آئینی، غیر جمہوری اور غیر قانونی طریقوں کے سدباب کے لئے کیا ہے۔ انہوں نے قوم کو یقین دلایا کہ 24 اکتوبر کو ہونے والے عام انتخابات آزادانہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوں گے۔ بینظیر بھٹو اس

اقدام سے اسی طرح بے خبر تھیں جس طرح بھٹو مرحوم 4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب میں ملک میں مارشل لاء لگنے سے لاعلم تھے۔ حکومت نے اپنے احتسابی عمل کا آغاز بھی حسب توقع پیپلز پارٹی سے کیا۔

پولیس حکام نے 7 اگست کو بینظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری اور 8 سابق وزراء فیصل صالح حیات، اعتزاز احسن، امیر حیدر کاظمی، جہانگیر بدر، احسان الحق پراچہ، میر باز کھیتران، افتخار حسین گیلانی اور شاہ نواز جونیجو کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کرتے ہوئے امیگریشن حکام کو ہدایت جاری کردی کہ ان میں سے کسی شخص کو بھی ملک سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ بعض دوسرے افراد کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی نقل و حرکت سے انتظامیہ کو مطلع رکھیں۔ حالانکہ ایک دن قبل ہی 6 اگست کو نگران وزیراعظم جتوئی نے کہا تھا کہ بینظیر بھٹو اور ان کے شوہر پر بیرونِ ملک جانے پر پابندی نہیں اور نہ ہی حکومت بینظیر یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو گرفتار کرنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ وزیراعلیٰ سندھ جام صادق نے 8 اگست کو گزشتہ دو برسوں کے دوران الاٹ کئے جانے والے تمام پلاٹوں کی الاٹمنٹ منسوخ کردی۔ حکومت سندھ نے ایک حکم کے ذریعے دسمبر 1988ء کے بعد سے 120 گز سے بڑے پلاٹوں کے تمام الاٹمنٹ منسوخ کر دیئے۔ اس عرصے میں کثیرالمنزلہ عمارتوں کی تعمیر کے پاس کئے جانے والے نقشے بھی منسوخ کر دیئے گئے۔ جام صادق نے انکشاف کیا کہ پچھلے چند دنوں میں پچاس سے زائد افراد وعدہ معاف گواہ بننے کی پیشکش کر چکے ہیں۔ 9 اگست کو حکومت سندھ نے عارضی بنیاد پر کام کرنے والے 32 اسسٹنٹ کمشنروں کو فوری طور پر برطرف کردیا۔

12 اگست کو صبح سویرے کراچی پولیس نے مختلف علاقوں میں چھاپے مار کر آصف زرداری کے پانچ رفقاء بلاول ہاؤس کے سیکرٹری ایم فہیم مغل، نارکوٹک بورڈ کے ریجنل ڈائریکٹر آغا سکندر، سابق وزیراعلیٰ کے خصوصی معاون خالد مرتضیٰ درانی، ڈیوٹی فری شاپ کے ایجنٹ فوزی علی کاظمی اور پراپرٹی ڈیلر اقبال میمن کو گرفتار کر کے انہیں تیس دن کے لئے سینٹرل جیل کراچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ سابق وزراء اعظم کے معاون جاوید پاشا، ذوالفقار مرزا جمالی اور سکندر کی تلاش میں پولیس چھاپے مار رہی تھی۔ سندھ ہائی کورٹ نے آغا سکندر اور فوزی علی کاظمی کی نظربندی کو کالعدم قرار دے دیا۔ سابق رُکن قومی اسمبلی رحمت اللہ میمن کے پوتے ذوالفقار میمن اور پیپلز پارٹی مورو کے صدر ایف زرداری کو ایم پی او کے تحت گرفتار کر کے تین ماہ کے لئے سکھر جیل میں بند کر دیا

گیا۔ 13 اگست کو ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے چیئرمین ایم تالپور کو لندن جانے سے روک دیا گیا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ بغرض علاج کراچی سے لندن جا رہے تھے۔ لیکن اسی روز بیگم نصرت بھٹو کراچی سے لندن کے لئے روانہ ہوگئیں۔ لندن پہنچ کر انہوں نے کہا کہ ایک ماہ لندن میں قیام کریں گی۔ 18 اگست کو رانی پور پولیس نے سابق رُکن صوبائی اسمبلی اور پیپلز پارٹی کے رہنما فقیر امداد علی اور دیگر تین افراد کو گرفتار کرلیا۔

امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کی قیادت میں پاکستان میں متعین کئی مغربی ممالک کے سفیروں نے 16 اگست کو ایوانِ صدر میں صدر غلام اسحٰق خان سے ملاقات کر کے کہا کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے سے محروم نہ کیا جائے اور نہ ہی اسے سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا جائے۔ صدر نے سفیروں کو یقین دلایا کہ اگر ان کے خلاف کوئی کارروائی ہوگی تو وہ قانون کے مطابق ہوگی۔ 16 اگست کو کراچی میں متعین برطانوی ہائی کمشنر نے بلاول ہاؤس میں بینظیر بھٹو سے ملاقات کی۔

13 اگست کو سپریم کورٹ کی شریعت بینچ نے وفاقی شریعت عدالت کے اس فیصلے کو معطل کردیا جس میں وفاقی شریعت عدالت نے کاغذات نامزدگی کی چھان بین، زرضمانت اور انتخابی اخراجات کے گوشواروں سے متعلق عوامی نمائندگی کے قانون کی دفعات کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیا تھا۔ فاضل عدالت نے اپنی فیصلے میں کہا کہ انتخابات 24 اکتوبر کو ہو رہے ہیں اور اس موقع پر عدالت کوئی مداخلت کرنا نہیں چاہتی۔

o

20 اگست کو آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ شمس الرحمٰن کو ان کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل اسد درانی کو فوری طور پر آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کردیا گیا۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ مخدوم خاندان کے سربراہ مخدوم طالب المولیٰ اپنا علاج کرانے کے بعد لندن سے 20 اگست کو کراچی واپس پہنچے۔ سندھ کے وزیراعلیٰ جام صادق نے ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کیا۔ وزیراعلیٰ ہاؤس سے خلیق الزمان بھی جام صادق کے ہمراہ ایئرپورٹ گئے تھے۔ جام صادق نے اپنی گاڑی میں مخدوم طالب المولیٰ کو ان کی رہائش گاہ پہنچایا۔ مخدوم

خاندان ابھی تک پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے۔ جام صادق پارٹی سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ چند دونوں کے بعد جام صاحب نے ہالا جا کر بند کمرے میں طالب المولیٰ سے ملاقات کر کے سندھ کی صورتِ حال، انتخابی اُمور اور مخدوم خاندان کی نگراں حکومت میں شمولیت کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

آصف زرداری نے کہا کہ لندن میں جلاوطنی کے دوران بینظیر بھٹو جن کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے کھانا کھلاتی تھیں، وہ حق نمک اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی چھوڑ کر حکومت میں جا بیٹھے ہیں اور ہمیں چور کہہ رہے ہیں۔ جام صادق نے جواباً کہا کہ میں نے پیپلز پارٹی کے لئے خون پسینہ دیا ہے۔ میں پارٹی کا مخلص اور دیرینہ کارکن ہوں۔ لیکن مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ میں پہلے بھی پارٹی کا رکن تھا اور اب بھی ہوں لیکن اب تو ہائی جیکر پارٹی کو ہائی جیک کر رہے ہیں۔ 20 اگست کو بینظیر بھٹو نے اپنی درخواست پر آصف زرداری اور پیپی مینوالا کے ہمراہ ایوانِ صدر میں صدر غلام اسحٰق خان سے ملاقات کی جو دو گھنٹے جاری رہی۔ دوپہر کا کھانا بھی دونوں نے ایک ساتھ کھایا۔ برطرفی کے بعد یہ ان کی صدر سے پہلی ملاقات تھی۔ بینظیر بھٹو نے شکایت کی کہ احتساب کی باتیں صرف ایک پارٹی کے خلاف کی جا رہی ہیں۔ اس امتیازی سلوک نے احتسابی عمل کو مشکوک بنا دیا ہے۔ پنجاب میں آئی جے آئی کی سابقہ حکومت نے قومی وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا، جس کے ٹھوس ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں۔ لیکن وہ احتساب سے مستثنیٰ ہیں، سفیروں کو بھی ان کی ملازمتوں سے الگ کیا جا رہا ہے۔ ان اُمور سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت 24 اکتوبر کو منصفانہ انتخابات کرانے میں مخلص نہیں ہے، بینظیر بھٹو نے تجویز پیش کی کہ اسمبلی کے اسپیکروں کو نگراں وزیر اعظم اور وزرائے اعلیٰ مقرر کیا جائے۔

صدر غلام اسحٰق خان نے بینظیر بھٹو کو یقین دلایا کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے تمام اسپیکر تو خود بھی اپنی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ اس لئے ان سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ انتخابات کے معاملہ میں اپنی پارٹی سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ صدر نے انہیں یاد دلایا کہ 1988ء کے انتخابات بھی نگراں حکومتوں کے تحت ہوئے تھے لیکن وہ اس درجہ غیر جانبدار تھے کہ اس وقت کے متعدد وزراء بھی شکست کھا گئے۔ خصوصی عدالتوں کے بارے میں ان کے شبہات کے ضمن میں صدر نے انہیں بتایا کہ خصوصی عدالتیں ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہوں گی اور ان کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جا سکے گی۔ موجودہ

احتسابی قانون تو پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں 1977ء میں اس وقت کے صدر چوہدری فضل الٰہی نے نافذ کیا تھا۔ وہی قانون اس وقت نافذ ہے۔ خود آپ کی حکومت کے دوران بھی یہ قانون نافذ رہا۔ اس لئے آپ کو تو اس قانون پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ بینظیر بھٹو نے صدر سے شکایت کی کہ سرکاری ذرائع ابلاغ پر ان کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ صدر نے کہا کہ سرکاری ذرائع ابلاغ کے استعمال کے بارے میں آپ کی حکومت نے بھی کوئی بہتر ریکارڈ قائم نہیں کیا تاہم میری کوشش ہوگی کہ نگراں حکومت سیاسی خیالات اور واقعات کے کوریج میں توازن برقرار رکھے اور بدگوئی میں ملوث نہ ہو۔ بینظیر بھٹو صاحبہ انصاف کے جس معیار، انتخابات میں غیر جانبداری اور ذرائع ابلاغ کے متوازن استعمال کی جو توقع آج کر رہی ہیں، اگر انہوں نے کسی درجے میں خود انہیں اس وقت ملحوظ رکھا ہوتا جب وہ اقتدار میں تھیں تو آج قوم کو اس بحران کا اور انہیں ان شکایات کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ سیاسی قائدین اقتدار میں آنے کے بعد جمہوری اقدار کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتے ہیں لیکن اپوزیشن میں آنے پر ان کی زد خود ان پر بھی پڑتی ہے تو پھر احتجاج کرتے ہیں۔

صدر سے ملاقات کے بعد بینظیر بھٹو 21 اگست کو لاہور سے اسلام آباد پہنچیں جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انہیں ایک بڑے جلوس کی شکل میں ایئرپورٹ سے اقبال ٹاؤن لایا گیا۔ قصر بتول میں انہوں نے ورکرز کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صدر غلام اسحٰق خان کے غیر آئینی طریقے سے اسمبلی توڑنے پر ملک کے عوام کو صدمہ ہوا ہے۔ وہ ممالک جو مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت پر تیار ہو گئے تھے، انہوں نے بھی اس اقدام کی مذمت کی ہے۔ نگراں حکومتیں پیپلز پارٹی کو ہرانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ چوروں کو چور دروازے سے اقتدار میں لایا گیا ہے۔ مجھ پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے آصف زرداری کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

یکم مئی کو بینظیر بھٹو نے برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر جان میجر سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں بینظیر بھٹو نے برطانوی وزیر اعظم کو پاکستان میں حقوق انسانی کی پامالی کی تشویش ناک صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

بینظیر بھٹو نے لندن میں برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر، لیبر پارٹی کی شیڈو کابینہ کے سیکرٹری خارجہ مسٹر جیرالڈ کافمین اور دوسرے ممبران پارلیمنٹ سے بھی ملاقاتیں

کیس۔ان کے علاوہ انہوں نے انسانی حقوق کی تنظیم، کامن ویلتھ اور یورپین پارلیمانی یونینوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ ان ملاقاتوں میں بینظیر بھٹو نے بتایا کہ پیپلز پارٹی کے سینکڑوں کارکن پورے ملک میں اور بالخصوص سندھ میں جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ انہیں ڈرایا، دھمکایا اور تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ 5 مئی کو برطانیہ کے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں بینظیر بھٹو نے کہا کہ جب بھی میں سیاست سے علیحدہ ہونے کی سرکاری پیشکش مسترد کرتی ہوں تو میرے شوہر آصف زرداری کے خلاف ایک نیا مقدمہ دائر کر دیا جاتا ہے۔ میں اسمبلی میں رہوں یا نہ رہوں، جمہوریت کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھوں گی۔

غیر ملکی دورے سے واپسی پر 6 مئی کو بلاول ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ سندھ میں قانون کی حکمرانی موجود نہیں۔ یہاں ڈاکوؤں کا راج ہے۔ حکومتی مشینری ناکام ہو چکی ہے۔ اس لئے سندھ کی موجودہ حکومت کو برطرف کر کے یہاں ایک عبوری حکومت قائم کی جائے۔ چیف الیکشن کمشنر کی نامزدگی کا اختیار صدر کے پاس نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستان کو ایٹمی دھماکہ نہیں کرنا چاہئے۔ بعد میں بینظیر بھٹو نے اسلام آباد میں کہا کہ سندھ میں نہ کوئی انتظامیہ ہے اور نہ کوئی حکومت بلکہ وہاں صرف لاقانونیت ہے۔ مجھے قائد اختلاف کا کردار ادا کرنے سے روکا جارہا ہے۔ حکومت ڈرگ مافیا کے سامنے جھک چکی ہے۔

اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ سندھ میں بنگلہ دیش جیسی صورتِ حال پیدا کی جارہی ہے۔ پاکستان کو بچانے کے لئے جام صادق کا ہٹایا جانا ضروری ہے۔ صدر اسحٰق جانبدار ہیں ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ اجلال حیدر زیدی، بدر اقبال اور صدر کے خاندان والوں کے خلاف بھی ریفرنس داخل کئے جائیں ورنہ ہمارے خلاف ریفرنس واپس لئے جائیں۔ پاکستان میں متعین امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے واشنگٹن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بینظیر بھٹو کی سابقہ حکومت کے خلاف تحقیقات جاری ہیں لیکن اس سے قبل کی حکومت کی دھاندلیوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ امریکی سفیر نے صدر غلام اسحٰق خان کی جانب سے صرف بینظیر حکومت کی دھاندلیوں کے خلاف تحقیقات کے فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے کہا اس بات کا امکان ہے کہ بینظیر بھٹو کو سات سال کے لئے سیاست سے باہر کر دیا جائے۔ آصف زرداری کو بھی قتل کے کسی مقدمہ میں ملزم قرار دے کر

موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔

5 مئی کو کراچی میں جناب جسٹس (ریٹائرڈ) فخر الدین شیخ پر مشتمل خصوصی عدالت نے ملک میں متوازی ڈیوٹی فری شاپس کے قیام کے منصوبے کے لئے قواعد وضوابط کی پابندی کئے بغیر حبیب بینک سے 30 کروڑ روپے کی منظوری کے الزام میں ملوث ملزمان آصف زرداری، فوزی علی کاظمی، حبیب بینک کے سابق صدر صفدر عباس زیدی، صوبائی سربراہ یونس حبیب اور سابق وزیر مملکت برائے خزانہ احسان الحق پراچہ کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ 249 اے کے تحت بری کر دیا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اس کیس کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں حبیب بینک خود فریق نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس بینک کے تمام ایگزیکٹو افسران نے یہ کہا کہ جس منصوبے کے لئے یہ قرض دیا گیا تھا وہ قابل عمل اور نفع بخش تھا۔ اگر اس پر عملدرآمد کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو بینک کو سات یا آٹھ کروڑ روپے کا سالانہ منافع ہوتا۔

آصف زرداری نے کہا کہ عدالت سے مقدمہ میں بری ہونا میری اخلاقی فتح ہے۔ سیاسی مخالفین کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا جارہا ہے لیکن جنہوں نے کروڑوں روپے کے قرضے معاف کرائے ہیں انہیں کھلی چھٹی حاصل ہے۔ زرداری نے کہا کہ جاپانی طلبہ کی رہائی کے لئے حکومت سندھ نے خزانے سے 2 کروڑ روپے نکلوائے جن میں سے ڈاکوؤں کو صرف 50 لاکھ روپے دیئے گئے اور بقیہ رقم وزیر اعلیٰ جام صادق اور ان کے ساتھی وزراء ہڑپ کر گئے۔ جام صادق اپنی ایک بغل میں جی ایم سید کو اور دوسری بغل میں الطاف حسین کو لے کر چل رہے ہیں۔

7 مئی کو لاہور میں مسٹر جسٹس محمد امیر ملک پر مشتمل خصوصی عدالت نے بینظیر بھٹو پر سرکاری خفیہ فنڈ کے بے جا استعمال سے متعلق چارج شیٹ جاری کر دی جس کے مطابق سابق وزیر اعظم بینظیر بھٹو نے اس فنڈ سے 95 ملین روپے ایسے کاموں پر صرف کر دیئے جن کے لئے فنڈ قائم نہیں کیا گیا تھا۔ ضروری قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے تحریک عدم اعتماد کے دوران یہ فنڈ ہارس ٹریڈنگ کے لئے استعمال کیا گیا۔ بینظیر بھٹو کی عدالت میں عدم موجودگی کے باعث یہ چارج شیٹ ان کے قانونی مشیر کو سنائی گئی۔

13 مارچ کو خصوصی عدالت نے بینظیر بھٹو پر خفیہ فنڈ سے 95 ملین روپے جان بوجھ کر

غیر قانونی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے الزام میں فردِ جرم عائد کردی جس کے مطابق اس فنڈ سے 10 ملین روپے ملک وارث کو، 10 ملین آفتاب شیر پاؤ کو، 30 ملین نصیر اللہ خان بابر کو، 13 لاکھ روپے حنیف خاں کو اور 26 لاکھ روپے ناہید خان کو ادا کیے گئے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ میں ان تمام الزامات کا انکار کرتی ہوں۔

11 مئی کو خصوصی عدالت نے آصف علی زرداری، قائم علی شاہ، شاہ نواز جونیجو، امیر حیدر کاظمی اور منظور وسان پر ایم کیو ایم کے کیمپوں پر فائرنگ کے مقدمہ میں فردِ جرم عائد کرتے ہوئے کہا کہ ملزمان نے 21 اگست 1990ء کو مبینہ طور پر ایم کیو ایم کے کیمپوں پر فائرنگ کر کے شہر میں دہشت گردی کی فضاء قائم کرنے کی مجرمانہ سازش کی جس کے نتیجے میں متعدد افراد جاں بحق اور زخمی ہو گئے۔

14 مئی کو خصوصی عدالت نے آصف علی زرداری اور قائم علی شاہ پر گلستان جوہر میں 137 ایکڑ اراضی تین تعمیراتی اداروں کو سستے داموں الاٹ کر کے حکومت سندھ کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچانے کے باعث فردِ جرم عائد کردی۔

29 مئی کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جناب غوث محمد نے آصف زرداری کو کے ڈی اے کی زمین سستے داموں فروخت کرنے کے مقدمہ میں بری کردیا۔ عدالت نے اپنے حکم میں کہا کہ استغاثہ درخواست گزار کے خلاف کوئی ٹھوس شہادت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے، اس لئے درخواست گزار کو بری کیا جاتا ہے۔

فوجداری مقدمہ میں بری ہونے کے بعد سیشن کورٹ کی عمارت میں آصف زرداری نے کہا کہ میں اب تک دو مقدمات میں بری ہو چکا ہوں۔ باقی 9 مقدمات میں بھی بے گناہ ثابت ہوں گا۔

کراچی جیل سے ایک سندھ روزنامے کو تحریری انٹرویو دیتے ہوئے حیدر آباد میں 30 ستمبر 1988ء کے قتل عام کے اہم ملزم ڈاکٹر قادر مگسی نے کہا کہ جام صادق نے اپنے مفادات کی خاطر ایم کیو ایم کو مضبوط کیا ہے۔ ایم کیو ایم کا اندرونی انتشار دراصل مال جنگ کی تقسیم کا چکر ہے۔ ستمبر 1988ء کے قتل عام کے پیچھے کوئی سازش نہیں بلکہ صرف حب الوطنی اور قومی جذبہ تھا۔ میری دانست میں قومی بقاء کے لئے لڑنے والے قابل تعریف اور لائق عزت ہیں۔

7 مئی کو وزیر اعظم نواز شریف نے وفاقی وزیر اسلام نبی کی قیادت میں چوہدری شجاعت، عمران فاروق اور عبدالستار لالیکا پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کردی جو بعض عناصر کی جانب سے ایم کیو ایم کے خلاف سازش اور اس کی اعلیٰ قیادت کو جسمانی طور پر نقصان پہنچانے کے خدشات کے بارے میں تحقیقات کرے گی۔

7 مئی کو وزیر اعلیٰ سندھ جام صادق نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایم کیو ایم کے خلاف کوئی سازش برداشت نہیں کی جائے۔ ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدہ کو آخری شکل دے دی گئی ہے۔ جلد ہی اس کا اعلان کردیا جائے گا۔ پی ڈی اے سے کوئی مفاہمت ممکن نہیں ہے۔ اس کی اکثریت دہشت گردوں پر مشتمل ہے۔ یہ اگر برسر اقتدار آ گئی تو غریبوں کا خون چوس لے گی۔ میں جس کو پکڑتا ہوں اس کا تعلق پی ڈی اے سے نکلتا ہے۔ بینظیر بھٹو میرے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کرانے کا شوق بھی پورا کرلیں۔ بہتر ہوگا کہ وہ اپنی سرگرمیاں اپنے دہشت گردوں کو رہا کرانے تک محدود رکھیں۔ میں پگارا مسلم لیگ کو منظم کر رہا ہوں۔ مزید ارکان اسمبلی ''مسلمان'' ہونے کی خوشخبری لوگ جلد ہی سن لیں گے۔ وفاقی کمیٹی کے بارے میں جام صادق نے کہا کہ میں مرکزی حکومت کو صوبائی معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ وفاقی حکومت کو میرے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ البتہ وہ تحقیقاتی کے بجائے شکایتی کمیٹی کی حیثیت سے آئے گی تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔

سابق وزیر اعظم جتوئی نے بھی کہا کہ حکومت سندھ کے خلاف کسی وفاقی تحقیقاتی کمیٹی کا قیام صوبائی خودمختاری میں بے جا مداخلت ہے۔ جام صادق سندھ کے بااختیار وزیر اعلیٰ ہیں اور میں ان کے ساتھ ہوں، سندھ کے دس سالہ پرانے کینسر کو ختم کرنے کے لئے سخت اقدامات کی ضرورت ہے۔

جام صادق کی مخالفت کی وجہ سے یہ کمیٹی اپنا کام شروع نہیں کرسکی۔ اس کے علاوہ الطاف حسین کی شکایات اور اپنی جان کو خطرے کے خدشات کا تعلق بھی صوبائی حکومت یا وزیر اعلیٰ جام صادق سے نہیں بلکہ وفاقی حکومت اور ایجنسیوں سے تھا۔ 2 مئی کو سابق صوبائی وزیر پیار علی الانہ پیپلز پارٹی سے الگ ہوگئے۔ انہوں نے 1972ء میں پارٹی شمولیت اختیار کی تھی۔ مارشل لاء کے دور میں ایم آر ڈی کی تشکیل اور تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ بینظیر بھٹو کے دور میں انہیں

مختلف عہدوں کی پیشکش کی گئی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی اپنے بنیادی اُصولوں سے ہٹ گئی ہے۔ میں نے شخصی طور پر انہیں پارٹی نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ معقول مشورہ دینے والے اس کے اندر موجود رہیں۔

پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما سابق اسپیکر ملک معراج خالد نے 3 مئی کو کہا کہ اکتوبر 1990ء کے انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہیں تھے۔ فی الوقت پیپلز پارٹی میں فہم وفراست کا فقدان ہے۔ اگر اسے ہوش آجائے اور وہ عوام کو ساتھ لے کر چلے تو دوبارہ اقتدار میں آسکتی ہے۔ موجودہ حکومت نے بھی سابقہ حکومتوں کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ موجودہ حکومت ان سے دس گنا زیادہ زیادتیاں کر رہی ہے۔ حکومت کی اس روش کی وجہ سے ملک اور جمہوریت کو خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔

اختلافات کا آغاز

مرکز اور صوبوں میں اپنی حکومتوں میں قیام کے بعد مسلم لیگ کے اہم رہنما اب اسلامی اتحاد کو برقرار رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ 2 مئی کو لاہور میں مسلم لیگ کے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے محمد خان جونیجو نے کہا کہ ہمیں کسی سہارے کے بغیر متحرک ہونا چاہئے۔ وزیراعظم نواز شریف خود بھی اسی خیال کے حامی تھے کہ اب مسلم لیگ کو کسی دوسری جماعت کی حمایت کی حاجت نہیں اسے تنہا آگے بڑھنا چاہئے۔

6 مئی کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کو قاضی حسین احمد نے بتایا کہ وزیراعظم نواز شریف اب اسلامی اتحاد میں شامل کسی دوسری جماعت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ گو ہم نے ان پر بار بار واضح کیا ہے کہ انتخابات میں کامیابی اتحاد میں شامل جماعتوں کو مشترکہ کوششوں سے حاصل ہوئی ہے اور موجودہ حکومتوں کو برقرار رکھنے کے بھی اس اتحاد کا باقی رہنا ناگزیر ہے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ کو لبنان بنانے کی سازش کی جارہی ہے۔

غلام مصطفیٰ کھر کی سابقہ بیوی تہمینہ کھر کی کتاب ان دنوں گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ تہمینہ نے اپنی کتاب ''مائی فیوڈل لارڈ'' میں انکشاف کیا کہ مجھے پہلی مرتبہ 1990ء میں کھر کے بھارت کے ساتھ روابط کا علم ہوا۔ کھر کے بھارتی انٹیلی جنس کے ایک اعلیٰ افسر جوشی کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ جوشی بعد میں بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کے سربراہ مقرر ہو گئے۔ میری بہن زرینہ کی شادی کے موقع پر کھر بھارت گئے تھے جہاں انہوں نے اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ کھر نے بھارت کے ساتھ مل کر جنرل ضیاء کے خلاف فوجی بغاوت کا منصوبہ تیار کیا جس میں یہ طے پایا تھا کہ کامیاب بغاوت کے بعد پیپلز پارٹی کے لیڈر کو وزیراعظم بنایا جائے گا اور نئی وفاقی حکومت میں کھر نمبر 2 ہوں گے۔ لیکن بروقت علم ہو جانے کی وجہ سے یہ بغاوت کچل دی گئی۔

تہمینہ کھر کے ان سنسنی خیز انکشافات کا کسی سطح پر بھی سنجیدگی کے ساتھ کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔

پی ٹی اے کی شکایات کی تحقیقات کے لئے جن میں اکثر کا تعلق صوبہ سندھ کی حکومت سے تھا مرکزی حکومت نے اپریل کے اوائل میں ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی نے کراچی میں 10 مئی کو وزیر اعلیٰ سندھ جام صادق سے ملاقات کی، جام صادق نے ممبران کمیٹی سے کہا کہ اگر آپ لوگ یہاں کوئی تحقیقات کرنے آئے ہیں تو میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ سندھ کے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت اور اس کی خودمختاری کے منافی ہے۔ ہمارے کردار کے بارے میں کوئی تحقیقات سندھ کی صوبائی اسمبلی یا سندھ کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر آپ کو حکومت سندھ یا میری ذات سے متعلق کوئی شکایات ہوں تو میں انہیں سننے اور ان کے سدباب کے لئے اقدامات کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اسلامی اتحاد کے رکن کمیٹی الٰہی بخش سومرو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم شکایات کے ازالے کے لئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ اس کے بعد پی ڈی اے کے ممبران کمیٹی افتخار گیلانی، اعتزاز احسن اور خورشید شاہ نے اپنی شکایات بیان کیں۔ یہ بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ وزیر اعلیٰ جام صادق کی معاونت صوبائی وزیر مظفر حسین شاہ، صبغت اللہ راشدی اور ان کے مشیر عرفان مروت نے کی۔ ایم کیو ایم سے متعلق کوئی وزیر یا ممبر اسمبلی ان مذاکرات میں موجود نہیں تھا۔

o

خلیج کے اخبارات میں بھارتی خبر ایجنسی کے حوالے سے بینظیر بھٹو کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں انہوں نے الزام لگایا کہ حکومت میرے سسر حاکم علی زرداری پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ مجھے اپنے بیٹے آصف زرداری سے طلاق دلوادیں ورنہ انہیں سخت نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے دونوں بچے چھوٹے ہیں۔ وہ اپنے بابا کو مانگتے ہیں اور میں ماں کی حیثیت سے اپنے آپ کو شدید مشکلات میں پاتی ہوں۔ بینظیر بھٹو نے شکایت کی کہ میرے شوہر کو جیل میں ٹیلی ویژن تک نہیں دیا گیا ہے۔ انہیں کوکا کولا کے ٹھنڈے ٹن اور برف فراہم کرنے سے بھی انکار کر دیا جاتا ہے۔ اگر بینظیر بھٹو اس انسانیت سوز سلوک سے آگاہ ہوتیں جو پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ تو وہ یہ شکایت نہ کرتیں کہ ان کے شوہر کو جیل میں فائیو اسٹار

ہوٹلوں جیسی مراعات حاصل نہیں ہیں۔

نواب زادہ نصر اللہ خان نے 7 جون کو کہا کہ اس وقت ملک کو شدید اندرونی اور بیرونی مسائل کا سامنا ہے۔ موجودہ نااہل حکومت ان پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ عوام غیر یقینی کا شکار ہو کر شدید پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ملک کو اس بحران سے نکالنے کے لئے قومی حکومت کی تشکیل ناگزیر ہے۔ بینظیر بھٹو نے 8 جون کو سول اسپتال کراچی میں پیپلز پارٹی کے دو قیدی رہنماؤں آفاق احمد شاہد اور شاہ نواز جونیجو سے ملاقات کی۔ وہ کافی دیر تک ان کے ساتھ رہیں۔ حکومت سندھ نے عدالت کی اجازت کے بغیر اس ملاقات کا نوٹس لیتے ہوئے دونوں قیدیوں کے کمروں سے باہر تعینات ایک سب انسپکٹر سمیت گیارہ پولیس اہلکاروں کو 9 جون کو ان کی ملازمتوں سے معطل کر کے انہیں گرفتار کر لیا۔ 10 جون کو بینظیر بھٹو نے اسلام آباد میں نواب زادہ نصر اللہ خان سے ایک طویل ملاقات کر کے ملک کی سیاسی صورتِ حال پر تبادلہ خیال کیا۔ بعد میں بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب حکومت کے ساتھ مذاکرات کی بجائے جدوجہد کا طریقہ اپنایا جائے گا۔ ہمیں اسمبلیوں کے اندر اپنا کردار ادا کرنے سے روکا گیا تو پھر ہم عوام سے رجوع کرنے کے لئے جلسے اور جلسوں کا طریقہ اختیار کریں گے۔ ملک میں تخریب کاری کے مختلف واقعات حکومت کی نااہلی اور غفلت کا نتیجہ ہیں۔ ہم نے جن ڈاکوؤں کو اپنے دورِ حکومت میں گرفتار کیا تھا۔ اب حکومت انہیں رہا کر کے ان سے مختلف کام لے رہی ہے۔ ہمیں ایک سرکاری ایجنسی نے جام صادق کے خلاف رپورٹ دی لیکن پھر بھی ہم سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ ہم انہیں وزیر داخلہ بنا دیں۔ حکومت ہمارے ٹیلی فون ٹیپ کر رہی ہے۔ جو ہم سے ملنے آتا ہے لوگ اس کے پیچھے لگا دیئے جاتے ہیں۔ شہروں میں ایم کیو ایم کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اس سے سمجھوتہ کیا لیکن اسے سبوتاژ کر دیا گیا۔

11 جون کو جام صادق نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر نواز شریف محترمہ کو وزیر خارجہ بنا دیں تو تمام چک چک ختم ہو جائے۔ ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں کہ تخریب کاری، دہشت گردی اور نہروں میں شگاف ڈالنے کے واقعات میں پیپلز پارٹی ملوث ہے۔ حال ہی میں بھارت میں تربیت حاصل کر کے کھوکھرا کے راستے پاکستان واپس آنے والے الذوالفقار کے چھ دہشت گردوں نے گرفتاری کے بعد تفتیش کے دوران انکشاف کیا کہ انہیں صدر غلام اسحٰق خان، وزیر اعظم نواز شریف اور مجھے ہلاک کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ انہوں نے بیگم بھٹو، قائم علی شاہ اور دیگر افراد کے ملوث ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ بینظیر بھٹو نے خود بھی ''را''

کے چیف سے ملاقات کی تھی۔ میری حکومت کو ناکام بنانے کے لئے پیپلز پارٹی کے ممبران اسمبلی اغواء اور ڈکیتیوں کی وارداتیں کرا رہے ہیں۔ یہ ڈاکوؤں کو پیغام بھیج رہے ہیں کہ اغواء کئے جانے والوں کو حکومت کے حوالے نہ کیا جائے۔ پیپلز پارٹی وطن دشمن ہے اور آصف زرداری ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ لگتے ہیں لیکن اس کے باوجود پیپلز پارٹی پر پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

13 جون کو پاکستان میں متعین فرانس کے سفیر نے اسلام آباد میں بینظیر بھٹو کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا۔ لاڑکانہ میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ حکومت نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔

14 جون کو نوابزادہ نصر اللہ خان نے ایک کل جماعتی کانفرنس بلانے کا اعلان کر دیا۔ نوابزادہ نے کہا کہ امریکہ کسی صورت میں ہمیں امداد نہیں دے گا لیکن حکومت امریکی دباؤ میں آکر مہنگائی میں اضافہ کر رہی ہے۔ میاں زاہد سرفراز نے بھی کہا کہ حکومت امریکی عہدہ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ حکومت نج کاری کے موجودہ عمل کے ذریعے مزدوروں اور غریب طبقات کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر ان کا معاشی قتل کر رہی ہے۔ ملک میں جنگل کا قانون نافذ ہے۔ سندھ میں ڈاکوؤں کا راج ہے۔ آج بھی 90 فیصد عوام ہمارے ساتھ ہیں، جمہوریت کی بحالی کے لئے ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

جسٹس امیر ملک پر مشتمل خصوصی عدالت میں بینظیر بھٹو نے ایک آئینی درخواست دائر کی جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ دسمبر 1988ء میں صدر غلام اسحٰق خان کا صدارت کے عہدہ پر انتخاب صدر ضیاء الحق مرحوم کی بقیہ مدت تک کے لئے ہوا تھا جو 20 مارچ 1990ء کو ختم ہوگئی۔ لیکن عدالت نے ان کا یہ مؤقف تسلیم نہیں کیا اور ان کی آئینی درخواست مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ آئین کے مطابق صدر غلام اسحٰق خان کا انتخاب پانچ سال کے لئے ہوا تھا۔

ایک روزنامہ کو انٹرویو دیتے ہوئے چوہدری شجاعت نے کہا کہ غلام اسحٰق خان کی حمایت کے بارے میں اسلامی جمہوری اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا تھا جس کے بعد بینظیر بھٹو غلام اسحٰق خان کی مخالفت نہیں کر سکتیں۔ لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس ملک اختر حسن پر مشتمل خصوصی عدالت نے پیپلز پارٹی کے شیخوپورہ سے قومی اسمبلی کے سابق رکن رائے رشید احمد خان بھٹی کو سات سال کے لئے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلی کے رکن ہونے کا نااہل قرار دے دیا۔ ایک صدارتی ریفرنس میں ان پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ ان کی اہلیہ شمشاد بیگم نے

زرعی ترقیاتی بینک سے 1977ء میں 75 ہزار روپے کا قرض لیا تھا۔ یہ قرض تو انہوں نے ادا کر دیا لیکن اس پر 2 لاکھ 28 ہزار روپے کا سود 1989ء میں معاف کرا لیا۔ بینک کی جس خصوصی کمیٹی نے یہ سود معاف کیا، رائے بھٹی بھی اس کے رکن تھے۔ ضابطے کے مطابق انہیں اس اجلاس میں شرکت نہیں کرنا چاہئے تھی جس میں سود معاف کرنے کا یہ معاملہ زیر غور آتا تھا۔ لیکن اس اجلاس میں شرکت کر کے وہ بے ضابطگی کے مرتکب ہوئے، اس لئے ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ خصوصی عدالت نے اس الزام کو درست تسلیم کرتے ہوئے اپنا فیصلہ جاری کر دیا۔

2 ستمبر کو فیروز والہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ حکومت وادی کشمیر کو بھارت کے حوالے کر رہی ہے۔ متاثرین پکا قلعہ کے نام پر ایم کیو ایم کو مالی رشوت دی گئی ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا مہاجرین کا خون دوسروں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کا ہے۔ حکومت نے آصف زرداری کو قتل کرنے کی سازش تیار کر لی ہے۔ انہیں جیل سے عدالت لاتے یا واپس پہنچاتے وقت قتل کرا دیا جائے گا۔ اگر اس سازش کو روکا نہیں گیا تو میں صدر اور ان کے داماد کے خلاف قتل اور وزیراعظم اور اسپیکر قومی اسمبلی کے خلاف اعانت قتل کا مقدمہ درج کراؤں گی۔ جام صادق نے کہا کہ بینظیر بھٹو کے الزام کی تحقیقات کے لئے سندھ ہائی کورٹ کے جج پر مشتمل انکوائری ٹربیونل تشکیل دے دیا گیا ہے۔ حکومت سندھ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ آصف زرداری کے مقدمات کی سماعت جیل کے اندر ہوا کرے گی۔ جام صادق نے کہا کہ بینظیر بھٹو اپنے شوہر کو قتل کرا کے اس کا الزام میرے سر تھوپنا چاہتی ہیں۔ وفاقی وزیر شیخ رشید نے کہا کہ آصف زرداری کے قتل کا اندیشہ خود بینظیر بھٹو کی اپنی سوچ ہے۔ بھارت کے ایک پندرہ روزہ میگزین ''انڈیا ٹوڈے'' کو انٹرویو دیتے ہوئے بینظیر بھٹو نے 3 ستمبر کو کہا کہ توہین عدالت کے قوانین کی وجہ سے میں آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے برسراقتدار آتے ہی صدر غلام اسحٰق خان نے ہماری حکومت کے خلاف سازشوں کا آغاز کر دیا تھا۔ مجھ پر بے بنیاد الزامات لگا کر مجھے اقتدار سے ہٹانے کی سازش کی گئی۔ سارک کانفرنس کے دوران میرے اور راجیو گاندھی کے درمیان ہونے والی بات چیت ٹیپ کی گئی۔ کراچی دہشت گردوں کا شہر بنا دیا گیا ہے جس پر الطاف حسین کو کنٹرول حاصل ہے جو شیخ مجیب الرحمٰن سے بڑھ کر خطرناک ثابت ہوں گے۔ ان حالات میں کراچی اب زیادہ دیر تک پاکستان کا حصہ نہیں رہ سکے گا۔ موجودہ حکومت اپنی پوری مدت تک برسراقتدار نہیں رہ سکے گی۔

4 ستمبر کو اسلام آباد ائیر پورٹ پر صحافیوں سے بات کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ صدر مملکت، وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور جنرل ضیاء الحق مرحوم پر مشتمل ملک کے چار بڑے خاندانوں نے بی سی سی آئی سمیت دوسرے بینکوں اور مالی اداروں سے بغیر کسی ضمانت کے ایک سو بلین روپے کے بھاری قرضے حاصل کئے ہیں۔ اسلامی اتحاد کے رہنما ملک کے سب سے بڑے مالی فراڈ میں ملوث ہیں۔ اتحاد کی حکومت کے چوٹی کے دو رہنماؤں کے خاندانوں کو نیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن سے ایک ہی دن میں 300 ملین روپے کے قرضے دیئے گئے۔ اس کی وجہ سے بنکاری کا پورا نظام تباہ ہوگیا۔ میرے دور حکومت میں بھی موجودہ حکمران قرضے مانگنے آئے تھے لیکن میں نے انہیں مایوس کر کے واپس کر دیا۔ بینظیر بھٹو نے مطالبہ کیا کہ قرضے حاصل کرنے والے سیاسی رہنماؤں کی فہرست جاری کی جائے۔ غریبوں کے پیسے واپس دلانے کے لئے میں ان لٹیروں کی ملیں بکوادوں گی۔ حکمران ٹولے نے بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا افراد کو ان کی عمر بھر کی پونجی سے محروم کر دیا۔ انہوں نے حکومت کو نوٹس دیا کہ ایک مہینے کے اندر کوآپریٹو سوسائٹیز کے غریب کھاتہ داروں کی رقوم واپس کر دی جائیں۔

وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ پیپلز پارٹی کی سابقہ حکومت کے غلط فیصلوں کے نتائج ہمیں بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ اس پارٹی نے اپنے دور اقتدار میں 59 کوآپریٹو ادارے قائم کرنے کی اجازت دی جو لوٹ کھسوٹ میں شامل ہیں۔ سابقہ وزیر احسان پراچہ نے اسٹیٹ بینک کو ان اداروں کے نام نوٹس جاری کرنے سے روک دیا تھا۔ ہم ان کوآپریٹو اداروں کے مالکان کی جائیدادیں اور زیورات فروخت کر کے کھاتہ داروں کی ایک ایک پائی نیک نیتی کے ساتھ واپس دلائیں گے۔ وفاقی وزیر چوہدری شجاعت نے کہا کہ فنانس اور کوآپریٹو اداروں کی تباہی کی ذمہ داری پیپلز پارٹی پر عائد ہوتی ہے۔ ہم سب کو بے نقاب کریں گے۔ اتفاق گروپ کے جنرل مینجر نے کہا کہ جو قرضے ہم نے لئے تھے، ان کی پائی پائی ادا کر دی ہے۔ بینظیر بھٹو نے خود بیرون ملک جو کروڑوں ڈالر جمع کئے ہوئے ہیں، وہ پاکستان واپس لائیں۔

سندھ اسمبلی کے اسپیکر رازق خاں نے پی ڈی اے کے ارکان منظور پنہور، حنیف سولجر، خاں محمد ڈاہری، امیر بخش، میر حسین کھوسو اور گل محمد میمن کو سرکاری بنچوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ سپیکر نے کہا کہ یہ فلور کراسنگ نہیں ہے بلکہ ان ممبران کا تعلق اب بھی پیپلز پارٹی سے ہے لیکن یہ ممبران حکومت کے اچھے اقدامات کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ایک

رکن حاجی خاں چاچڑ پہلے ہی سے سرکاری بنچوں پر بیٹھ رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے ایک رکن قومی اسمبلی کھٹول نے بھی جام صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد ان کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا میں نے جام صادق کی حمایت کا فیصلہ اس لئے کیا ہے کیونکہ ان کی پالیسیاں ملک اور صوبے کے مفاد میں ہیں۔

o

کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مولانا فضل الرحمٰن نے کہا کہ ہم نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب ہم حکومت کی حمایت کرنے کے بجائے اپوزیشن میں ہیں۔ اسمبلیاں جعلی ہیں اور پارلیمنٹ ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ اسلامی اتحاد کی انتہائی مہم کے انچارج نوید ملک نے خود اعتراف کر لیا ہے کہ اکتوبر 1990ء کے انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی۔ نوید ملک نے مجھ سے اس بات پر معافی مانگی کہ مجھے دھاندلی کے ذریعے ہرایا گیا۔ اس کے باوجود صدر اور چیف الیکشن کمشنر دونوں اس دھاندلی پر خاموش ہیں۔ حکومت کی کوئی پالیسی بھی مؤثر نہیں۔ حکمران اپنے وعدے فراموش کر چکے ہیں۔ حکومت کو ابھی تک وزیر خارجہ بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ اسلام کا نام اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ موجودہ اسمبلیاں توڑ کر ایک عبوری حکومت کے تحت نئے انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ حکومت خود فرقہ وارانہ فسادات کرانے کی سازش کر رہی ہے۔ اس لئے اب ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔

کراچی میں ''میٹ دی پریس'' سے خطاب کرتے ہوئے نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ سندھ میں لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ یہاں ڈاکوؤں کی متوازی حکومت قائم ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ میں ابھی تک جام صادق سے بچا ہوا ہوں۔ پاکستان کی سالمیت کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ ان حالات میں موجودہ حکومت کا مزید برسر اقتدار رہنا ملک کے لئے نقصان دہ ہے۔ سندھ کے بعد اب پنجاب میں بھی صورت حال سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ نواز شریف جو وعدے بھی کرتے ہیں انہیں پورا نہیں کرتے۔ حکومت مسئلہ کشمیر پر بھی کوتاہی برت رہی ہے۔ نارووال ڈسکہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا سمیع الحق نے کہا کہ اسلامی اتحاد کا مقصد محض اقتدار کی کرسی تک پہنچنا نہیں بلکہ اسلامی نظام کا نفاذ اور بدی کی قوتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ لیکن اب حکومت شریعت

کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ حکومت اتحاد کے بنیادی مقاصد سے انحراف کر رہی ہے۔ شریک جماعتوں کو اعتماد میں لئے بغیر اہم پالیسیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اتحاد کا ٹوٹنا ایک قومی المیہ ہوگا لیکن ایسا ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد ہوگی۔

7 ستمبر کو بینظیر بھٹو اپنے مختصر بیرونی دورے کے بعد کراچی واپس پہنچ گئیں۔ انہوں نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں جنگل کا قانون نافذ ہے۔ لوگ دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ ہر طرف انارکی کا دور دورہ ہے۔ موجودہ حکومت دھاندلی کے ذریعے اقتدار میں آئی ہے۔ تمام خرابیوں کے باوجود اس نے ''سب کچھ ٹھیک ہے'' کی رٹ لگا رکھی ہے۔

حکومت اور اپوزیشن کے درمیان محاذ آرائی میں شدت کے ساتھ پورے ملک میں تخریب کاری اور بدامنی کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ قاتل، ڈاکو اور تخریب کار پھانسیوں پر لٹکنے کے بجائے وارداتیں کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہوتے رہے۔ ستمبر کے ابتداء ہی میں چمن اسٹیشن پر ٹرین کی ایک بوگی میں بم دھماکے سے 9 افراد موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ دو افراد کے سرتن سے جدا ہو گئے۔ 34 مسافر زخمی ہوئے۔ کراچی ایئر پورٹ سے نزدیک ایک گوٹھ میں رات کے ایک بجے روسی ساخت کے جدید ہینڈ گرنیڈ کے پھٹنے سے دو افراد ہلاک ہو گئے جن کے جسموں کے ٹکڑے دور دور تک پھیل گئے، چار لوگ زخمی ہوئے۔ ستمبر کے وسط میں ملتان میں صبح سویرے بموں کے دھماکوں سے دو افراد جاں بحق اور 13 زخمی ہو گئے۔ گلشن اقبال اور نیو ٹاؤن کراچی کے علاقوں میں مسلح دہشت گردوں نے ٹیلی ویژن اسٹیشن کی عمارت پر بموں سے حملہ کیا اور ٹریفک پولیس کی چوکی پر فائرنگ کی۔

8 اکتوبر کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ کراچی میں تشدد کی کارروائیوں کا مقصد پورے صوبے کو مفلوج بنانا ہے۔ کچھ لوگ مجیب الرحمٰن سے زیادہ خطرناک کردار کے ادا کر رہے ہیں۔ اس وقت ملک سنگین صورت حال سے دوچار ہے۔ حکومت نے اسے تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے، قومی معیشت تباہ ہو چکی ہے، وزیر اعظم نواز شریف نے پی ڈی اے سے معاہدہ کیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا ملک پر سسر داماد کا راج ہے۔ نواز شریف بھی صدر کے چہیتے ہیں۔ اگر نواز شریف مجھ سے ملنا بھی چاہیں گے تو میں ان سے ملاقات نہیں کروں گی۔ اس وقت قومی اتفاق رائے سے نگراں عبوری حکومت کے قیام کی

ضرورت ہے۔ سندھ کے عوام کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ پورا صوبہ ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ میں نواز شریف کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اسے ٹیلی ویژن پر براہ راست دکھایا جائے۔ میں حکومت کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کروں گی۔ اگر میں غلام اسحٰق اور چوہدری خاندان کو ملک لوٹنے کی اجازت دے دیتی تو آج میں اقتدار میں ہوتی۔ پی ڈی اے نے فیصلہ کیا ہے کہ عوام کے حقوق اور جمہوریت کی بحالی کے لئے 24 اکتوبر سے حکومت کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

پشاور بار سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ سیاست دان عوام کی قیمت پر بزنس مین بن رہا ہے۔ موجودہ حکومت نے عدلیہ کو بھی سخت نقصان پہنچایا ہے۔ سندھ علیحدگی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ہم خونی گڑھے میں گر چکے ہیں۔

o

بدین، مٹھی اور سندھی کے دوسرے مقامات پر تقاریر کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے کہا کہ اس وقت صوبائی حکومت میں سندھ کی کوئی نمائندگی نہیں ہے، وزیر اعلیٰ اور گورنر دونوں میں سے کوئی بھی سندھی نہیں، شریفوں کی حکومت غیر شریفانہ بن چکی ہے۔ کئی پیر لندن گئے ہوئے ہیں۔ دیکھیں اب کون سا پلان بنتا ہے۔ لیکن ظلم کی زنجیریں ٹوٹنے کا وقت اب قریب آ گیا ہے۔ وزیر اعظم نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی اس مہم کو خطرناک اور ملک کے لئے تباہ کن قرار دیا۔ ہم اپوزیشن کے ساتھ مفاہمت چاہتے ہیں۔ لیکن اگر پیپلز پارٹی سڑکوں پر نکل آئے تو پھر بات چیت کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ الطاف حسین نے لندن سے بیان دیتے ہوئے کہا کہ بینظیر بھٹو سندھ کارڈ استعمال کر کے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنا چاہتی ہیں۔ وہ تعصبات کو فروغ دے رہی ہیں۔ وہ بتائیں کہ کیا ان کی زمینوں پر کام کرنے والے غریب ہاریوں کو تعلیم اور صحت کی معمولی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ مرزا اسلم بیگ نے اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی بحران کے حل کے لئے ملک میں وسیع البنیاد حکومت قائم کی جائے۔ اصلاح کا یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل گیا تو معاملات مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔ موجودہ بحران پیدا کرنے میں حکومت اور اپوزیشن دونوں حصہ دار ہیں۔ جتوئی نے کہا کہ قوم نے کئی حلیف جماعتوں پر مشتمل اتحاد پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کر کے اسے بھاری مینڈیٹ دیا تھا۔ لیکن حکومت اتحاد کو نظر انداز کر کے یک جماعتی اقتدار

قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ ممبران اسمبلی کی ہمدردیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ حکمران خود اسلامی اتحاد کو باقی رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وزیراعظم کے اقدامات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ان کی دانست میں اب انہیں آئی جے آئی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود اتحاد چھوڑنے کا الزام ہم اپنے سر لینا نہیں چاہتے۔

مولانا سمیع الحق نے کہا کہ اسلامی اتحاد کی حکومت نے اپنے وعدے پورے نہیں کئے۔ حکومت پر مفاد پرستوں کا تسلط ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے وزارتیں قبول نہیں کیں۔ اتحاد کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ شریک جماعتیں اس سے نالاں ہیں، حکومت نے نفاذ اسلام کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ حکومت پر مفاد پرستوں کا تسلط ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے وزارتیں قبول نہیں کیں۔ اتحاد کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ شریک جماعتیں اس سے نالاں ہیں۔ حکمرانوں نے اسلامی نظام نافذ کرنے کا اپنا وعدہ پورا نہیں کیا، میں نے اس بارے میں مطالبہ کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ بدی کی قوتیں میرے پیچھے پڑ گئیں، حکومت نے اپنے قیام سے لے کر اب تک اہم تین معاملات میں بھی ہمیں کسی مشورے میں شریک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اور جماعت اسلامی عملاً اتحاد سے باہر ہیں۔ مولانا سمیع الحق نے اتحاد کی نائب صدارت سے مستعفی ہوتے ہوئے کہا کہ یہ عہدہ اب میرے لئے کلنک کا ٹیکہ بنا ہوا ہے۔ میں اس بے مصرف بوجھ کو مزید نہیں اُٹھا سکتا البتہ اسلامی اتحاد میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ میری جماعت کی جنرل کونسل کرے گی۔

نواب زادہ نصراللہ خان نے ایوان صدر سے رابطہ کر کے صدر غلام اسحٰق خان سے ملاقات کے لئے دو روز کے اندر وقت مانگا تاکہ ان کی قیادت میں سیاسی رہنماؤں کا ایک وفد انہیں یہ مشورہ دے کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن صدر کے سیکرٹری نے انہیں بتایا کہ صدر چار دن تک مصروف ہیں اس لئے اس دوران وقت نہیں دے سکتے۔ اس پر نواب زادہ نے کہا کہ اب ہمیں از سر نو غور کرنا پڑے گا کہ ہمیں صدر سے ملنا بھی چاہئے یا نہیں بعد میں طے کیا گیا کہ پی ڈی اے کا کوئی نمائندہ صدر سے ملاقات نہیں کرے گا۔ پیپلز پارٹی کے سینیٹر یحییٰ بختیار نے کہا کہ گو میں بھی نواز شریف حکومت کو ختم کرنے کے حق میں ہوں لیکن اس مقصد کے لئے میں کسی غیر آئینی اور غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ صدر کو معاملات اپنے حالات میں لے کر نواز حکومت کو ختم کرنے کا مشورہ

دینا ایک غیر قانونی تجویز ہے۔ میاں نواز شریف نے کہا کہ مجھے اپوزیشن نے نہیں بلکہ قوم نے وزیراعظم بنایا ہے۔ میرے استعفے کا فیصلہ بلا جواز ہے۔ اپوزیشن کی پالیسی تخریب کاری، دہشت گردی اور بلیک میلنگ پر مبنی ہے۔ ہم مار کٹائی اور لڑائی کی سیاست نہیں چاہتے۔ ہم تو شروع ہی سے تلخی کے خاتمے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اپوزیشن معاملات کو محاذ آرائی کی طرف لے جا رہی ہے۔ ہم سندھ کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہاں ڈاکوؤں کا صفایا کیا جارہا ہے۔ جام صادق صحت یابی کے بعد جلد واپس آرہے ہیں۔ وہ پھر اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن انجام دیں گے۔

پانچ نومبر کو پاکستان کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے وائس آف امریکہ نے کہا کہ اس وقت وزیراعظم نواز شریف اور قائد حزب اختلاف محترمہ بینظیر بھٹو کے درمیان اقتدار کی زبردست کشمکش جاری ہے، اپوزیشن کی جانب سے وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں پر بدعنوانیوں کے سنگین الزامات عائد کئے جارہے ہیں۔ جبکہ حکومت اسے سیاسی کیچڑ اُچھالنے کی کوشش قرار دے رہی ہے۔ اکثریت رکھنے کے باوجود وزیراعظم کے ساتھی ان سے بدظن ہو رہے ہیں۔ اور ان کے حامیوں کی تعداد میں کمی آتی جارہی ہے۔

سندھ میں فوجی آپریشن کیوں ہوا؟

19 مئی کو جی ایچ کیو راولپنڈی میں سندھ میں امن و امان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس وزیر اعظم نواز شریف کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں سندھ کے وزیر اعلیٰ مظفر شاہ، وزیر داخلہ چوہدری شجاعت، بری فوج کے سربراہ آصف نواز، سندھ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد نصیر اختر اور دیگر حساس اداروں کے سربراہوں نے شرکت کی۔ جنرل نصیر اختر نے صوبے کی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے جرائم کی بیخ کنی کے لئے مصلحتوں سے بالاتر ہو کر بھرپور اور مؤثر کارروائی کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس اجلاس میں امن و امان کی بحالی کے لئے رینجرز اور مہران فورسز کے ذریعہ آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا جسے فوج کی مکمل پشت پناہی حاصل ہوگی۔ اجلاس کے بعد وفاقی وزیر الٰہی بخش سومرو نے کہا کہ حکومت سندھ نے بدامنی اور دہشت گردی کی سرکوبی کے لئے فوجی اور نیم فوجی اداروں کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سندھ کا مسئلہ فوج کی مدد کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ آپریشن کا یہ فیصلہ پاکستان کو بچانے کے لئے کیا گیا ہے۔ یہ کسی سیاسی شخصیت یا جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اس وقت بھارت سندھ میں مداخلت کر رہا ہے۔

20 مئی کو وزیر اعظم نواز شریف نے سندھ میں فوجی آپریشن شروع کرنے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس کارروائی کے لئے مہران فورس کو تعینات کر دیا گیا۔ ڈاکوؤں، دہشت گردوں اور اغواء کرنے والے مجرموں کا صفایا کر دیا جائے گا۔ سندھ کے موجودہ حالات میں فوری مؤثر کارروائی ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس وقت سندھ میں ملک دشمن اور غیر ملکی عناصر دونوں کارفرما ہیں۔ یہ آپریشن مقصد پورا ہونے تک جاری رہے گا۔

صدر غلام اسحٰق خان نے کہا کہ یہ آپریشن قانون کی دھجیاں اڑانے والوں کے خلاف ہے۔ یہ آپریشن بلاامتیاز ہوگا۔ سول آرمڈ فورسز امن و امان کی بحالی کے لئے بلائی گئی ہیں۔ وہ

سندھ میں جلد ہی اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیں گی۔ وزیر اعلیٰ سندھ مظفر شاہ نے کہا کہ سندھ میں امن و امان کی بحالی کے لئے رینجرز اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ فوج کو آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ اس آپریشن سے سندھ کے عوام کو اطمینان حاصل ہوا ہے۔ فوج جلد ہی اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے مقاصد حاصل کرے ورنہ اس کے منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ سردار عطاء اللہ مینگل نے کہا کہ اگر فوجی آپریشن نیک نیتی کے ساتھ ہو تو اس سے بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ سندھ میں فوج کا استعمال اسے متنازع بنا دے گا۔

بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ سندھ کے مسئلہ کا فوجی حل ملکی سالمیت کے لئے سنگین خطرہ ہے۔ بے نظیر بھٹو نے کہا قومی اسمبلی کو اعتماد میں لئے بغیر یہ کارروائی تشویشناک ہے۔ 20 مئی کو لندن سے ٹیلی فون پر خطاب کرتے ہوئے الطاف حسین نے کہا وزیر اعظم نواز شریف سندھ میں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس سے قوم کو آگاہ کریں، اگر قوم اور قومی اسمبلی کو اعتماد میں نہیں لیا گیا اور اس کارروائی کے نتیجے میں کوئی بڑا نقصان ہو گیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری وزیر اعظم پر عائد ہوگی۔ سندھ نیشنل فرنٹ کے چیئرمین ممتاز علی بھٹو نے کہا کہ اگر فوج کو سندھ میں امن و امان کی بحالی کے لئے بھیجا گیا تو ہم اس اقدام کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن اگر اس کے پردے میں انتقامی کارروائیاں کی گئیں تو یہ سندھ کی بدقسمتی ہوگی۔ جئے سندھ ترقی پسند پارٹی کے چیئرمین ڈاکٹر قادر مگسی نے کہا کہ فوجی آپریشن سندھیوں پر ایک نئی قیامت ٹوٹنے کے مترادف ہوگا۔ حکومت اگر فوجی آپریشن ہی کو مسائل کا واحد حل سمجھتی ہے تو پہلے اس آپریشن کی حدود، اختیارات اور مقاصد کی وضاحت کرے۔

20 مئی کو فوجی اور نیم فوجی دستوں نے اندرون سندھ اپنے مورچے قائم کر لئے۔ حساس مقامات کو سیل کر دیا گیا۔ جنگلا اور کچے کے علاقوں میں ڈاکوؤں کی کمین گاہوں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ فوجی ذرائع نے بتایا کہ یہ کارروائی مرحلہ وار ہوگی۔

30 جون کو پیپلز پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹو کونسل نے کراچی میں اپنے دو روزہ اجلاس کے اختتام پر ایک قرارداد منظور کی، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ جناح پور منصوبہ پر کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرنے پر صدر اور وزیر اعظم دونوں مستعفی ہو جائیں۔ اسحٰق، نواز اور مظفر دھڑے نے سندھ کے مسائل پر چپ سادھ لی ہے۔ فوجی آپریشن مسائل کا حل نہیں۔ ایم کیو ایم میں موجود

عناصر اسلحہ، منشیات، ڈکیتی، زمینوں پر قبضے، بھتہ کی وصولیابی اور اغواء برائے تاوان جیسے جرائم میں ملوث ہیں۔ اجلاس نے مطالبہ کیا کہ اسمبلیاں توڑ کر قومی حکومت تشکیل دی جائے۔ چیف الیکشن کمشنر کے عہدہ پر کسی ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جس پر تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو اعتماد ہو۔ اگر صدر اور وزیراعظم مستعفی نہیں ہوتے تو پھر ہم ایک عوامی تحریک کا آغاز کریں گے۔

30 جون کو پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں سندھ میں جاری فوجی آپریشن کی مکمل حمایت کا اعلان کیا اور مطالبہ کیا کہ اس آپریشن کو اس کے مطلوبہ نتائج کے حصول تک جاری رکھا جائے۔ اجلاس میں منظور کی جانے والی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ اسمبلیوں کے خاتمے اور قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ بلاجواز ہے۔ پیپلز پارٹی کے نزدیک تو جمہوریت صرف وہی ہے جس میں وہ خود برسراقتدار ہو۔

30 جون کو کراچی میں کور ہیڈکوارٹرز میں ایک بریفنگ میں شرکت کے بعد وزیراعظم نواز شریف نے کہا کہ کسی کو ریاست کے اندر ریاست بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میری حکومت کسی کو غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ہم ایم کیو ایم کے سنجیدہ عناصر کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کے لئے آمادہ ہیں۔

سندھ میں فوجی آپریشن کا آغاز دیہی علاقوں سے ہوا، جہاں اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ ڈاکوؤں کا قلع قمع کر کے وہ امن وامان بحال کر دیا گیا جس سے پوری آبادی کو اطمینان حاصل ہوا، فوج کو عوام کا تعاون اور اعتماد ملا، اسی بناء پر ٹنڈو بہاول جیسے المناک سانحہ پر بھی اندرون سندھ کوئی اشتعال یا ردعمل پیدا نہیں ہوا۔ فوج نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرف داری کرنے کی بجائے بلاتاخیر بھرپور کارروائی کر کے انصاف کے تقاضے پورے کئے، اندرون سندھ ڈاکوؤں کو پناہ دینے میں تو بعض بااثر افراد کا عمل دخل تھا لیکن بدامنی، ڈاکہ زنی اور قتل وغارت گری کی وارداتوں میں کوئی سیاسی جماعت براہِ راست ملوث نہیں تھی۔ لیکن شہری علاقوں کے حالات اس سے مختلف تھے یہاں گزشتہ تین انتخابات میں ایم کیو ایم شہری علاقوں کی واحد نمائندہ تنظیم بن کر اُبھری ہے۔ میاں محمد نواز شریف کے قائد تحریک الطاف کے ساتھ انتہائی قریبی تعلقات استوار رہے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میاں صاحب پنجاب کے وزیراعلیٰ اور ملک کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی کراچی ایئرپورٹ سے براہ راست الطاف حسین سے ملاقات کے لئے ان کی رہائش گاہ عزیز آباد تشریف لے گئے۔ تخلیہ میں طویل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میاں صاحب نے

ایم کیو ایم کے ساتھ 1989ء میں اس وقت ایک خفیہ معاہدہ کیا جب وہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں شامل تھی۔ 1990ء کے عام انتخابات کے موقع پر میاں صاحب نے یکطرفہ طور پر یہ ہدایت جاری کر دی کہ اسلامی اتحاد کے تمام اُمیدوار ایم کیو ایم کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ اس فیصلے میں تبدیلی کے بعد بھی مسلم لیگ نے اپنا کوئی اُمیدوار ایم کیو ایم کے خلاف کھڑا نہیں کیا، سندھ کے شہری علاقے دیہی علاقوں کی طرح بدامنی کا شکار نہیں تھے۔ یہاں حکمرانوں نے اصولوں اور انصاف کے تقاضوں کو اپنی مصلحتوں پر قربان کر دیا۔ وفاقی اور صوبائی حکومت کو ایم کیو ایم کی حمایت درکار تھی، اس کے حصول کے لئے انہوں نے ایم کیو ایم کو کھلی چھوٹ دے دی۔ تشدد کی پشت پناہی کی اور دہشت گردوں کو تحفظ فراہم کیا۔ جام صادق کو حکومت کا تو کلی دارومدار ایم کیو ایم کی حمایت پر موقوف تھا۔ اس لئے اس دور میں ایم کیو ایم کو سب کچھ کرنے کی اجازت حاصل تھی، فوجی آپریشن کے آغاز میں ایم کیو ایم کو یقین دہانی کرائی گئی کہ یہ دیہی علاقوں تک محدود ہوگا۔

بے نظیر بھٹو کا لانگ مارچ

10 نومبر کو بینظیر بھٹو نے اعلان کیا کہ 18 نومبر کو ایوانِ صدر اور پارلیمنٹ کا گھیراؤ کیا جائے گا۔ اسلام آباد میں چار لاکھ افراد جمع ہو جائیں تو حکومت تبدیل ہو جائے گی۔ ہمارا لانگ مارچ پرامن ہوگا۔ ملک کا بچہ بچہ اس میں شریک ہوگا۔ ہم بسم اللہ کر کے اپنی مہم کا آغاز کر رہے ہیں۔ دفعہ 144 نافذ کی گئی تو یہ ایک غیر قانونی اقدام ہوگا۔ ہم نے حکومت کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ میں حکمرانوں کو اسلام آباد سے بھگا کر دم لوں گی۔ نواز شریف 8 ویں ترمیم کی پیداوار ہیں۔ وہ ملک کو اتفاق فاؤنڈری سمجھ کر چلا رہے ہیں اور صرف اپنے خاندان کی خوش حالی کے لئے کوشاں ہیں جبکہ میں قائداعظم، علامہ اقبال اور پاکستان کی بات کرتی ہوں۔ ہماری طرف سے مذاکرات کے دروازے کھلے تھے لیکن حکومت نے ہماری کوشش ناکام بنادی۔ میں اب صدر سے بھی کوئی بات چیت نہیں کروں گی۔ مارشل لاء اور فوجی مداخلت کا دور گزر چکا ہے۔ اصغر خاں نے کہا کہ ضیاء الحق کے صاحبزادے آج کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ ہم صدر سے آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسمبلی توڑنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ امریکہ کے انتخابات اگر ہمارے موجودہ الیکشن کمشنر کراتے تو بش جیت جاتے۔ پیپلز پارٹی کے نوجوان اور طلبہ تنظیم کے رہنماؤں نے اعلان کیا کہ پارٹی کی قائد بینظیر بھٹو نے کمپیوٹر کے ذریعے بننے والی حکومت کے خلاف طبل جنگ بجا دیا ہے۔ 18 نومبر کو موجودہ حکمرانوں کے اقتدار کا آخری دن ہوگا۔ اس دن ملک بھر کے عوام قیادت کی گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا دے کر اس سے نجات حاصل کر لیں گے۔ راولپنڈی میں جلسہ عام کے بعد عوام لانگ مارچ کریں گے اور موجودہ حکمرانوں کو مار بھگائیں گے۔ نوجوان اور پی ایس ایف کے کارکنان اس میں ہراول دستہ کا کردار ادا کریں گے۔ عوام غریب سے غریب تر ہو گئے ہیں۔ کسی کی جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ نہیں۔ قومی اثاثوں کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کیا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی ہائی کمان نے پیپلز یوتھ اور پی ایس ایف کے کارکنوں کو ہدایت دی

کہ اگر انتظامیہ کی طرف سے لانگ مارچ میں رکاوٹ ڈالی جائے تو اہم تنصیبات پر قبضہ کر لیا جائے۔ سابق وفاقی وزیر سید پرویز علی شاہ نے ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”جاگ پنجابی جاگ تری پگ نوں لگ گیا داغ“ کا نعرہ لگانے والوں نے اقتدار کی خاطر ایم کیو ایم سے اتحاد کیا جس کا مقصد جناح پور کا قیام تھا۔ نواز شرف نے ایم کیو ایم کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کی سازش کی۔ اس لئے ایسی حکومت کے خاتمے کے لئے بھٹو شہید کی بیٹی نے پنجاب کے غیرت مندوں کو پکارا ہے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے کہا کہ 18 نومبر کو نواز شریف کی دیمک زدہ حکومت کو آخری دھکا دیں گے۔ عوامی قوت کو روکنے کے لئے اگر فوج کو سامنے لایا گیا تو یہ بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ لانگ مارچ کا فیصلہ مجبوراً کیا گیا ہے۔ ملکی سالمیت کے لئے حکومت کو ہٹانا ضروری ہو گیا ہے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ فوج کوئی سیاسی نہیں بلکہ قومی ادارہ ہے۔ اس لئے سیاسی مقابلہ میں فوج کسی فریق کا ساتھ نہیں دے گی۔ لانگ مارچ عوام کا جمہوری اور آئینی حق ہے۔ اب یہ کسی حال میں رُک نہیں سکتا۔ عوام ماریں گے مر جائیں گے لیکن حکومت کو نہیں چھوڑیں گے۔ عوام کے لئے دو ہی راستے ہیں کہ وہ یا تو اپنا حق چھین لیں یا پھر غلامی قبول کر لیں۔ 18 نومبر سے دما دم مست قلندر ہوگا اور عوامی راج کا دور شروع ہوگا جو نا اہل حکومت بھارت سے دو پاکستانیوں کا انتخاب احمد ضیاء اور حبیب اللہ کی لاشیں نہیں لا سکی، جنہیں بھارت میں قیام کے دوران بھارتی خفیہ ایجنسی نے قتل کر دیا تھا، وہ کشمیر کی آزادی کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ ظلم، جبر اور ناانصافیوں کے خلاف لکھنے والے صحافی، شاعر، ادیب اور اخبارات آج باغی قرار دیئے جاتے ہیں جبکہ پاکستان کا جھنڈا جلانے والے ان کے نزدیک محب وطن ہیں۔ ہم جلد ہی عوام کو نواز شریف اور الطاف حسین کے درمیان کی جانے والی گفتگو کے کیسٹ سنوائیں گے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ ہم جتوئی کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے صدر پر تنقید کرنے کی بجائے صرف نواز شریف پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے۔ جب تک صدر مجھ پر حملہ نہیں کرتے میں بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کہوں گی۔ بیگم نصرت بھٹو نے بھی کہا کہ لانگ مارچ کا راستہ کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ قائم علی شاہ نے کہا کہ حکومت لانگ مارچ سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔ سندھ کے مختلف مقامات سے بسوں، جیپوں اور کاروں کے ذریعہ قافلے 15 نومبر سے روانہ ہونا شروع ہو جائیں گے۔

7 نومبر کو رائے ونڈ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کا احتجاج خود بخود دم توڑ دے گا۔ ہم ماضی کی غلطیوں کی تلافی

کے لئے تعمیر و ترقی کے کاموں کو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ کرنے میں مصروف ہیں۔ عوام اپوزیشن کی منفی سیاست سے تنگ آچکے ہیں۔ اپوزیشن ملک میں افراتفری پھیلانا چاہتی ہے۔ احتجاجی پروگرام بیرونی آقاؤں کے اشارے پر ملک کو نقصان پہنچانے کی ایک سازش ہے۔ عوام ہلڑبازی کی سیاست کو مسترد کر چکے ہیں۔ اب بینظیر بھٹو کی کال پر لوگ سڑکوں پر نہیں آئیں گے۔ ہم نے پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں کبھی غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے۔ اپوزیشن نے 1990ء کے انتخابات میں ہماری کامیابی اور اپنی شکست کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ لانگ مارچ ناکام ہوگیا اور حکومت اپنی مدت پوری کرے گی۔ وفاقی وزیر غلام احمد بلور نے بھی کہا کہ لانگ مارچ کا ڈرامہ ناکام ہوگا۔ سینیٹر یحییٰ بختیار نے کہا کہ لانگ مارچ ملک میں آئینی اور قانونی بحران پیدا کرسکتا ہے۔ حکومت پیپلز پارٹی کی اسٹریٹ پاور کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مجھے پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے مرکزی مجلس عاملہ کی طرف سے نوٹس دیا ہے کہ میں اپنا منہ بند رکھو اس لئے میں "شٹ اَپ" ہوگیا ہوں۔ میں پارٹی کے عہدوں سے مستعفی ہو چکا ہوں۔ اگر مجھ سے کہا گیا تو میں سینٹ سے بھی علیحدہ ہو جاؤں گا۔ بےنظیر کی غالباً "بابا" سے انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ اگلے صدارتی انتخابات میں بینظیر بھٹو غلام اسحٰق خان کا ساتھ دیں گی۔

▪ ▪ ▪

نواز شریف حکومت کی برطرفی

18 اپریل کو ساڑھے نو بجے شب ملکی اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کے سامنے اس صدارتی حکم کا اعلان کیا گیا کہ آئین کے آرٹیکل 58(2) بی اور خود کو حاصل دوسرے تمام اختیارات صدر غلام اسحٰق خان نے قومی اسمبلی فوری طور پر توڑ دی اور وزیر اعظم نواز شریف اور وفاقی کابینہ کو برطرف کر دیا۔

اتوار 18 اپریل کو رات گئے صدر غلام اسحٰق خان نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے قومی اسمبلی کو توڑنے اور نواز شریف کابینہ کو برطرف کرنے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم نے صدر مملکت کے خلاف جو وفاق کے اتحاد کی علامت ہیں، جھوٹے اور شر انگیز الزامات لگا کر عوام کی توجہ ہٹانے اور حکومت کی ناکامیوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تقریر کا مقصد عوام کو ایجی ٹیشن پر اُکسانا تھا۔ ان کا یہ طرزِ عمل آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ حکومت کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ اس دوران پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ اہم ادارے مشترکہ مفادات کی کونسل نے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں۔ مالی، تجارتی اور اقتصادی پالیسیاں اور منصوبے بنانے میں قومی اقتصادی کونسل کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ صوبوں کے آئینی حقوق میں دخل اندازی کی گئی۔ نجکاری کے معاملات میں بھی آئینی ضروریات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ بینکوں اور کارپوریشنوں میں اقربا پروری کا مظاہرہ کیا گیا۔ کوآپریٹو اور دوسرے مالیاتی اسکینڈل کے بعد جب متاثرین کی فریادیں اخبارات میں شائع ہو کر حکمرانوں کے ضمیروں کو چیلنج کرنے لگیں تو جرأت اظہار کے جرم میں طرح طرح سے بے باک زبانوں پر تالے ڈالنے کی کوشش کی گئی اور آزادی رائے کے حق کو روند ڈالا گیا۔ بعض کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمات قائم ہوئے، بعض کو ایجنسیوں کے ذریعہ ہراساں کیا گیا۔ کسی کے اشتہارات بند کیے گئے اور کسی کے لئے کاغذ کا حصول ناممکن بنا دیا گیا۔

کسی کو انکم ٹیکس کے معاملات میں اُلجھایا گیا۔ بعض صحافیوں کو زدوکوب بھی کیا گیا۔ آرڈی نینسوں کے اجرا اور بعض اہم معاملات میں کابینہ کو بھی اعتماد میں نہیں لیا جاتا رہا۔ وفاقی وزراء کو صدر سے ملنے کو منع کر دیا گیا۔ حکومت کے ذرائع اور قومی دولت کو فضول کاموں پر صرف کیا گیا۔ بینکوں میں بھی اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا گیا جس سے افراطِ زر میں اضافہ ہوا۔ وزیر اعظم نے صدر مملکت کو سازشی، ناپاک اور غیر مقدس جیسے القاب سے نواز کر آئین کی کھلم کھلا بغاوت کی۔ اس طرح کی دریدہ دہنی اور لغو الزام تراشی کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔ وہ یہ بھول گئے کہ اسی صدر کو صرف چند روز قبل انہوں نے اپنی جماعت کا صدارتی اُمیدوار نامزد کر کے کابینہ سے اس کی توثیق کرائی تھی۔ میں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں احتیاط کی راہ اختیار کی تھی لیکن اقتدار کی ہوس میں ملک کے بہترین مفاد کو داؤ پر لگانے والے اپنی روش سے ہٹنے پر تیار نہ ہوئے اور ملک کو سنگین بحران سے دوچار کرنے کی ٹھان لی۔ بری فوج کے مرحوم سربراہ کی بیوہ کی طرف سے ان کے خاوند کو قتل کرنے کا الزام سنگین ہے۔ حزب اختلاف کے رہنماؤں اور وزراء سمیت سرکاری بنچوں کے بہت سے ارکان کے اجتماعی استعفوں سے ان کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ عوام کی رائے دوبارہ معلوم کی جائے۔ وفاقی حکومت اور قومی اسمبلی نے عوام کا اعتماد کھو دیا ہے۔ وفاقی حکومت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ ملک کی سلامتی اور یکجہتی کو لاحق خطرات اور پاکستان کو درپیش گھمبیر اقتصادی صورتِ حال سے مناسب اور مثبت طریقے سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس صورت حال میں، میں خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس وقت عوام سے تازہ مینڈیٹ لینے کی ضرورت ہے۔

باوثوق ذرائع نے بتایا کہ صدر نے قومی اسمبلی توڑنے اور نواز شریف حکومت کو برطرف کرنے کا فیصلہ نمازِ مغرب کے بعد کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے مسلح افواج کے سربراہوں کو اعتماد میں لیا۔ پھر انہوں نے شام ساڑھے چھ بجے بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک اہم ملاقات کی جس میں آصف زرداری اور فاروق بھی موجود تھے۔ مذاکرات کا آغاز ماضی کے بعض تلخ واقعات اور گلے شکوے سے ہوا۔ لیکن دونوں اس بات پر متفق ہوگئے کہ نئی صورتِ حال میں ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے کھلے دل سے بات کی جائے۔ اس ملاقات میں بینظیر بھٹو نے اپنے تمام اراکین اسمبلی کے استعفیٰ صدر کو دے دیئے۔ نگران حکومت کے فارمولے پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ بینظیر بھٹو کی تائید اور حمایت ملنے کے بعد صدر نے یہ قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ بتایا گیا کہ صدر کی تقریر

مولانا کوثر نیازی نے مرتب کی۔ جس وقت صدر نے وزیر اعظم کو برطرف کرنے کا فیصلہ کیا، اس وقت نواز شریف ترکی کے سفیر کے گھر ترکی کے صدر ترگت اوزال کی وفات پر جو 18 اپریل کو 66 سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے کے باعث انتقال کر گئے تھے، تعزیت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ٹی وی پر رات 9 بج کر 56 منٹ تک نواز شریف کی حمایت میں پروگرام جاری رہے۔

بی بی سی نے کہا کہ عوام نے صدر کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا اور اسے معاشرتی استحکام کے لئے بھی خطرناک قرار دیا گیا۔ لوگ سوال کر رہے ہیں کہ اب کیا ہوگا'' "گلف نیوز'' نے لکھا کہ غلام اسحٰق خان بھی غلام محمد اور اسکندر مرزا کی صف میں شامل ہوگئے۔ سردار شیر باز خاں مزاری نے کہا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیے جانے کے بعد اسمبلی کا توڑنا زیادتی ہے۔ شیخ رشید نے کہا کہ جو آدمی بادام نہیں توڑ سکتا، وہ اسمبلی کیسے توڑ سکتا ہے۔ صدر کو توپوں کی سلامی میں دفن ہونے کا شوق ہے۔ ''گو بابا گو'' کے نعرے لگانے والے ''کم بابا کم'' پر اُتر آئے ہیں۔ دائیں نے کہا کہ صدر نے جو کچھ کرنا تھا انہوں نے کر لیا۔ اب ہماری باری ہے۔ ہم عوام کی عدالت میں جا رہے ہیں اسپیکر گوہر ایوب نے کہا کہ میں اس حکم کو فوری طور پر عدالت میں چیلنج کروں گا۔ امریکہ میں پاکستانی سفیر عابدہ حسین احتجاجاً مستعفی ہوگئیں۔ گورنر پنجاب میاں محمد اظہر نے بھی 18 اپریل کو اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر امتیاز احمد بھی مستعفی ہوگئے۔

o

2 مئی کو بینظیر بھٹو کراچی سے امریکہ کے لئے روانہ ہوگئیں۔ 5 مئی کو انہوں نے نیویارک میں ایک عالمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مؤثر انداز میں کشمیر کا مسئلہ پیش کیا۔ انہوں نے امریکی وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کیں۔ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا جس سے خطاب کرتے ہوئے جمی کارٹر نے کہا کہ ہمیں توقع ہے کہ پاکستان کے آئندہ انتخابات منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ پاکستان میں جمہوری ادارے مستحکم کرنے میں امریکہ ہماری مدد کرے۔ انہوں نے جمی کارٹر سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کے خلاف اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔ امریکہ سے لندن پہنچ کر بینظیر بھٹو نے کہا کہ میں نے کلنٹن انتظامیہ کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کر دیا ہے۔ آصف زرداری کی حکومت میں شمولیت ہماری اخلاقی فتح ہے۔ بینظیر بھٹو کا یہ

بیرونی دورہ ان کی انتخابی مہم کا ایک حصہ تھا۔ ممتاز برطانوی روزنامے ''فنانشل ٹائمز'' نے لکھا کہ بینظیر بھٹو ایک بار پھر اقتدار کے بالکل قریب ہیں۔ ان کے آئندہ وزیراعظم بننے میں بظاہر کوئی شک نہیں۔ آصف زرداری نے کہا کہ پاکستان میں پیپلز پارٹی کے علاوہ کوئی دوسری سیاسی جماعت نہیں ہے۔ بینظیر بھٹو اور آصف زرداری ایک ہفتے کے امریکہ اور برطانیہ کے دورے کے بعد کراچی واپس پہنچ گئے۔ اعجاز الحق نے کہا کہ بینظیر بھٹو اپنے امریکی آقاؤں سے اقتدار کی بھیک مانگنے گئی تھیں۔

محاسبہ کمیٹی کے چیئرمین وفاقی وزیر زاہد سرفراز نے کہا کہ نواز شریف نے ملکی خزانے کو ایک ارب روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے 84 کروڑ روپے ناجائز طور پر من مانے طریقے سے خرچ کئے۔ اپنے زرعی فارم اور صنعتی کمپلیکس کے لئے رائے ونڈ میں 5 کروڑ روپے خرچ کر کے سڑکیں بنوائیں۔ حکومت پنجاب کے احتجاج کے باوجود 50 کروڑ روپے دیگر مدارت پر خرچ کر دیئے۔ نواز شریف اور چوہدری خاندان نے 123 کروڑ روپے کے قرضے کوآپریٹو اداروں سے حاصل کئے۔ 15 ہزار روپے سے مسلم کمرشل بینک میں اکاؤنٹ کھولا اور اگلے دن 15 کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کر لیا۔ اسکریپ کی ڈیوٹی میں کمی کر کے 33 کروڑ روپے ڈیوٹی کی مد میں اور 4 کروڑ روپے سیلز ٹیکس کی مد میں اتفاق فاؤنڈری کو دلوائے گئے۔ ''جاگ پنجابی جاگ'' کا نعرہ لگا اور پنجاب بینک قائم کر کے تعصب پھیلایا۔ نواز شریف نے کہا کہ اسکریپ ڈیوٹی میں کمی کا الزام بے بنیاد ہے۔ احتساب کمیٹی کی کوئی حیثیت نہیں۔ سربراہ کرپٹ شخص ہے جس کے خلاف اب بھی اسکینڈل موجود ہے۔ میری منت سماجت کر کے اسے ختم کرایا گیا تھا۔ چور دروازے سے اقتدار میں آنے والے الزام نہیں لگائیں گے تو اور کیا کریں گے۔ زاہد سرفراز کے الزامات کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔

فاروق لغاری نے کہا کہ نواز شریف نے موٹروے منصوبے میں 18 ارب روپے کمیشن لیا۔ بلخ مزاری نے بھی کہا کہ موٹروے منصوبہ سابق حکمرانوں کا سب سے بڑا مالیاتی فراڈ ہے۔ یہ سودا رات کی تاریکی میں کیا گیا۔ قومی خزانہ لوٹنے والوں کا احتساب کیا جائے گا۔ انٹیلی جنس بیورو کے سابق سربراہ بریگیڈیئر امتیاز کے خلاف ڈیڑھ کروڑ روپے کی سرکاری رقم خرد برد کی تھی۔ نگران وزیراعلیٰ نے ان کی گرفتاری کی اجازت دے دی۔

حکومت بحال ہوگئی

26 مئی کو دن کے ایک بجے سماعت مکمل ہوگئی۔ اسی دن سوا تین بجے دو صفحات پر مشتمل مختصر فیصلہ سنا دیا گیا۔ تفصیلی فیصلہ جلد ہی تحریر کر دیا جائے گا۔ گیارہ ججوں میں سے دس ججوں نے آئین کے آرٹیکل 184(3) کے تحت نواز شریف کی درخواست منظور کر لی اور متفقہ طور پر قرار دیا کہ صدر پاکستان نے 18 اپریل 1993ء کو جو حکم جاری کیا تھا کہ صدر کو آرٹیکل 58(2) بی اور اس ضمن میں آئین کی دیگر شقوں کے تحت حاصل اختیارات کے دائرے میں نہیں آتا اس لئے وہ حکم قانونی اختیار کے بغیر تھا جس کی اب کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ عدالت کے فیصلے میں قومی اسمبلی، وزیراعظم اور کابینہ کو بحال کیا جاتا ہے۔ فیصلہ فوری طور پر نافذ العمل سمجھا جائے۔ نگراں حکومت کی قانونی حیثیت ختم ہوگئی۔ مسٹر جسٹس سید سجاد علی شاہ نے فیصلے سے اختلاف کیا۔ فیصلہ سنانے کے بعد اسسٹنٹ اٹارنی جنرل نے چیف جسٹس نے نظر ثانی کی درخواست دائر کرنے کی اپیل کی جسے عدالت نے مسترد کر دیا۔

فیصلہ سننے کے بعد نواز شریف مرحوم ضیاء الحق کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گئے۔ انہوں نے تمام ہم وطنوں سے اپیل کی کہ جمعہ کو یوم تشکر منایا جائے۔ قومی اسمبلی کی بحالی پر پورے ملک میں جشن کا سماں تھا۔ لوگوں نے خوشی میں جلوس نکالے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ صدر نے کہا کہ میں فیصلے کا احترام کروں گا اور آئین کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔ ان کے عہدے کی مدت 13 دسمبر 1993ء کو ختم ہو جائے گی۔ ان کی عمر 20 جنوری 1993ء کو 78 سال ہو چکی ہے۔ فیصلے کے بعد بلخ مزاری، منشی، روئیداد خاں، میر افضل اور مظفر شاہ سمیت متعدد رہنماؤں نے ایوان صدر میں ایک غیر رسمی اجلاس میں شرکت کی۔ حکومت کی بحالی پر جنرل وحید نے بدھ کی شب وزیراعظم سیکرٹریٹ میں نواز شریف سے ملاقات کر کے انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ فوج سپریم کورٹ کے فیصلے کی پاسداری کرے گی۔ گوہر ایوب نے کہا کہ اب بینظیر بھٹو

اورنواز شریف میں مفاہمت کے زیادہ امکانات ہیں۔ اسمبلی کی بالادستی ثابت ہوگئی۔ صدر مستعفی ہو جائیں۔ سردار شیر باز خاں مزاری نے کہا کہ صدر کو مستعفی ہو جانا چاہئے۔ قاضی حسین احمد نے کہا کہ یہ فیصلہ جمہوری اداروں کی فتح ہے۔ افتخار گیلانی نے کہا کہ ہم اس فیصلے پر خوش ہیں۔ قائم علی شاہ نے کہا کہ فیصلہ آئین اور قانون کے مطابق ہے۔ فخر الدین جی ابراہیم نے کہا کہ اخلاقی طور پر صدر کو مستعفی ہو جانا چاہئے۔ ایڈووکیٹ خالد انور نے کہا کہ سپریم کورٹ نے پاکستان کی تاریخ کا عظیم ترین فیصلہ دیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اٹارنی جنرل منشی نے کہا کہ عدلیہ کے فیصلے پر کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ مظفر شاہ نے کہا کہ ہم فیصلے کا احترام کرتے ہیں۔ نواز شریف سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ ولی خان نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے صدر کی حمایت کر کے ثابت کر دیا کہ ان کا کوئی اُصول نہیں ہے۔ صدر اور وزیر اعظم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

چٹھہ نے کہا کہ نواز شریف کے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔ ہم ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کریں گے۔ زاہد سرفراز نے کہا کہ اب میں قومی اسمبلی میں نواز شریف کو بے نقاب کروں گا۔

امریکی نائب وزیر خارجہ نے کہا کہ اُمید ہے تمام فریق قانون کے مطابق عمل کریں گے۔ فیصلہ آئینی عمل کا حصہ ہے۔ نواز شریف کو شاہ فہد، نرسہاراؤ اور بنگلہ دیش کی حکمران جماعت کی جانب سے مبارکباد کے پیغام موصول ہوئے۔

بی بی سی نے اپنے تبصرہ میں کہا کہ اس فیصلے سے بینظیر بھٹو کی حکمت عملی افراتفری کا شکار ہوگئی ہے۔ انہوں نے صدر کا ساتھ دے کر اپنی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ جمہوریت اور عدالتی نظام نے اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر لیا۔ آئندہ چند دنوں میں سیاسی اقدامات مستقبل کا رُخ متعین کریں گے۔ وائس آف جرمنی نے کہا کہ اب سیاسی کشمکش مرکز سے صوبوں میں منتقل ہو جائے گی۔

وزیر اعظم نواز شریف نے بحالی کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔ ہم نے ماضی میں دانستہ کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ نگران حکومت نے بے بنیاد الزامات لگا کر ہماری کردار کشی کی۔ سندھ میں زمین کی تقسیم کا کام مزید تیز کر دیا جائے گا۔ ہم وطن عزیز کی حفاظت کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کریں گے۔ بینظیر بھٹو اور دوسرے سیاست دان ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ بدھ 26 مئی کو رات گئے

بینظیر بھٹو کی رہائش گاہ پر پی ڈی اے کا ایک اجلاس ہوا جس میں آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کیا گیا۔

ایک وفد سے ملاقات کے موقع پر بینظیر بھٹو نے کہا کہ انتخابات اکتوبر میں ہوں گے۔ کارکن تیاریاں شروع کر دیں۔ عوام نے ایک دن کے لئے بھی نواز شریف کو ملک کا منتخب وزیر اعظم تسلیم نہیں کیا۔ وہ دھاندلی کی پیداوار ہیں۔ پاکستان رشوت اور فراڈ کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

فوجی قیادت کے مشورے اور سنگین سیاسی حالات کے باوجود مرکزی حکومت نے صدر کے ساتھ اپنی محاذ آرائی جاری رکھی۔ متنازعہ فرمان کے مسئلہ پر ابہام کو دور کرنے کے لئے وفاقی کابینہ نے سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ آئین کے آرٹیکل 186 کے تحت سپریم کورٹ کی رائے لینے کے لئے پارلیمانی اُمور کی وزارت نے ایک سوال تیار کیا جس کی کابینہ نے منظوری دے دی۔ سوال کے الفاظ تھے کہ ''کیا آئین کے آرٹیکل 234 کے تحت پارلیمنٹ کی قرارداد کی توثیق صدر سے کرانا ضروری تھا۔'' وفاقی حکومت کا کہنا تھا کہ آئین اور قانون کی خلاف ورزی کا جو سلسلہ ایوان صدر سے شروع ہوا ہے، اسے بند کرائے بغیر ملک کا سیاسی بحران ختم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مرکزی حکومت نے اپنے فرمان کے بارے میں تیار کیا ہوا سوال سپریم کورٹ کے حوالے کرنے کے لئے صدر کو روانہ کر دیا۔ 3 جولائی کو وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ یہ آئینی ریفرنس صدر فوراً ہی سپریم کورٹ کو بھیج دیں۔

صدر کے علاوہ پنجاب کے ساتھ بھی محاذ آرائی جاری تھی۔ دو جولائی کو وفاقی حکومت نے رینجرز کے ڈائریکٹر جنرل کو ہدایت دی کہ لاہور کے گورنر ہاؤس، وزیر اعلیٰ ہاؤس اور سیکرٹریٹ پر رینجرز کے دستے تعینات کر دیئے جائیں۔ لیکن ڈائریکٹر جنرل نے ان احکامات کی تعمیل سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ میاں محمد اظہر نے سول سیکریٹریٹ میں داخل ہونے کی پھر کوشش کی لیکن ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکاروں نے انہیں واپس کر دیا۔ وٹو نے کہا کہ میاں اظہر آئین کے انحراف سے باز رہیں۔ صدر کے فرمان کے بغیر پارلیمنٹ کی قرارداد نافذ العمل نہیں ہوسکتی۔ گورنر ہاؤس کے اجلاس میں میاں اظہر کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 120 اور 124 کے تحت گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا کیونکہ وہ ایک غیر آئینی فرمان کے تحت صوبے پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو بغاوت کے مترادف ہے۔ لیکن صدر نے حکومت پنجاب کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ تین جولائی کو نواز شریف کے مخالفین نے مال روڈ لاہور پر مارچ کیا۔ جلوس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے وٹو نے کہا کہ فوج کی دانشمندی سے ملک خون ریزی سے بچ گیا ہے۔ ہم نواز شریف کو پنجاب

حکومت پر شب خون نہیں مارنے دیں گے۔ وفاقی وزیر چوہدری شجاعت نے کہا کہ الطاف اور وٹو نے گورنر اور وزیر اعلیٰ ہاؤس میں غنڈہ عناصر کو جمع کر رکھا ہے۔ وفاق کا نمائندہ گورنر صوبائی خودمختاری سلب کر رہا ہے۔ ہمیں الطاف اینڈ کمپنی کے منصوبوں کی اطلاع مل چکی ہے۔ انہیں ایک دن ارکان اسمبلی کی اکثریت کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ پرویز الٰہی نے بھی کہا کہ بعض مفاد پرست عناصر پنجاب پر اپنی آمریت قائم کر رہے ہیں۔ اپنی اکثریت ثابت کرنے کے لئے میرے حامی ارکان تین جولائی کو نماز مغرب شاہ فیصل مسجد میں ادا کریں گے۔ پروگرام کے مطابق پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے ارکان کا اجلاس شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں ہوا۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ فوج اپنی نگرانی میں پنجاب اسمبلی میں قائد ایوان کا انتخاب کرائے۔ اکثریت کا فیصلہ مسجد ہی میں کر لیا جائے۔

2 جولائی کو لاہور ہائی کورٹ نے وفاقی حکومت کے نامزد کردہ چیف سیکرٹری پرویز مسعود اور آئی جی پولیس نثار چیمہ کی عبوری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کر لی۔

گورنر پنجاب نے جماعت اسلامی کو پنجاب کی نگراں کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ جسے جماعت نے قبول نہیں کیا۔ لاہور میں شاہراہ قائداعظم اور اہم چوکوں پر فوجی جوان تعینات کر دیئے گئے۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک آ گئے، اس وجہ سے مارشل لاء نافذ ہو جانے کی افواہ پھیل گئی۔ چوہدری شجاعت نے کہا کہ فوج یا رینجرز کو تعینات کرنے کا ہم نے کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

o

2 جولائی کو وٹو کی دعوت پر لاہور میں نواب زادہ نصر اللہ کی صدارت میں کل جماعتی کانفرنس کا ایک اجلاس ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ صدر فوری طور پر اسمبلی توڑ دیں، وزیر اعظم کو برطرف کریں اور قومی حکومت بنائی جائے جو آزادانہ انتخابات کرائے فوج کے ذریعے موجودہ حکمرانوں کا احتساب کرایا جائے۔ آئینی ڈھانچہ تباہ کرنے اور پنجاب پر لشکر کشی کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے۔

3 جولائی کو کل جماعتی کانفرنس کے وفد نے صدر غلام اسحٰق خان سے ملاقات کی جو تقریباً تین گھنٹے جاری رہی، وفد نے مطالبہ کیا کہ اسمبلیاں توڑ کر نئے انتخابات کرائے جائیں، نواب زادہ نے کہا کہ سپریم کورٹ نے آپ کا اسمبلی توڑنے کا اختیار معطل نہیں کیا ہے۔ مولانا

فضل الرحمٰن نے کہا کہ موجودہ حکومت آپ کا لگایا ہوا پودا ہے اب آپ ہی اسے اُکھاڑ پھینکیں۔ صدر نے وفد کو بتایا کہ انہیں پارلیمنٹ کی کوئی قرارداد موصول ہی نہیں ہوئی ہے۔ آپ لوگ اپنا کردار ادا کریں۔ میں اپنے آئینی اختیارات استعمال کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔ سپریم کورٹ کو صدر کے آئینی اختیارات پر کوئی پابندی لگانے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ پوری قوم اذیت میں مبتلا ہے نواز شریف محاذ آرائی ختم کرنے میں مخلص نہیں۔ ملاقات کے بعد نواب زادہ نے پریس کو بتایا کہ صدر نے یہ حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ نئے انتخابات موجودہ سیاسی بحران کا واحد حل ہیں۔ اس میں تاخیر ملک کو خطرات سے دوچار کر دے گی۔ تین جولائی کو بینظیر بھٹو نے کہا کہ رینجرز کے ذریعے پنجاب حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پارلیمنٹ کی قرارداد ضیاء الحق کے ریفرنڈم کے مانند ہے۔ ان حالات میں فوج کب تک غیر جانبدار رہ سکے گی۔ نواز شریف ضد چھوڑ دیں۔ سیاسی معاملات عدالتوں سے رجوع کرنے سے حل نہیں ہوتے۔ نئے انتخابات ناگزیر ہو چکے ہیں۔

3 جولائی کو لاہور ہائی کورٹ نے پنجاب اسمبلی کی بحالی کے فیصلے کے سات منٹ بعد تحلیل کرنے کے خلاف پرویز الٰہی کی درخواست پر سماعت جاری رکھی۔

4 جولائی کو صدر غلام اسحٰق خان نے کہا کہ سیاست دان ملک اور قوم کی قسمت کو داؤ پر لگا کر اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ میں ملک اور قوم کے مفاد میں آئین اور قانون کا پابند ہوں۔ اس بحران سے ملک اور قوم کو بچانے کے لئے آئین جو اجازت بھی مجھے دے گا، میں اسے صدر کی حیثیت سے ضرور استعمال کروں گا۔ اس پر اسپیکر گوہر ایوب نے کہا کہ اگر صدر نے قومی اسمبلی دوبارہ توڑی تو وہ پھر سپریم کورٹ میں جائیں گے۔ نواز شریف اسمبلی توڑنے کا مشورہ نہیں دیں گے۔ شیخ رشید نے کہا کہ صدر خود تو تین ماہ پہلے گھر جانے پر آمادہ نہیں لیکن ہمیں تین سال پہلے ہی بھیج دینا چاہتے ہیں۔ وفاقی وزیر چوہدری عبدالغفور نے کہا کہ اپوزیشن اسمبلی توڑنے کا مطالبہ اس طرح کر رہی، گویا یہ مقتدر ایوان نہیں بلکہ ایک کھلونا ہے۔

4 جولائی کو بینظیر بھٹو نے وزیر اعظم کے نام اپنے خط میں صدر، وزیر اعظم اور اپوزیشن لیڈر کے درمیان قومی حکومت کی تشکیل، آئینی اصلاحات کے پیکج اور نئے انتخابات کی تاریخ کے اعلان پر مشتمل تین نکاتی فارمولے پر مذاکرات کی تجویز پیش کر دی اور کہا کہ اگر انتخاب کے مطالبہ کو پھر رد کر دیا گیا تو ملک عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ نواز شریف اپوزیشن کو

تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ جنرل آصف نواز کے ذریعہ ملاقات طے پا گئی تھی لیکن نواز شریف پہلو بچا گئے، اسی وجہ سے ہم صدر کے پاس جانے پر مجبور ہوئے۔ مردہ اسمبلی کو قرارداد کے ذریعے زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ فوج کے صبر کو آزمانا دانش مقدس نہیں۔ بی بی سی نے کہا کہ بینظیر بھٹو کا خط سیاسی دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ حالات نے عوام کے دل میں فوج کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیا ہے۔ نواز شریف نے بینظیر بھٹو کے خط کا جواب مرتب کرنے کے لئے غوث علی شاہ، شہباز شریف، چوہدری شجاعت، بزن بزنجو، چوہدری امیر حسین، اعجاز الحق اور چوہدری عبدالغفور پر مشتمل سات رُکنی کمیٹی بنا دی۔

ملک کی معروف سیاسی اور دینی جماعتوں اور اہم شخصیات نے صدر اور وزیر اعظم کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوششوں کا آغاز کرایا۔ چار جولائی کو سینٹر مولانا سمیع الحق نے تبلیغی جماعت کے سربراہ مفتی زین العابدین سمیت 21 ممتاز دینی اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ صدر اور وزیر اعظم سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں۔ صدر نے کہا کہ میں نے پچاس ساٹھ سال ملک وقوم کی خدمت کی ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میری خدمات کا یہ صلہ دیا جا رہا ہے۔ میں احتساب چاہتا ہوں۔ وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہمارے ساتھ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں۔ اپنی حکومت کی بحالی کے بعد میں ملکی مفاد میں صدر کے پاس گیا۔ حکومت پنجاب کے بارے میں صدر سے وابستہ میری توقعات پوری نہیں ہوئیں، گورنر کی تبدیلی کے بارے میں ہمارا مشورہ قبول نہیں کیا گیا۔ ہماری حکومت کو غیر مستحکم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ عدالتوں کے خلاف جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ پارلیمنٹ کو بے وقار کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی ہم محاذ آرائی نہیں چاہتے۔ علماء جو بھی قابل عمل فارمولا پیش کریں گے میں قبول کر لوں گا۔

4 جولائی کو قاضی حسین احمد نے بھی صدر اور وزیر اعظم سے ملاقاتیں کی۔ انہوں نے دونوں کو باہمی مفاہمت اور ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے اپنی تجاویز سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ سہ فریقی مذاکرات سے قبل آئینی ترامیم، انتخابی اصلاحات اور دیگر اُمور پر اتفاق رائے ضروری ہے۔ 5 جولائی کو قاضی صاحب نے بینظیر بھٹو سے ملاقات کی جو دو گھنٹے جاری رہی۔ انہوں نے سہ فریقی مذاکرات کی تجویز کی حمایت کی۔ بینظیر بھٹو نے جماعت اسلامی کی بعض آئینی ترامیم کی تجویز سے اختلاف کیا۔

مفاہمت کی ان کوششوں کے دوران پانچ جولائی کو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے

مسلم لیگی رہنما جاوید ہاشمی نے کہا کہ غلام اسحٰق خان ''یحییٰ پلان'' بنا رہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ ملک کو تقسیم کرنے کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ ہم کسی کو بادشاہ نہیں بننے دیں گے اور صدر کی سازشیں بے نقاب کر دیں گے۔ علامہ سعید کاظمی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ جس وقت آرٹیکل 234 کے تحت قرارداد منظور ہوئی تھی اس وقت ایوان میں اتنا شور و غل تھا کہ حزب اقتدار کے 95 فیصد ارکان بھی اس سے لاعلم تھے۔

o

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کی تاریخ 5 جولائی کو بینظیر بھٹو نے اپنے پیغام میں کہا کہ ظالم ٹولے کے منفی اقدامات کے نحس اثرات سے آج بھی ملک دوچار ہے۔ ہم پانچ جولائی 1979ء کو قائم کی جانے والی سیاہ روایات کا خاتمہ کر دیں گے، نواز شریف اپنی آمریت چلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسا کوئی مواد پیش نہیں کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ پنجاب میں وفاقی راج نافذ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اسی دن بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ نواز شریف بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ انہیں قومی حکومت قائم کرنا چاہئے۔ سابق وفاقی وزیر انور سیف اللہ نے بھی کہا کہ مسائل کا واحد حل انتخابات ہیں۔ لیکن وفاقی وزیر ملک نعیم نے کہا کہ آئینی سقم دور کئے بغیر انتخابات پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ وزیر اعظم اور آرمی چیف کے درمیان کوئی اختلافات نہیں ہیں۔ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات ملکی دفاع کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے نواز شریف نے کہا کہ مارشل لاء لگنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپوزیشن کے ساتھ نئے انتخابات پر مذاکرات ہو سکتے ہیں۔

o

6 جولائی کو بینظیر بھٹو نے صدر مملکت کے نام اپنے خط میں ان سے کہا کہ وہ سپریم کورٹ کو وفاقی حکومت کا ریفرنس روانہ کرتے وقت ان نکات کو بھی ریفرنس میں شامل کریں کہ کیا 29 جون کو پارلیمنٹ میں منظور کی جانے والی قرارداد آئین کے مطابق ہے۔ کیا یہ قرارداد قانونی اعتبار سے درست تھی۔ کیا قرارداد میں صوبہ پنجاب کا انتظام وفاق کے تحت دینے کے لئے

پارلیمنٹ کے سامنے کوئی ثبوت پیش کیے گئے تھے۔ کیا کسی ایسی قرارداد کے ذریعے صوبے کی برطرف شدہ اسمبلی کو بحال کیا جاسکتا ہے۔ کیا سرکاری فرمان کے ذریعہ پنجاب میں ایمرجنسی نافذ کی جاسکتی ہے۔ جبکہ صوبائی اسمبلی پہلے ہی توڑی جاچکی ہو۔ کیا وزیراعلیٰ کی طرف سے 28 جون کو اسمبلی توڑنے کے مشورے اور نگراں وزیراعلیٰ کی نامزدگی کو چیلنج کرنے کا کوئی اختیار پارلیمنٹ یا وفاقی حکومت کو حاصل ہے۔ کیا پارلیمنٹ وزیراعلیٰ کے مشورہ پر صوبائی اسمبلی توڑنے کے حکم کو منسوخ کرسکتی ہے اور وفاقی حکومت برطرف شدہ اسمبلی کے اختیارات سنبھال سکتی ہے۔ کیا پارلیمنٹ یا وفاقی حکومت صدارتی اختیارات کم کرکے ایک اجنبی میاں اظہر کو گورنر، وزیراعلیٰ، سپیکر اور صوبائی اسمبلی کو حاصل اختیارات سونپ سکتی ہے اور کیا وزیراعظم نواز شریف اور ان کی کابینہ اس قرارداد کے ذریعے صوبہ پنجاب کے حقوق اور صوبائی خودمختاری غصب کرکے آئین کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں اور اگر ہاں تو پھر کیا ان کے خلاف مقدمہ دائر کرکے بغاوت کے تحت سزا دی جاسکتی ہے۔

6 جولائی کو صدر نے آئینی ریفرنس اس ہدایت کے ساتھ حکومت کو واپس کر دیا کہ قرارداد کی آئینی حیثیت اور دوسرے متعلقہ معاملات بھی سپریم کورٹ سے کئے جانے والے سوال میں شامل کئے جائیں۔ وزیراعظم کو بیرون ملک اس صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا، نواز شریف نے آئینی اور قانونی ماہرین سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی۔ استنبول میں اپنے قیام کے دوران ایک ترک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے نواز شریف نے کہا کہ بینظیر بھٹو کے ساتھ مفاہمت کے لئے ان پر امریکہ کی جانب سے کوئی دباؤ نہیں ہے، ہم اپنے داخلی معاملات میں کسی کو اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ امریکی کانگریس کی خارجہ اُمور کی سب کمیٹی کے چیئرمین نے کہا کہ پاکستان میں سیاسی بحران کا سیاسی حل نکالا جائے۔ امریکہ بحران کے خاتمے کے لئے مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف ہے۔ استنبول میں ایکو کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد نواز شریف عمرہ کی ادائیگی اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کے بعد سات جولائی کو وطن واپس پہنچ گئے۔ 7 جولائی کو بینظیر بھٹو نے صدر سے ملاقات کرکے ریفرنس کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ اس ملاقات میں بینظیر بھٹو نے صدر پر زور دیا کہ اگر نواز شریف اسمبلی نہ توڑیں تو پھر صدر خود ہی اسمبلی توڑ دیں۔ وزیراعظم کانفرنس مبہم اور گمراہ کن ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا خود قرارداد بھی آئینی تقاضوں کے مطابق پہلے سے اعتماد میں نہیں لیا

بیشتر رہنما اس خیال کے حامی تھے کہ ان حالات میں ہم اسلام آباد نہ جائیں۔ لیکن مولانا فضل الرحمٰن اور چند دیگر افراد نے کہا کہ ہمیں جاکر حالات سے باخبر ہونا چاہئے۔ اس طرح یہ اصحاب آدھی رات کے بعد اسلام آباد پہنچے۔ بینظیر بھٹو نے اپنی رہائش گاہ کے صدر دروازے پر ان سب کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ اے پی سی کے ہنگامی اجلاس میں نوابزادہ، جتوئی، مولانا فضل الرحمٰن، آفتاب شیرپاؤ، حافظ حسین احمد، حامد ناصر چٹھہ اور زاہد سرفراز نے شرکت کی۔ انہیں اعتماد میں لئے بغیر لانگ مارچ ملتوی کرنے پر شرکاء نے اظہار ناراضگی کیا۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ یہ سب اتنی جلدی میں ہوا کہ رابطہ ممکن نہیں تھا۔ تاہم اس کے بغیر ہی اے پی سی کے تمام مطالبات تسلیم کرلئے گئے ہیں۔

کل جماعتی کانفرنس کا دوسرا اجلاس جمعہ 16 جولائی کو اسلام آباد میں ہوا۔ بینظیر بھٹو اس میں شریک نہیں تھیں۔ شامل جماعتوں نے الزام لگایا کہ بینظیر بھٹو نے سودے بازی کرکے ڈھائی سالہ جدوجہد پر پانی پھیر دیا۔ پیپلز پارٹی اسی طرح ہمیشہ اپنے حلیفوں کو دھوکہ دے جاتی ہے۔ فاروق لغاری نے وضاحت کی کہ آپ کے تمام مطالبات تسلیم کرلئے گئے ہیں اور ان پر عملدرآمد کرانا فوج کی ذمہ داری ہے پھر بھی فضل الرحمٰن نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے لانگ مارچ کو بیچ دیا۔ عوامی جدوجہد میں اتنے بڑے دھوکے کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ بعض شرکاء نے پیپلز پارٹی کو اے پی سی سے خارج کرنے کا مطالبہ کیا بعد میں صحافیوں کو بتایا گیا کہ ہم نے بدمزگی سے بچنے کے لئے یہ فیصلہ قبول کرلیا ہے، لانگ مارچ منسوخ نہیں بلکہ ملتوی ہوا ہے۔

وزیراعظم نواز شریف کے مشیر اور معاون ڈاکٹر فاروق حسن نے 16 جولائی کو لندن میں کہا کہ انتخابات کرانے پر تو اتفاق ہوگیا ہے لیکن عنقریب انتخابات کی بات قبل از وقت ہے۔ فوج کی شٹل ڈپلومیسی کے نتیجے میں مذاکرات کا ایک عمل شروع ہوا ہے جس میں بینظیر بھٹو بھی شریک ہوگئی ہیں۔ انتخابات کے بارے میں ابھی کوئی فارمولا طے نہیں پایا ہے۔ وفاقی وزیر چوہدری نثار نے کہا کہ حکومت کے خلاف سازش دراصل جمہوریت کے خلاف سازش ہے۔ فاروق حسن کے بیان سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ نواز شریف نے نئے انتخابات کرانے پر اپنی رضامندی دے دی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ انتخابات جلد نہیں بلکہ تاخیر سے ہوں گے ایک لاحاصل بات تھی۔ اب وقت کا تعین نواز شریف کے اختیار میں نہیں تھا۔

16 جولائی کو بینظیر بھٹو نے صدر غلام اسحٰق خان سے ملاقات کی، جوڈھائی گھنٹے جاری رہی بینظیر بھٹو نے اس ملاقات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ جنرل وحید اور بینظیر بھٹو کے درمیان بھی دوبارہ ملاقات ہوئی جس میں فارمولے پر عملدرآمد کے بارے میں گفتگو ہوئی، اسی دن جنرل وحید نے صدر سے طویل ملاقات کر کے تبادلہ خیال کیا۔ صدر اور جنرل وحید سے ملاقاتوں کے بعد فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے بینظیر بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی، شام کے وقت بینظیر بھٹو اپنے گھر سے خفیہ مقام کی جانب روانہ ہوگئیں۔ ان کے اسٹاف سمیت کسی کے علم میں یہ نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہیں۔ یہ قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ وہ امریکی سفارت خانے گئی ہیں یا صدر سے دوبارہ ملنے گئی ہیں اور یا حساس ادارے کے بلانے پر گئی ہیں۔

16 جولائی کو وسیم سجاد نے صدر سے ملاقات کر کے ملکی صورتِ حال اور طے پانے والے سیاسی فارمولے کے تناظر میں تبادلہ خیال کیا۔ وزیر اعلیٰ وٹو نے بھی صدر سے دو گھنٹے تک ملاقات کی اور آئندہ کی حکمت عملی کے بارے میں بات چیت کی۔ وٹو نے کہا کہ بینظیر بھٹو نے پنجاب کے حکومتی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ صدر غلام اسحٰق خان نے روئیداد خاں، طارق چوہدری اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ رخصت پر جا رہے ہیں اور اگلا صدارتی انتخاب نہیں لڑیں گے۔

16 جولائی کو سرحد کے گورنر امیر گلستان جنجوعہ کسی اہم مشن پر پشاور سے اسلام آباد پہنچے جہاں انہوں نے پنجاب کے گورنر چوہدری الطاف حسین سے طویل ملاقات کی۔

16 جولائی کو پانچویں دن بھی کراچی اور حیدرآباد میں شدید ہنگامے جاری رہے۔ اس صورتِ حال پر بات چیت کرنے کے لئے صدر غلام اسحٰق خان نے اشتیاق اظہر، فاروق ستار اور آفتاب شیخ کو اسلام آباد طلب کرلیا۔

16 جولائی کو نواز شریف نے اپنی کابینہ کے ارکان کو سہ فریقی مذاکرات کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ صدر کا مطالبہ تھا کہ نئے انتخابات کرائے جائیں جس پر میں نے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ جب تک آپ صدر ہیں، ملک میں عام انتخابات نہیں ہو سکتے۔ کوئی پریشانی یا اضطراب کی بات نہیں ہے۔ لیکن نواز شریف نے اس طرح یہ بات تو مان لی کہ اگر صدر اپنے عہدہ پر موجود نہ رہیں تو انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ 16 جولائی کو یہی بات بی بی سی نے اپنی نشریات میں کہی کہ صدر کے رُخصت پر جانے پر رضامند ہونے کے بعد نواز شریف کو انتخابات

پر راضی ہونا پڑ گیا۔ 16 جولائی کو نواز شریف نے صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اپوزیشن کا پیدا کردہ سیاسی بحران مصنوعی بحران ہے۔ میں اسے حل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں جس پر فاروق لغاری نے کہا کہ طے شدہ فارمولے پر عمل کرانا فوج کی ذمہ داری ہے۔ 16 جنوری کو وائس آف جرمنی نے کہا کہ قومی اسمبلی کی تحلیل اور انتخابات کا اعلان 17 جولائی کو متوقع ہے۔

o

16 جولائی کی رات کو اقتدار کے تین ستونوں صدر غلام اسحٰق خان، وزیر اعظم نواز شریف اور جنرل وحید کے درمیان گزشتہ 24 گھنٹوں میں دوسری بار ملاقات ہوئی جوڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ اعتراضات، ذہنی تحفظات اور متضاد موٴقف سامنے آنے کے باعث یہ اجلاس نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا۔ اس میں صدر اور وزیر اعظم کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ انتخابات کرانے پر اتفاق رائے کے باوجود اس کی تفصیلات پر اختلاف رائے موجود تھا۔ صدر کا کہنا تھا کہ پہلے نگران وزیر اعظم اور صوبوں سے متعلق سارے معاملات طے کئے جائیں، اس سے قبل رخصت پر جانا اور استعفیٰ دینا ان کی بے عزتی ہے۔ صدر نواز شریف کو نگران وزیر اعظم بنانے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ لیکن نواز شریف کا کہنا تھا کہ جب وہ خود نئے انتخابات کا اعلان کریں گے تو نگران وزیر اعظم بھی ان ہی کو ہونا چاہیے۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ رخصت پر جانے کے بجائے صدر فوری طور پر مستعفی ہوں۔ اگر ہم ڈھائی سال پہلے جانے کے لئے تیار ہیں تو صدر چار ماہ قبل کیوں نہیں جا سکتے۔ یہ ملاقات کل تک کے لئے ملتوی کر دی گئی، ادھر بینظیر بھٹو نے بھی وسیم سجاد کو قائم مقام صدر کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

17 جولائی کو ایوانِ صدر سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ منظور وٹو نے ان سے ملاقات کر کے کہا کہ اپوزیشن کو آئندہ انتخابات کے بارے میں آپ کی قیادت پر اعتماد ہے۔ اس لئے آپ نہ استعفیٰ دیں اور نہ ہی رُخصت پر جائیں۔ صدر نے روئیداد خاں اور عزیز منشی سے صلاح مشورے کئے۔ اشتیاق اظہر کی قیادت میں ایم کیو ایم کے ایک وفد نے صدر سے ملاقات کی۔ محمود ہارون، گورنر الطاف حسین اور جوگزئی نے بھی صدر سے ملاقاتیں کیں۔ میر افضل نے جنرل وحید سے ملاقات کر کے کہا کہ صدر سے استعفیٰ طلب نہ کیا جائے کیونکہ انہیں اپوزیشن کی مکمل حمایت حاصل کی۔ اسی طرح وزیر اعظم نواز شریف کے مشیروں نے ان سے کہا کہ حکومت کو اپنی آئینی

مدت پوری کرنے کا جمہوری حق حاصل ہے۔ قبل از وقت اسمبلی توڑنے کا کوئی جواز نہیں۔ آپ کسی دباؤ کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں۔ بحران کا واحد حل اسحٰق خان کی اقتدار سے فوری علیحدگی ہے۔

17 جولائی کو بینظیر بھٹو نے پیپلز پارٹی کی مجلس عاملہ کو جنرل وحید کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور کہا کہ ہم نے لانگ مارچ کے بغیر ہی اس کے مقاصد حاصل کر لئے ہیں۔ قوم جلد خوشخبری سنے گی۔ فوج نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ تین چار روز کے اندر غیر جانبدار سسٹم سامنے آجائے گا۔ ہم نے فوج کی تجویز پر لانگ مارچ کو منسوخ نہیں بلکہ ملتوی کیا ہے۔ اسے بہانہ بنا کر اگر کوئی ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہتا ہے تو ہم اسے جانے کے لئے گاڑی کی سہولت بھی فراہم کر دیں گے۔ اے پی سی کی بعض جماعتوں نے نواز شریف سے خفیہ رابطے قائم کر لئے ہیں۔ ہمیں کسی ایسے سہارے کی ضرورت نہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ آپ لوگ انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اجلاس نے لانگ مارچ ملتوی کرنے کے بینظیر بھٹو کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

17 جولائی کو حامد ناصر چٹھہ نے بھی کہا کہ نواز شریف جا رہے ہیں، اب خواہ کوئی وزیر اعظم بن جائے۔

17 جولائی کو سکھر، حیدر آباد، نواب شاہ اور سکرنڈ میں بموں کے زبردست دھماکے ہوئے حیدر آباد میں پولیس پر بھی بم سے حملہ کیا گیا۔ 17 جولائی کو لاہور ہائی کورٹ میں پنجاب اسمبلی دوبارہ توڑنے کے خلاف مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔ اس دوران چیف جسٹس نے کہا کہ سیاسی معاملات اب عدالت میں نہیں بلکہ دوسرے پلیٹ فارم پر طے ہو رہے ہیں۔

ہفتہ 17 جولائی کو نواز شریف کی صدارت میں وفاقی کابینہ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں انہوں نے گزشتہ چار دنوں میں صدر سے ہونے والی پانچ ملاقاتوں اور جنرل وحید کے ساتھ چار ملاقاتوں کی تفصیلات بتائیں۔ کابینہ کے ارکان نے نواز شریف سے کہا کہ ہمیں آپ کی بے باک اور ولولہ انگیز قیادت پر مکمل اعتماد ہے۔ سپریم کورٹ کے 26 مئی کے فیصلے کے بعد صدر نے اپوزیشن کے ساتھ مل کر مصنوعی بحران پیدا کرنا شروع کر دیا۔ منتخب حکومت کو دھونس، دھاندلی اور دباؤ کے ذریعے ختم کیا جا رہا ہے، ہم انتخابات سے نہیں گھبراتے اور ڈھائی سال کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔

صحافیوں سے بات کرتے ہوئے نواز شریف نے کہا کہ قوم پر مصنوعی بحران مسلط کیا گیا ہے اس مرتبہ فوج کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی ہے، ہم نے بردباری کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسمبلی توڑنے کا مشورہ دینے کے لئے میں آئینی راستہ اختیار کروں گا۔ نواز شریف کے ایک معتمد صحافی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اسمبلی نہ توڑیں اور اپنے اس مؤقف سے صدر اور فوج کو آگاہ کر دیں لیکن وہ اس مشورہ پر عمل نہیں کر سکے۔

پاکستان مسلم لیگ کے رہنماؤں نے آئندہ متوقع انتخابات کی حکمت عملی پر بات چیت شروع کر دی۔ سب کا اس پر اتفاق تھا کہ مسلم لیگ کو اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس کرنا چاہئے۔ وہ اس پر متفق تھے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کو نئے سرے سے منظم کیا جائے۔ اگر آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ اور مذہبی جماعتوں میں مقابلہ ہوا تو پنجاب میں مسلم لیگ قومی اسمبلی کی تقریباً تیس نشستوں پر انتخاب ہار جائے گی۔ اس گفتگو کی روشنی میں نواز گروپ نے 9 جماعتوں پر مشتمل نئے اتحاد کے قیام کے لئے کوششوں کا آغاز کر دیا۔ جس میں مسلم لیگ، عوامی نیشنل پارٹی، ایم کیو ایم، پاکستان نیشنل پارٹی، پختونخواہ، سندھ نیشنل فرنٹ، جمعیت علماء پاکستان اہل حدیث اور جمعیت مشائخ شامل ہوں گی۔ جماعت اسلامی کا نام اس مجوزہ اتحاد میں شامل نہیں کیا گیا۔

ہفتہ 17 جولائی کو سیاسی بحران حل کرنے کے ضمن ایک اہم اور فیصلہ کن اجلاس ایوانِ صدر میں منعقد ہوا جس میں صدر، وزیر اعظم اور جنرل عبدالوحید نے شرکت کی۔ یہ اجلاس ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ ان مذاکرات میں پہلی مرتبہ راولپنڈی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل غلام محمد ملک اور جنرل شمیم عالم نے بھی شرکت کی اور دونوں مختلف مراحل میں آرمی چیف کی معاونت کرتے رہے۔ اس ملاقات میں صدر اور وزیر اعظم کے درمیان چپقلش اپنے عروج پر تھی، کسی موقع پر بھی کوئی ہم آہنگی ان کے درمیان دیکھنے میں نہیں آئی۔ نواز شریف نے صدر سے کہا کہ ہماری جدوجہد کا آغاز ایوانِ صدر سے آپ کی رخصتی پر ہوگا۔ یہ خیال آپ دل سے نکال دیں کہ اس مرتبہ قومی اسمبلی توڑنے کے بعد بھی آپ ایوانِ صدر میں براجمان رہیں گے۔ ملک کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوگا کہ کسی صدر کو اسمبلی توڑنے کی خود بھی قیمت چکانا پڑی ہو۔ اس اجلاس کی تفاصیل سرکاری طور پر تو لوگوں کے سامنے نہیں لائی گئی لیکن مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئی، ان کے مطابق نواز شریف کا اصرار تھا کہ پہلے صدر غلام اسحٰق خان اپنے عہدہ سے مستعفی ہوں جس پر

صدر نے اپنا استعفیٰ تحریر کر کے جنرل وحید کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد نواز شریف اپنے وعدہ کے مطابق مجبور تھے کہ وہ قومی اسمبلی توڑنے کی ایڈوائس دیں۔ لیکن جزئیات میں ابھی اختلافات موجود تھے۔ صدر کے ساتھ نواز شریف کا بھی اصرار تھا کہ وہ قوم سے خطاب کریں گے۔ فوجی حکام نے انہیں محض ایک رسمی تقریر کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن نواز شریف کا کہنا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق بھرپور سیاسی تقریر کریں گے۔ ایک موقع پر نواز شریف گفتگو کو غیر مکمل چھوڑ کر اجلاس سے اُٹھ کر جانے لگے تو جنرل غلام محمد ملک نے انہیں بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا اور کہا اب آپ طے شدہ نکات کو آخری شکل دیئے بغیر نہیں جا سکتے۔ اس طرح اسی نشست میں اسمبلی توڑنے، صدر کے استعفیٰ، عام انتخابات کے ٹائم ٹیبل اور صوبائی حکومتوں کے بارے میں متفقہ نکات کو دستاویز کی شکل دے دی گئی۔

o

اتوار 27 محرم 1414ھ بمطابق 18 جولائی 1993ء، وزیر اعظم نواز شریف نے قومی اسمبلی توڑنے کے لئے صدر مملکت کے نام اپنی ایڈوائس پر دستخط ثبت کر کے خود ہی اسے صدر کو پیش کر دیا۔ یہ ایڈوائس ملتے ہی صدر نے قومی اسمبلی توڑنے کے فرمان پر دستخط کر دیئے۔ جس کے بعد نواز شریف ایوانِ صدر سے چلے گئے۔ قومی اسمبلی توڑنے کے بارے میں صدر کے فرمان کا متن درج ذیل ہے۔

''ہر گاہ کہ مجھے غلام اسحٰق خان صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کو مسٹر محمد نواز شریف وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان نے آئین کے آرٹیکل 58(1) کے تحت قومی اسمبلی تحلیل کرنے کے لئے کہا ہے۔ اس لئے میں غلام اسحٰق خان صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آرٹیکل 58(1) کے اختیارات کے تحت قومی اسمبلی فوری طور پر تحلیل کرتا ہوں اور وزیر اعظم اور کابینہ فوری طور پر اپنے عہدوں سے برطرف ہیں۔'' صدر نے اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات 6 اکتوبر 1993ء اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 9 اکتوبر 1993ء کو ہوں گے۔

o

معین قریشی آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد 18 جولائی کی رات کو سنگاپور سے کراچی ائیر پورٹ پہنچے۔ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے وہ گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر اسلام آباد ائیر پورٹ پہنچے اور گیارہ بج کر چالیس منٹ پر ایوانِ صدر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پہلے ایک علیحدہ کمرے میں صدر غلام اسحٰق خان اور مسلح افواج کے سربراہوں سے ملاقات کی اور پھر نصف شب کو نگران وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ صدر غلام اسحٰق خان نے ان سے حلف لیا، اس تقریب کے بعد صدر غلام اسحٰق خان نے عہدہ صدارت سے الگ ہونے کی دستاویز پر دستخط کئے اور اس کے ساتھ ہی چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ سبکدوش صدر غلام اسحٰق خان قائم مقام صدر وسیم سجاد کو لے کر صدارتی چیمبر میں گئے، وسیم سجاد صدارتی کرسی پر بیٹھے اور غلام اسحٰق سامنے والی کرسی پر۔ چند منٹ کے بعد غلام اسحٰق خان نے اجازت چاہی تو قائم مقام صدر وسیم سجاد انہیں رخصت کرنے کے لئے ایوانِ صدر کے باہر والے دروازے تک آئے۔ کرسیِ اقتدار نہ پائیدار ہے اور کسی کے لئے ہمیشگی کی ضامن۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی دو اہم ترین شخصیتیں غلام اسحٰق خان سابق صدر ہو گئے اور نواز شریف سابق وزیر اعظم۔ اس موقع پر سیاسی مبصرین نے بالکل درست کہا کہ نواز شریف تو جیتی بازی ہار گئے اور بے نظیر بھٹو نے صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات کا فائدہ اُٹھا کر ایک تیر سے دو شکار کر لئے۔

قائم مقام صدر وسیم سجاد نے کہا کہ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ملک کے شدید سیاسی بحران کا آئین کے اندر رہتے ہوئے حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ افواجِ پاکستان نے اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے، ہمیں اپنی غلطیوں کا جائزہ لینا چاہئے، میں ملکی مسائل کے حل اور انتخابات کے سلسلے میں سینٹ کے ارکان سے رہنمائی حاصل کروں گا۔ اسی دن ایوان صدر میں بینظیر بھٹو نے قائم مقام صدر سے ملاقات کی اور انتخابات کے بارے میں گفتگو کی۔

19 جولائی کو نواز شریف نے نگراں وزیر اعظم سے ملاقات کر کے ملکی سیاسی صورتِ حال، قومی اُمور اور اقتصادی پالیسوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ اس ملاقات کے بعد صحافیوں سے بات کرتے ہوئے معین قریشی نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ملک کے لئے کچھ کر سکوں۔ انتخابات ہماری اوّلین ترجیح ہیں۔ انتخابی عمل شفاف ہوگا۔ ہر شخص کو ان میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی۔ نگراں کابینہ مختصر اور غیر سیاسی ہوگی۔

کابینہ کے ارکان انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ میں قوم کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔

o

19 جولائی کو بینظیر بھٹو نے اپنی ہم خیال جماعتوں کے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں مسلم لیگ چٹھہ گروپ، این ڈی اے اور پی ڈی اے میں شامل جماعتوں نے شرکت کی۔ اجلاس میں انتخابات سے متعلق اہم فیصلے کیے گئے۔ اجلاس کے بعد ایک پرہجوم سے خطاب کرتے ہوئے بینظیر بھٹو نے عوام کو ان کی طویل جدوجہد کے بعد نئی نگراں حکومت کے زیرنگرانی عام انتخابات کے اعلان پر مبارکباد دی۔ انہوں نے عوام کو اپنی اس کٹھن اور طویل جدوجہد میں ساتھ دینے پر خراج تحسین پیش کیا۔ جو انہوں نے دھاندلی کی پیداوار اسمبلیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے شروع کی تھی۔ انہوں نے عوام سے اس جدوجہد کو جاری رکھنے کی اپیل کی تاکہ پاکستان کو باوقار ملک بنایا جاسکے۔ بینظیر بھٹو نے اپنی اتحادی جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن 16 اکتوبر کو کرائے جائیں۔ اس سے اخراجات میں 50 فیصد کمی ہوگی، اسمگلنگ کی رقوم استعمال کرنے پر پابندی لگائی جائے۔ بلدیاتی ادارے توڑے جائیں، کردارکشی روکنے کے لئے انتخابی ضابطہ اخلاق مرتب کیا جائے۔ سیاسی جماعتوں کے قانون میں ترمیم کی جائے۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ ایم کیوایم کے معتدل گروپ سے اتحاد کی بات چیت جاری رہے گی۔

19 جولائی کو وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد میں مسلم لیگ، اپنی حلیف جماعتوں، سینٹروں اور سابق ارکان قومی اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نواز شریف نے کہا کہ ہم نے سازشیوں اور غداروں کے لئے اپنے دروازے بند کردیے ہیں۔ عوام ایک مرتبہ پھر سازشیوں اور جمہوریت کے دشمنوں کو مسترد کردیں گے۔ ہم دوسری جماعتوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہیں۔ جیت انشاءاللہ ہماری ہوگی۔ اس اجلاس میں تین نکاتی انتخابی حکمت عملی طے کی گئی۔ اول یہ کہ سابق صدر کو ہدف بنایا جائے گا۔ دوئم بینظیر بھٹو کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جائے گی اور سوم یہ کہ انتخابات میں دوتہائی اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ انتخابات کے لئے اسلامی جمہوری اتحاد کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے دوسرے دورِ حکومت کا آغاز دسمبر 1993ء میں ہوا جب وہ اسٹیبلشمنٹ کی بے پناہ سازشوں کا مقابلہ کرنے کے بعد بالآخر وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوگئیں۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کی سب سے بڑی بھول کی اور اپنے قریبی ساتھی سردار فاروق احمد خان لغاری کو ملک کا صدر بنادیا۔ انہیں اُمید تھی کہ ساری زندگی ان کے وفادار رہنے والے صدر لغاری کم از کم ان کے خلاف آٹھویں ترمیم کی تلوار نہیں چلائیں گے لیکن وہ یہ بھول گئیں کہ سردار لغاری ایک جاگیردار بھی ہے۔ جس سے خیر کی توقع نہیں تھی وہی ہوا۔ 5 نومبر 1996ء کو سردار فاروق احمد خان لغاری نے ان کی بغل میں خنجر گھونپ کر ان کی حکومت ختم کردی۔ یہ دوڈھائی سالہ دور اقتدار اس لحاظ سے ان کی زندگی کا روگ بنا رہا کہ ان کا سگا بھائی میر مرتضیٰ بھٹو ان کے دورِ حکومت میں پولیس گردی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ایک بہن جس کا جوان بھائی مارا جائے وہ ملک کی وزیراعظم ہو اور بے بسی کی تصویر بن کر رہ جائے، اس کے کرب کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ افسوس! محترمہ بینظیر بھٹو نے ساری زندگی وطن کی محبت میں وطن دشمنوں سے لڑتے ہی گزار دی اور بالآخر ان کے ہاتھوں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

■ ■ ■

اگر مجھے کچھ ہو جائے!

30 دسمبر 2007ء کو آصف زرداری شریک چیئرپرسن پیپلز پارٹی نے نوڈیرو میں کہا کہ پیپلز پارٹی نے مارک سیگل کے اس بیان کی توثیق کر دی ہے جس میں انہوں نے بینظیر بھٹو کی ایک ای میل کا ذکر کیا تھا۔ اس ای میل میں بینظیر بھٹو نے لکھا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار مشرف ہوں گے۔ اس ای میل کی خبر سی این این نے سب سے پہلے نشر کی تھی۔ خبر کے مطابق بینظیر بھٹو نے یہ ای میل اپنی سیکورٹی کے حوالے سے ایک مصالحت کار کے ذریعے سی این این کے وولف بلٹزر کو بھیجی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ اسے صرف اسی وقت منظر عام پر لایا جائے جب انہیں مار دیا جائے۔ بینظیر بھٹو نے ای میل میں لکھا ''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو اس کے ذمہ دار صدر پرویز مشرف ہوں گے۔'' مسٹر وولف بلٹزر کو یہ ای میل 26 اکتوبر کو مارک سیگل کے توسط سے موصول ہوئی۔ مارک سیگل بینظیر بھٹو کے دوست اور کافی عرصے سے واشنگٹن میں ان کے ترجمان ہیں۔ بینظیر بھٹو نے یہ ای میل 18 اکتوبر کو وطن واپسی پر کراچی بم دھماکوں میں بچ جانے کے 8 روز بعد لکھی۔ بینظیر بھٹو نے بلٹزر کو لکھا ''میں خود کو مشرف کے منظور نظر افراد سے غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں، میرے لئے خاطر خواہ سیکورٹی انتظامات نہیں کیے گئے اور صدر اس کے ذمہ دار ہیں۔'' بلٹزر نے بتایا کہ اس نے ای میل کو دیکھنے کے تھوڑی دیر بعد سیگل کو فون کیا اور کہا کہ کیا وہ اسے سی این این پر نشر کر سکتا ہے لیکن سیگل نے اسے سختی سے کہا کہ اسے صرف اسی وقت ہی استعمال کیا جا سکتا ہے اگر بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا جائے۔ بلٹزر نے جمعرات کی رات کو ای میل ان الفاظ کے ساتھ رپورٹ کر دی کہ بینظیر بھٹو نے اس میں اپنے لئے سیکورٹی خطرات کا ذکر کیا ہے اور اس پر امریکی حکومت کو ان کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے مداخلت کرنی چاہئے۔ اس نے کہا کہ میرا یہ خیال نہیں تھا کہ ہم کوئی خبر مس کریں گے اور میرا نہیں خیال کہ ناظرین سے اس کو محروم رکھنا جائز ہے۔ بہرحال

اس نے یہ ای میل نیویارک کے ایک ڈیموکریٹ رہنما سٹیو اسرائیل کو بھی بھیجی۔ سیگل نے کہا کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ ای میل لکھنے کے بعد بینظیر بھٹو کے خیالات بدل گئے ہوں۔ اس پیغام میں خاص طور پر اس طرف نشاندہی کی گئی تھی کہ انہوں نے چار پولیس گاڑیوں کی درخواست کی تھی جو سفر کے دوران ان کی گاڑی کا حصار بنا لیں۔ سیگل نے کہا کہ سانحہ کے موقع پر لی گئی تصاویر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی اس درخواست کو قبول نہیں کیا گیا۔ سیگل نے کہا کہ بینظیر بھٹو لازمی طور پر یہ نہیں سمجھتی تھیں کہ مشرف انہیں قتل کرانا چاہتے ہیں تاہم وہ یہ ضرور محسوس کرتی تھیں کہ مشرف کے اردگرد موجود لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ جمعرات کو جب بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا تو ان کے شوہر آصف زرداری نے سیگل سے رابطہ کیا اور انہیں ای میل جاری کرنے کی بات یاد دلائی۔

(روزنامہ ایکسپریس 31 دسمبر 2007ء)

اس روز امریکی ایوان نمائندگان کی سپیکر نینسی پلوسی نے بھی بینظیر بھٹو کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موت کی تحقیقات بین الاقوامی ٹیم کے ذریعے کروائی جائیں تاکہ شہادت کے صحیح محرکات کا علم ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ صدر مشرف کی طرف سے قتل کی تحقیقات کے لئے بین الاقوامی مدد لینے سے انکار اور گزشتہ دنوں امریکہ کی طرف سے پاک فوج کو دی جانے والی امداد نہ پہنچنے جیسی رپورٹ سے شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ جن شرائط پر پاکستان کو امداد دی گئی ہے وہ پوری کی گئی ہیں یا نہیں، اس بارے میں پاکستان سے پوچھ گچھ ہونی چاہئے۔ صدر بش پاکستان پر انتخابات شفاف بنانے پر زور دیں۔ ادھر وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے ٹونی فیٹو نے ٹیکساس میں سٹرافورڈ کے مقام پر کہا کہ انتخابات کی تاریخ سے متعلق کوئی بھی فیصلہ پاکستانی حکام کو کرنا ہے تاہم یہ آزادانہ اور منصفانہ ماحول میں ہونا چاہئیں۔ تمام جماعتوں اور امیدواروں کو کھلے ماحول میں شرکت کا موقع ملنا چاہئے۔ ترجمان نے کہا کہ حکومت پاکستان بینظیر بھٹو کے قتل کی جامع تحقیقات کرائے جس پر عوام اعتماد بھی کریں۔ امریکہ کو حکومت پاکستان کی جانب سے قتل کی تفتیش کے لئے تعاون فراہم کرنے کی درخواست نہیں ملی، ایسا ہوا تو غور کیا جائے گا۔ پاکستانی عوام بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد موجودہ حالات کے تناظر میں اپنا فیصلہ کریں گے۔ ادھر نیویارک سے تعلق رکھنے والی امریکی ایوان نمائندگان کی ڈیموکریٹک خاتون رکن کرسٹن گلی برینڈ نے اپنے ہفتہ وار ریڈیو خطاب میں کہا کہ عراق میں

موجود امریکی فوج کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لئے پاکستان اور افغانستان میں تعینات کیا جائے۔

O

اسی روز برطانوی وزیراعظم کے ترجمان کے حوالے سے یہ خبر بھی سامنے آئی کہ صدر جنرل مشرف نے اس ضمن میں بیرونی ماہرین کی مدد لینے پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ ایک نجی ٹی وی نے لندن میں اپنے نمائندے کے حوالے سے بتایا کہ برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے صدر مشرف سے فون پر بات چیت کی ہے جس کے نتیجے میں صدر مشرف بینظیر بھٹو کیس میں بین الاقوامی ماہرین کی مدد لینے پر تیار ہوگئے ہیں۔ ٹی وی کے مطابق اُمید کی جارہی ہے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم اگلے چند دنوں میں برطانیہ سے پاکستان جائے گی۔ ذرائع کے مطابق پیپلز پارٹی کے ایک سینئر رکن برطانوی حکومت کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لئے لندن میں موجود ہیں تاہم ان کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ ترجمان کے مطابق وزیراعظم گورڈن براؤن نے صدر مشرف پر زور دیا کہ پاکستان میں عام انتخابات 8 جنوری کو ہی کرائے جائیں اور اس سلسلہ میں تاخیر نہ کی جائے۔ دونوں رہنماؤں نے بینظیر بھٹو کے قتل کیس کی پاکستانی تحقیقات میں بھرپور عالمی تعاون کی تجویز پر مزید غور کے لئے رضامندی ظاہر کی۔ ادھر برطانوی وزیر خارجہ ڈیوڈ ملی بینڈ نے بینظیر بھٹو کے قتل پر پاکستانی ہائی کمشن میں تعزیتی کتاب میں اپنے تاثرات درج کرنے کے بعد ذرائع ابلاغ سے کہا کہ برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ پاکستان میں مکمل جمہوریت بحال ہو۔ نگران وزیراعظم محمد میاں سومرو کے ساتھ فون پر اپنی گفتگو میں تحقیقات کے لئے برطانوی حکومت اوراس کے اداروں کے مکمل تعاون کی پیشکش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں فرانس کے صدر نکولس سرکوزی نے بھی صدر پرویز مشرف کو ٹیلی فون پر دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں کردار پر تحسین اور محترمہ بینظیر بھٹو کی المناک موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں جلد پاکستان کا دورہ کروں گا جبکہ آئندہ چند روز میں وزیر خارجہ کو بھی بھیجا جائے گا۔

(روزنامہ ایکسپریس۔ 31 دسمبر 2007ء)

اس کے برعکس 31 دسمبر ہی کے اخبارات نے یہ خبر بھی نگران وزیر داخلہ حامد نواز خان کے حوالے سے جاری کی کہ پاکستانی حکومت بینظیر بھٹو کیس میں عالمی مدد حاصل کرنے کا مطالبہ

کسی صورت میں تسلیم نہیں کرے گی۔ نجی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے بریگیڈیئر (ر) حامد نواز نے کہا کہ پاکستان ایک خودمختار ملک ہے اور ہم اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ بین الاقوامی ماہرین سے بینظیر بھٹو کیس کی تفتیش کرانے کی تجویز قابل قبول نہیں۔ اس سے ایک بری مثال قائم ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کیس میں اس قسم کی ٹیم کیوں نہیں منگوائی گئی تھی۔

O

30 دسمبر 2007ء کو بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ بھٹو خاندان سے زیادہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ قابل رحم ہے۔ بیچارے گزشتہ 40 سال سے سائے کو تلوار سے کاٹنے میں لگے ہیں۔ بھٹو خاندان میں کسی کی طبعی موت نہیں ہوئی لیکن کوئی زہر کھانے سے مرے، کوئی گولی کھانے، پھانسی لگنے سے یا پھر گولیوں سے چھلنی ہو جائے، وہ دفنائے جانے کے فوراً بعد پہلے سے بھی زیادہ لمبے قد وقامت کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کو اور ڈراتا ہے، وہ کمبل ہے جس سے جتنا جان چھڑانے کی کوشش کی جائے اتنا ہی لپٹتا چلا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو خاندان حصولِ اقتدار اور ذاتی جاہ چشم کے لئے عام آدمی کو بڑی خوبصورتی سے بیوقوف بنا کر استعمال کرنے میں بے مثال مہارت رکھتا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ معاملہ غالباً اُلٹا ہے، بھٹو خاندان عوام کو نہیں بلکہ بھٹو خاندان کو اپنی ازلی محرومیاں واضح کرنے کے لئے بڑی معصومانہ چالاکی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس ملک پر ہر قیمت پر پنجے گاڑ کر رکھنے والے اگر واقعی بھٹو خاندان اور اس کی سیاست سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو اب انہیں پھانسی یا قتل کے ناکام طریقے کے بجائے ایک اور فارمولا استعمال کرنا چاہئے۔ عوام کو جی ڈی پی، میگا پروجیکٹس، پرائس انڈیکس، مائیکرو اور میکرو اکنامک مینجمنٹ، اوسط آمدنی، اسلام، لبرل ازم اور اعتدال پسندی کے نام پر مداری پن سے محظوظ کرنے کے بجائے روٹی، کپڑا، مکان، روزگار، تعلیم اور صحت دے دیجئے اور کسی بیرک کی زنگ آلود الماری سے جمہوریت کی غصب شدہ امانت لوٹا دیجئے۔ بھٹو خاندان کا جن بوتل میں بند ہو جائے گا ورنہ آپ کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ موجود رہے گا۔

O

30 دسمبر ہی کو ٹیوٹا کمپنی کے حکام نے حکومت کے اس دعویٰ کی سختی سے تردید کردی کہ بینظیر بھٹو کی شہادت گاڑی کا سن روف لیور لگنے سے ہوئی۔ خیال رہے کہ شہادت کے وقت محترمہ بینظیر بھٹو ٹیوٹا کمپنی کی لینڈ کروزر گاڑی میں سوار تھیں۔

(نوائے وقت۔ 31 دسمبر 2007ء)

30 دسمبر ہی کو آصف زرداری نے محترمہ بینظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی جس میں انہیں جانشین مقرر کیا گیا تھا لیکن انہوں نے بینظیر بھٹو کے صاحبزادے بلاول کو چیئرمین بنانے کا اعلان کیا اور خود شریک چیئرمین بنے۔ انہوں نے بتایا کہ بینظیر بھٹو نے پارٹی پر وزن ڈالنے کے بجائے مارک سیگل کو ای میل بھجوا کر اس بات کا یقین کردیا تھا کہ اگر انہیں شہید کیا گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ انہوں نے بینظیر بھٹو کا قاتل گورباچوف بنا چاہتا ہے کارکن حکومت کی ''قاتل لیگ'' کو دفن کردیں۔

(روزنامہ جنگ۔ 31 دسمبر 2007ء)

زرداری نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پارٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ پارٹی آٹھ جنوری کو بھرپور الیکشن میں حصہ لے گی اور مؤخر کرنا قبول نہیں کریں گے۔ میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے رہنما میاں نواز شریف سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ انتخابات میں حصہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان کی جانب سے ہماری حمایت میں انتخابات کے بائی کاٹ کے اعلان پر ان کا خیرمقدم کرتے ہیں تاہم ملک کے مفاد میں یہی ہے کہ ہم انتخابات میں جائیں یہی محترمہ بینظیر بھٹو کی بھی خواہش تھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی تحقیقات کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ لبنان کے سابق وزیراعظم رفیق حریری کی شہادت کی تحقیقات کی طرح ٹریبونل مقرر کرے۔ انہوں نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ بھی اس سلسلے میں ہماری مدد کرے۔ انہوں نے کہا کہ جب یہ اقوام متحدہ کا ٹریبونل اپنی سفارشات پیش کرے گا اور جو رپورٹ پیش کرے گی اس کی روشنی میں ہم محترمہ کی شہادت پر ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ آصف علی زرداری نے مزید کہا کہ وہ پورے پاکستان کے عوام کو اپنا فیصلہ بتا رہے ہیں ہمارا یہ فیصلہ ایک جمہوری پاکستان کو بچانے کے لئے ہے۔ بی بی صاحبہ اور ذوالفقار علی بھٹو نے مرتے دم تک ملک توڑنے کی بات نہیں کی تو ہم ان دوستوں سے معذرت کرتے ہیں جو اتنے غمزدہ ہیں کہ اب بی بی شہید کے مزار پر یہ نعرہ لگایا کہ پاکستان باقی نہیں بچے گا۔ میں ان تمام دوستوں کو کہتا ہوں کہ

پاکستان قائم رہے گا، پاکستان قائم رہے گا، پاکستان قائم رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اس خط کو اقوامِ متحدہ بھجوایا ہے جو شہید بی بی نے اپنی شہادت سے پہلے مارک سیگل کو لکھا تھا اور اس پر پارٹی کے وکلاء نے یہ مشورہ دیا ہے کہ یہ ان کا نزاعی بیان ہے اور اسے ایسے ہی قبول کیا جائے اور اس پر اقوام متحدہ کی ٹیم بلائی جائے اور حریری کمشن کی طرح انوسٹی گیشن کی جائے نیز اس کمشن کی جو رپورٹ ہوگی اس کی روشنی میں ہم اپنی ایف آئی آر داخل کرائیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پارٹی انتخابات میں بھرپور حصہ لے گی اور انشاء اللہ انتخابات میں کامیاب ہوگی اور اپنی رہنما بینظیر بھٹو شہید کا بدلہ جمہوریت قائم کر کے لے گی۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن بی بی صاحبہ نے پہلی بار وزیر اعظم کا حلف اُٹھایا تھا اس دن انہوں نے کہا کہ آج میں نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کو شہید کرنے کا بدلہ لے لیا ہے۔ انشاء اللہ جب پیپلز پارٹی کی حکومت بنے گی تو ہم بھی محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کا بدلہ لے چکے ہوں گے۔ ہم یہ بدلہ کسی کو مار کر نہیں بلکہ جمہوریت بحال کر کے ان کے مقاصد کو آگے بڑھا کر لیں گے۔ بی بی کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی قربانی حسین کی قربانی کی طرح شہدائے کربلا کی قربانیوں کی طرح ہمیشہ رنگ لائے گی۔ انہوں نے کہا کہ میرے دوستو! پیپلز پارٹی نے پہلا فیصلہ یہ کیا ہے، دوسرا فیصلہ ہم نے الیکشن میں جانے کا کیا ہے اور تیسرا فیصلہ ہم عوام سے اپیل کرتے ہیں کے اپنے غم وغصہ کو برداشت کریں اور اسے ووٹ کی طرف تبدیل کردیں اور تیر پر ٹھپہ لگا کر بی بی کی شہادت کا بدلہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ بی بی کہا کرتی تھیں کہ ''ٹھپے پہ ٹھپہ تیر پہ ٹھپہ'' لگا کر ہم ملک میں جمہوریت بحال کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ بی بی صاحبہ نے ہم سب کو اپنی وصیت میں باندھ دیا ہے اور وہ ہم پر یہ ذمہ داری ڈال گئی ہے کہ کس طرح پارٹی کو چلایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ جمہوریت پاکستان ہوگا اور پارٹی ملک کی فیڈریشن کے لئے جمہوریت کی بحالی کے لئے کام کرے گی، غریبوں کے لئے کام کرے گی، جن غریبوں کے لئے انہوں نے جان دی ہے اس جان کو، اس خون کو لے کر آپ غریبوں کے پاس جائیں اور ان کے خون کا ان کو واسطہ دیں اور ان بھائیوں کو ووٹ دو جنہوں نے کہا کہ میں ان کی طرف سے کہتا ہوں آپ پر لازم ہے پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر لازم ہے ہمارے دوستوں اور ہمارے بھائیوں پر کہ وہ جائیں الیکشن میں حصہ لیں اور حکومت کی اس قاتل لیگ کو دفن کردیں اور بی بی صاحبہ کی تصویر کو وزیراعظم ہاؤس میں اور ایوان صدر میں پہنچا دیں۔ انشاء اللہ۔ انہوں نے کہا کہ ہماری جنگ ایک طبقے کے خلاف ہے، ہماری جنگ ان لٹیروں کے ساتھ ہے، ہماری اس خاص

طبقے کے خلاف ہے جو اس وقت مسند اقتدار پر موجود ہے۔ ہماری جنگ پاکستان فوج کے ساتھ نہیں ہے نہ ہم پاکستان کی فوج سے عوام کو لڑانا چاہتے ہیں نہ ہم پاکستان توڑنا چاہتے ہیں۔ ہم پاکستان کو اور سنوارنا چاہتے ہیں، ہمیں پتا ہے کہ مجھے اور میرے خاندان کو ہی نہیں پاکستان کے ہر بچہ کو پتا ہے کہ پاکستان میں بی بی صاحبہ کی شہادت سے جو افسوس اور غم اور ظلم ہوا ہے اور ملک کو نقصان ہوا ہے ہمیں پتا ہے کہ وہ دُشمن جس نے بی بی صاحبہ کو شہید کیا وہ شاید کچھ اور کرنا چاہتا ہے وہ شاید پاکستان توڑنا چاہتا ہے مگر ہم اپنے خون کے آخری قطرے تک پاکستان کو بچانا چاہتے ہیں اور بچائیں گے۔ ہم پاکستان کو بچائیں گے، ہم نے اپنی جانوں کا نذرانہ پہلے بھی دیا ہے اور اب بھی دریغ نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان ہے تو ہم ہیں اگر ہم ہیں تو پاکستان ہے انشاء اللہ آپ کا ساتھ رہے گا اور پیپلز پارٹی کا بول بالا رہے گا۔ پاکستان میں جمہوریت کرنے کی ہم بی بی کے خوابوں کی تعبیر بنائیں گے، ملک کو ہم پارٹی کے اندر ڈسپلن لائیں گے ہم ہر طرح کی قربانی دیں گے تاکہ کوئی ہم پر یہ انگلی نہ اٹھا سکے، قیامت کے روز بھی کہ ''لو آصف لو مخدوم صاحب لو بلاول میں تم پر ایک ذمہ داری چھوڑ کر آئی تھی کیا تم نے وہ ذمہ داری نبھائی''۔ انہوں نے کہا کہ بی بی صاحبہ کی حفاظت کے لئے جو خصوصی سیکورٹی دستہ دیا تھا اس کے تقریباً سب کے سب شہید ہو گئے وہ سارے میرے پنجابی دوست تھے جو میں نے جیل میں قید کے دوران بنائے تھے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو حکومتوں میں میرے ساتھ تھا یہ سارے میں نے آٹھ سال کی اپنی اور سات سال تک پنجاب میں قید کے دوران بنائے تھے۔ وہ ایسے ایسے دوست جو پہلے فائر پر گاڑیوں سے اچھل کر بھاگتے ہوئے بی بی کے پاس آئے اور بم دھماکوں کی نذر ہو گئے۔ انہوں نے ایک سوال پر کہا کہ ہم 8 جنوری کو انتخابات میں جائیں گے اور اگر ہمارے ووٹوں پر ڈاکہ ڈالا گیا تو ہم 9 جنوری کو اپنے نئے لائحہ عمل کا اعلان کریں گے اور یہ بات بی بی شہید نے بھی کہی تھی اگر 8 جنوری کو انتخابات میں دھاندلی کی گئی اور ہمارے ووٹ پر ڈاکہ ڈالا گیا تو ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے، عوام کو کال دیں گے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ہونے والے فیصلے کے مطابق آصف زرداری معاون چیئرمین ہوں گے جو مخدوم امین فہیم اور دیگر رہنماؤں سے مل کر پارٹی کو چلائیں گے۔ بینظیر بھٹو نے اپنی آخری وصیت میں مخدوم امین فہیم کو وزارتِ عظمیٰ کا اُمیدوار نامزد کر دیا، انتخابات میں کامیابی پر انہیں پارٹی سے اپنی نامزدگی کی توثیق کرانا ہوگی۔ آصف زرداری پارٹی کی انتخابی مہم چلائیں گے، وہ نوڈیرو سے ملک بھر میں اُمیدواروں کے

جلسوں سے ٹیلی فون تک خطاب کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ نومنتخب چیرمین بلاول بھٹو زرداری ابھی کم عمر ہیں اور سیاسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے اس لئے وہ معاون چیئرمین کی حیثیت سے مخدوم امین فہیم اور پاکستان پیپلز پارٹی کے دیگر رہنماؤں کی مدد سے پارٹی کو چلائیں گے اور مخدوم امین فہیم کو پارٹی مسائل حل کرنے کے لئے اپنا تعاون فراہم کریں گے۔ علاوہ ازیں پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین مخدوم امین فہیم نے کہا کہ بلاول بھٹو زرداری کے بطور چیئرمین انتخاب کو خوشی سے قبول کیا ہے۔ پریس کانفرنس کے دوران انہوں نے کہا کہ سابق چیئرپرسن بینظیر بھٹو شہید کی سوئم کی رسومات مکمل کرنے کے بعد پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں بلاول بھٹو زرداری نے بینظیر بھٹو شہید کی آخری وصیت پڑھ کر سنائی۔ اپنی آخری وصیت میں بینظیر بھٹو شہید نے لکھا کہ اگر میں دُنیا میں نہ رہوں تو میرے شوہر آصف علی زرداری کو پارٹی کا چیئرمین مقرر کر دیا جائے۔ اس پر آصف علی زرداری نے یہ نئی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے بلاول بھٹو زرداری کو اپنی جگہ پارٹی کا چیئرمین نامزد کیا جس کی تمام اراکین نے تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب نے بینظیر بھٹو کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کیا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ 31 دسمبر 2007ء)

طالبان کی تردید

31 دسمبر 2007ء کو طالبان نے ایک اہم بیان میں بینظیر بھٹو کے قتل کی تفتیش آزاد اداروں سے کرانے کا مطالبہ کر دیا تا کہ اصل قاتلوں کا کھوج لگایا جا سکے۔ طالبان تحریک کے ترجمان مولوی عمر نے بی بی سی کو نامعلوم مقام سے فون کر کے بتایا کہ حکومت اس واقعہ کے بعد مسلسل بیت اللہ محسود کے خلاف ذرائع ابلاغ میں بے بنیاد پراپیگنڈہ کر رہی ہے اور طالبان کو خوانخواہ اس قتل میں ملوث کیا جا رہا ہے۔ مولوی عمر نے کہا کہ وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیئر (ر) جاوید اقبال چیمہ کی جلد بازی اور غلط بیانات کی وجہ سے پاکستان بھر میں بینظیر بھٹو کی ہلاکت کا شدید ردِعمل ہوا اور درجنوں بے گناہ لوگ مارے گئے جبکہ اربوں روپے کا نقصان بھی ہوا۔ ترجمان نے دھمکی دی کہ اگر آئندہ طالبان اور قبائیلیوں کو اس قسم کے واقعات میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تو حکومت کے خلاف کارروائیاں شروع کی جائیں گی۔ مولوی عمر نے مطالبہ کیا کہ سابق وزیراعظم کے قتل کے بعد مختلف واقعات میں ہونے والے نقصانات کا فوری طور پر ازالہ کیا جائے اور ہلاک وزخمی ہونے والے افراد کے لواحقین کو معاوضہ دیا جائے۔ ترجمان کا کہنا تھا کہ بینظیر بھٹو کا قتل ملک وقوم کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ لہٰذا اس واقعہ کی اعلیٰ سطح پر آزاد اداروں سے تحقیقات کرائی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالبان کے لئے وہ تمام تحقیقات قابل قبول ہوں گی جو آزاد اداروں سے کرائی جائیں گی بشرطیکہ یہ ادارے امریکی اور برطانوی اثر ورسوخ سے آزاد ہوں۔

31 جنوری کو معروف قانون دان اور پیپلز پارٹی کے سیکرٹری فنانس سینٹر ڈاکٹر بابر اعوان نے راولپنڈی میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں حکومتی ترجمان کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے اسے صورتِ حال کو بگاڑنے اور گمراہ کرنے کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو پر تین ماہر نشانہ بازوں نے گولیاں چلائیں جن میں سے 2 ان کی گردن کے بائیں

طرف اور دوسری سر پر لگی جو پار ہوئی۔ پیپلز پارٹی بینظیر بھٹو کی شہادت کے باوجود انتخابات میں حصہ لے گی، اگر انتخابات کو ملتوی کرنے کی کوشش کی گئی تو حکمرانوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کریں گے۔ گزشتہ روز یہاں پریس کانفرنس سے خطاب میں انہوں نے کہا کہ فرد واحد اور کنگز پارٹی کو فائدہ پہنچانے کے لئے آئین میں انتخابات ملتوی کرانے کی کوئی گنجائش نہیں، ایسا ہوا تو خانہ جنگی شروع ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ روسی فوجی ماہرین نے بھی تصدیق کی ہے کہ بینظیر بھٹو شہید کو ماہر نشانہ بازوں نے شوٹ کیا ہے، سرکاری گورکن ڈاکٹر مصدق جو ایک سرکاری ملازم ہیں، نے 3 دفعہ اپنی رپورٹ کو بدل کر نہ صرف اپنے پیشے سے بددیانتی کی ہے بلکہ حکومت کو اصل حقائق کو چھپانے میں مدد دینے کے لئے غلط رپورٹ بھی تیار کی ہے جس پر ان کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔ بابر اعوان نے کہا کہ بی بی شہید کو 27 دسمبر کو مناسب سیکورٹی فراہم نہیں کی گئی تھی۔ کوئی ان سے پوچھے اس دن جڑواں شہروں کی انتظامیہ کہاں تھی، وہاں صرف اشتیاق شاہ شہید اور 3 کانسٹیبلوں کے علاوہ کوئی نہ تھا مگر جیسے ہی حادثہ ہوا انتظامیہ پہنچ گئی۔ حکومتی رویہ دیکھ کر نہ صرف پوری قوم بلکہ عالمی برادری بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئی ہے کہ بی بی کی شہادت ٹارگٹ کلنگ ہے۔ اگر کسی ریٹائرڈ جنرل نے ملک میں تیسری دفعہ مارشل لاء لگانے کی کوشش کی اور آئین کو توڑنے کی ہیٹرک کی تو قوم اس کی اجازت نہیں دے گی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے شہادت کی محرکات اور ثبوتوں کو مٹانے کے لئے حادثے کے صرف 3 گھنٹے بعد ٹینکروں کی مدد سے جائے وقوعہ کو دھلوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں جب نوڈیرو سے واپس آ رہا تھا تو ایک جج نے بتایا ہے کہ انتخابات کو ملتوی کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر ملک میں ایک تشدد کی نہ ختم ہونے والی لہر شروع ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ انشاء اللہ پیپلز پارٹی دوتہائی اکثریت سے انتخابات میں کامیابی حاصل کرے گی جس کے فوری بعد مشرف کو جانا پڑے گا۔ ہم چیف الیکشن کمشنر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ انتخابات ملتوی کر کے آئین توڑنے کے جرم میں شریک نہ ہوں۔ بینظیر بھٹو کی شہادت کے اصل محرکات کو سامنے لانے کے لئے اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں کمیشن کی طرز پر تحقیقات کی جائیں۔ ڈاکٹر بابر اعوان نے کہا کہ شہید چیئر پرسن نے اپنی شہادت سے قبل ہی اپنے قاتلوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ ان کو جان بوجھ کر شہید کیا گیا ہے کیونکہ سرکاری تیموں اور جمہوریت کے دشمنوں کو خطرہ تھا کہ انہیں بیلٹ کے ذریعے شکست نہیں دی

جا سکتی۔ اس لئے ان کو بیلٹ کے ذریعے راستے سے ہٹایا جائے۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں حکومت سے 10 سوالات کئے اور کہا کہ اگر حکومت نے ان سوالات کے جوابات نہ دیئے تو پھر قوم اس کا حساب لے گی۔

1) حکومت بتائے کہ 18 اکتوبر کو سانحہ کارساز کے بعد بینظیر بھٹو شہید کی ایف آئی آر کیوں نہ درج کی گئی؟

2) سانحہ کارساز کے بعد پیپلز پارٹی نے سکاٹ لینڈ یارڈ سے تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا تھا اس پر عمل کیوں نہ کیا گیا؟

3) سیکرٹری داخلہ نے حکومت کو خط لکھا تھا کہ شہید محترمہ کو شوکت عزیز اور چوہدری شجاعت حسین کی طرح سیکورٹی مہیا کی جائے اس پر عمل کیوں نہ کیا گیا؟

4) 27 دسمبر کو جائے وقوعہ پر جڑواں شہروں کے جامر کہاں تھے؟

5) 27 دسمبر کو شہید بینظیر بھٹو کا سیکورٹی پلان کہاں تھا؟ علاوہ ازیں ان کو سیکورٹی کیوں نہ دی گئی؟

6) 27 دسمبر کو اعلیٰ حکام کہاں تھے؟

7) سانحے کے صرف 3 گھنٹوں بعد جائے وقوعہ کو کیوں پانی کے ٹینکر لگا کر دھلوا دیا گیا؟

8) بیرونی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیوں تیار نہ کی گئی؟

9) حکومت بار بار کیوں اپنے بیانات بدل رہی ہے؟ اور یہ سب کس کو بچانے کے لئے کیا جا رہا ہے؟ ڈاکٹر بار بار کیوں اپنی رپورٹ کو بدل رہا ہے؟

10) حکومت نے فوری طور پر کیوں بیت اللہ محسود اور القاعدہ پر قتل کا الزام عائد کیا؟ اور پانچویں دن بعد بھی کیوں ابھی تک ابتدائی تحقیقاتی رپورٹ جاری نہیں کی گئی؟

انہوں نے کہا کہ پارٹی نے بینظیر بھٹو کے اکلوتے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کو چیئرمین مقرر کرنے کے بعد فیڈریشن کے حوالے سے نئے نعرے جاری کر دیئے ہیں۔ نئے نعروں میں ”بھٹو کی تصویر، بلاول، بی بی کی تقدیر، بلاول، دھرتی کی شمشیر، بلاول“ اور ”صوبوں کی زنجیر بلاول“ شامل ہیں۔ اس دوران نوڈیرو میں بات چیت کرتے ہوئے شہید بینظیر بھٹو کے وکیل فاروق ایچ نائیک نے کہا کہ بینظیر بھٹو کا قتل گولی لگنے سے ہوا ہے اور اس سلسلے میں کی جانے والی حکومتی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں آج تک انگریزوں کا قانون

نافذ ہے۔ یہاں کسی بھی واقعے کے رونما ہونے کی صورت میں عجلت میں ایف آئی آر درج کی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کے قاتلوں کو معاف کیا جائے گا نہ انہیں راہ فرار اختیار کرنے دی جائے گی۔ ہم بینظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات بیرون ملک ماہرین سے کرائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں 3 رکنی کمیٹی تشکیل دی جا چکی ہے جس میں میرے علاوہ بیگم عابدہ حسین اور لطیف کھوسہ شامل ہیں جبکہ تحقیقات میں معاونت کے لئے اقوامِ متحدہ سے بھی رابطہ کیا جائے گا۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ 1 جنوری 2008ء)

o

یکم جنوری 2008ء کے روزنامہ جنگ لاہور نے ڈاکٹر مصدق کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ ڈاکٹر مصدق نے حکومتی مؤقف پر کہا ہے کہ انہوں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں دی جو ان سے منسوب کی جا رہی ہے جس پر حکومت کے خلاف عوامی اشتعال میں مزید اضافہ ہو۔ 2 جنوری 2008ء کے اخبارات نے یہ اہم خبر شائع کی کہ راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ڈاکٹروں نے انکشاف کیا ہے کہ ان پر خاموش رہنے کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ خاموش رہیں خصوصاً وہ ڈاکٹر جنہوں نے بینظیر بھٹو کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ 2002ء میں ڈینئل پرل کیس کے اعلیٰ تفتیش کار جمیل یوسف نے کہا کہ حکومت نے جائے وقوعہ سے خون کے دھبے اور نشانات مٹا کر بدترین غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اے پی ڈی ایا ہسپتال کے ڈاکٹروں کے مطابق پاکستانی حکام اپنے ساتھ بینظیر بھٹو قتل کیس سے متعلق اسپتال کا میڈیکل ریکارڈ بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ سے بات چیت کرتے ہوئے ان ڈاکٹروں نے کہا کہ حکام نے ان پر انتہائی شدید دباؤ ڈالا کہ 27 دسمبر 2007ء کو ہونے والے جان لیوا حملے میں بینظیر بھٹو کو پہنچنے والی چوٹ اور موت کی وجوہات کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ معاملے کی حساسیت کے باعث نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بینظیر بھٹو کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک نے بتایا کہ جیسے ہی ہم نے بینظیر بھٹو کی موت کا وقت جاری کیا، اسی لمحے حکومتی حکام اس کیس سے متعلق اسپتال کا ریکارڈ لے کر چلے گئے۔ امریکی اخبار کے مطابق جس وقت مذکورہ ڈاکٹر

سے اس کیس سے متعلق انٹرویو کیا جارہا تھا، اس وقت وہ پسینے میں شرابور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت نے ہمیں کہا ہے کہ اس بارے میں بات کرنا بالکل بند کردیں اور ہم (ڈاکٹروں) میں سے بہت سے، اسے اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد یہ ڈاکٹرز سمجھتے ہیں کہ وہ بھی سیاست کے خوفناک طوفان میں پھنس چکے ہیں۔ اخبار کے مطابق حقیقتاً کیا واقعہ پیش آیا، اس کے پاکستان میں بہت سنگین نتائج ہو سکتے ہیں۔ کسی بندوق بردار کا انتہائی قریب سے بینظیر بھٹو پر فائر کرنا یہ بتاتا ہے کہ قاتل ایک ایسے شہر میں، جہاں پاکستانی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے، حکومت کی فراہم کردہ سیکورٹی کو توڑنے کے قابل ہو چکا تھا، جس سے بینظیر بھٹو کے حامیوں کے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ حکومت انہیں مناسب تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اگر الزام بندوق بردار کو دیا جائے تو اس سے یہ سوال بھی اُٹھے گا کہ حکومت اتنے دن تک اس کے برعکس دعوے کیوں کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بینظیر بھٹو کے حامیوں نے بین الاقوامی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔ حکومت نے بار بار اس الزام کو مسترد کیا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ امریکی طبی ماہرین نے جب پیر کو بینظیر بھٹو کے زخموں سے متعلق سرکاری رپورٹ کا جائزہ لینے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اس قیاس کا اظہار کیا کہ گولی کا زخم نہیں بلکہ ان کی کھوپڑی میں ہونے والا فریکچر موت کی وجہ ہو سکتا ہے۔ اسی دوران راولپنڈی میں طبی اہلکار اس مسئلے پر زیادہ تر خاموش ہی رہے ہیں۔ راولپنڈی جنرل اسپتال کے سپروائزر ڈاکٹر فیاض احمد خان نے بتایا کہ ہمارے ڈاکٹرز انتہائی جذباتی اور سیاسی مسائل کے درمیان پھنس گئے ہیں، ہم جس مصیبت میں پھنسے ہیں وہ ہمارے طبی پیشے کے لئے ایک بدترین صورتِ حال ہے۔ 2002ء میں امریکی صحافی ڈینئل پرل کے لاپتہ ہونے کے کیس کے مرکزی تفتیش کار جمیل یوسف نے کہا ہے کہ حکومت پاکستان نے جائے وقوع کو عام لوگوں کے لئے بند نہ کرکے بدترین غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے قبل کہ شواہد جمع کئے جاتے۔ بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد فائر بریگیڈ نے دھماکے کی جگہ سے خون کے تمام نشانات اور دھبے دھو کر مٹا دیئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب اس نوعیت کے قتل کے کیس سے نمٹ رہے ہوتے ہیں تو اس میں فارینسک کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ متعدد عینی شاہدین کے مطابق پولیس نے تاحال ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ دھماکے میں شدید زخمی ہونے والے 19 سالہ کامران نذیر نے بتایا کہ اسے اس وقت شدید دھچکا پہنچا جب پولیس

نے اس سے تفتیش ہی نہیں کی حالانکہ وہ واقعے کا عینی گواہ ہے۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ آخر ہوا کیا، سچ کا جاننا بہت ضروری ہے۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان بابر اعوان نے کہا کہ سچ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی کوئی تحقیقات ہو ہی نہیں رہی۔ انہوں نے کہا حملے کے بعد انہوں نے بینظیر بھٹو کی لاش دیکھی تھی اور واضح طور پر گولیوں کے نشانات کی شناخت کی تھی، جو گولی کے داخل ہونے اور نکلنے کے تھے۔ بابر اعوان نے کہا کہ اسپتال میں سرجری کے پرنسپل پروفیسر محمد مصدق خان سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ لیکن بالآخر انہوں نے مجھے بتایا کہ بینظیر بھٹو کی موت گولی کے زخم سے ہوئی ہے۔ آخر وہ اتنے پریشان کیوں تھے۔ انہوں نے مجھے خود بتایا کہ ان پر شدید دباؤ ہے کہ میں بینظیر بھٹو کی موت کی وجہ کے متعلق کوئی بات نہ کروں۔ راولپنڈی جنرل اسپتال کے بورڈ ممبر اطہر من اللہ نے اختتام ہفتہ پر صحافیوں کو بینظیر بھٹو کی میڈیکل رپورٹ ای میل کی ہے۔ یہ رپورٹ اس دستاویز سے علیحدہ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹرز نے انکشاف کیا کہ حکام نے وہ ضبط کرلی ہے۔ اس رپورٹ میں بینظیر بھٹو کے سر میں ایک گہرا زخم بتایا گیا ہے، جس میں سے مغز بہہ کر نکل رہا تھا۔

(روزنامہ جنگ لاہور۔ 2 جنوری 2008ء)

اسی روز پیپلز پارٹی کے سینئر لطیف کھوسہ نے انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو کو دھاندلی کے ثبوت دینے سے چند گھنٹے پہلے قتل کیا گیا۔ مبینہ دھاندلی کے لئے آئی این آئی اور الیکشن کمشن کے منصوبے کے ثبوت محترمہ میڈیا کو دینے والی تھیں۔ انہوں نے اس بارے میں ایک رپورٹ تیار کی تھی جو انہوں نے جمعرات کی شام امریکی کانگریس ارکان سے ملاقات میں انہیں دینے کے بعد پریس کانفرنس میں جاری کرنا تھیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں۔ لطیف کھوسہ نے بتایا کہ جمہوریت کے چہرے پر ایک اور دھبہ کے عنوان سے 160 صفحات کی رپورٹ انہوں نے لکھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ منصوبے پر سابق حکومتوں کے اشتراک سے پہلے ہی عمل شروع ہو گیا تھا۔ ریٹرننگ آفیسرز پر دباؤ ڈال کر اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کروائے گئے۔ بعض اُمیدواروں کو کاغذات جمع نہیں کرانے دیئے گئے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ آئی ایس آئی کے پاس ایک میگا کمپیوٹر ہے جو کسی بھی کمپیوٹر کو ہیک کر سکتا ہے۔ اس کا کنکشن الیکشن کمیشن کے سسٹم سے ہے۔ الیکشن کمیشن پوری طرح حکومت کے ماتحت ہے۔ صدر کے ترجمان راشد قریشی نے ان دعووں کو مضحکہ خیز قرار دیا ہے۔ انہوں

نے کہا کہ ان دعووں پر ہنسی آتی ہے۔ صدر نے کہا ہے کہ آزادانہ منصفانہ شفاف اور پرامن الیکشن ضروری ہے۔

o

2 جنوری 2008ء کی اطلاع کے مطابق امریکی کانگریس کے 12 ارکان نے وزیر خارجہ کونڈ ولیزا رائس کو خط لکھا کہ اگر پاکستان بینظیر بھٹو قتل کی عالمی تحقیقات نہ کروا سکے اور الیکشن 8 جنوری سے آگے بڑھائے جائیں تو پاکستان کے خلاف پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ ٹی وی چینل کے مطابق امریکہ میں ان دنوں تعطیلات چل رہی ہیں تاہم کانگریس میں اکثریتی ڈیموکریٹک پارٹی کے 12 اہم ارکان نے اس کے باوجود امریکی وزیر خارجہ کو خط میں محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے واقعے سے متعلق بش انتظامیہ کی پالیسی اور انتخابات میں متوقع تاخیر پر گہری تشویش اور مذمت کا اظہار کیا ہے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ انہیں وائٹ ہاؤس کے اس بیان سے تشویش ہوئی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے، حالانکہ امریکہ نے خودمختار ممالک میں ہونے والے ایسے واقعات کی تحقیقات عالمی سطح پر کرانے کے عالمی مطالبات کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں لبنان کے سابق وزیراعظم رفیق حریری کے قتل کی اقوامِ متحدہ کے ذریعے تحقیقات کی مثال سامنے ہے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت سے متعلق حالات کے بارے میں متضاد اطلاعات آرہی ہیں اور بعض سنجیدہ سوالات جنم لے رہے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر کا متضاد بیان اور وڈیو ٹیپ کا معاملہ ہے۔ یہ صورتِ حال مطالبہ کرتی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی عالمی سطح پر تحقیقات کرائی جانی چاہئے۔ خود وائٹ ہاؤس نے کہا ہے کہ الیکشن ملتوی ہوئے تو ان کی نئی تاریخ بھی ساتھ دی جانی چاہئے۔ امریکی ارکان کانگریس نے خط میں کہا کہ وائٹ ہاؤس کی جانب سے یہ پیغام درست نہیں کیونکہ یہ عملی طور پر انتخابات ملتوی کرنے کی کھلی دعوت ہے۔ خط لکھنے والے ایک رکن کانگریس کا کہنا ہے کہ وہ شیڈول کے مطابق انتخابات کا انعقاد اور پاکستانی عوام کو اس عمل میں شریک کرا کر پاکستان میں جمہوریت کا عمل مستحکم کرانا چاہتے ہیں اور اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی آزادانہ تحقیقات کرائی جائیں۔ خط میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کو اس سال دی جانے والی امریکی

امداد میں سے پانچ کروڑ ڈالر پہلے ہی سے روک لئے گئے ہیں۔ ایسے میں محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی غیر جانبدار اور آزادانہ تحقیقات نہ کرائی گئیں اور انتخابات میں تاخیر کی گئی تو پہلے سے روکے گئے امریکی فنڈز پر نظر رکھی جائے گی اور مستقبل میں اضافی پابندیاں لگانے پر توجہ کی جائے گی۔ وائٹ ہاؤس اور بش انتظامیہ پاکستان میں انتخابات کرانے پر زور دیں جبکہ امریکہ کی سب کمیٹی برائے خارجہ اُمور کے ممبر مسٹر اسٹیو نے بھی امریکی وزیر خارجہ کونڈ ولیزا رائس کو خط میں مطالبہ کیا کہ امریکہ پاکستان پر زور دے کہ الیکشن 8 جنوری کو ہی کرائے جائیں۔ انہوں نے خط میں یہ بھی مطالبہ کیا کہ بینظیر بھٹو قتل کیس کی تحقیقات اقوامِ متحدہ کی زیرنگرانی کرائی جائیں۔ امریکہ نے حکومت پاکستان کو بینظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کے لئے امداد کی پیشکش بھی کی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جیسے ہی کانگریس کا اجلاس کرسمس کی چھٹیوں کے بعد شروع ہوگا تو اس تحریک پر 200 سے زائد ارکان کانگریس دستخط کریں گے۔ انہوں نے اپنے خط میں مطالبہ کیا کہ اگر بین الاقوامی اداروں سے تحقیقات نہ کرائی گئیں تو پاکستان کی امداد بند کر دی جائے گی۔ ان امریکی ارکان کانگریس نے چھٹیوں کے باوجود وزیر خارجہ کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ کو چاہئے کہ وہ پاکستان میں انتخابات کو ملتوی نہ ہونے دے۔ انہوں نے خط میں یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے کیس کی تحقیقات اقوامِ متحدہ کی زیرنگرانی کرائی جائے۔ اے این این کے مطابق امریکہ نے بینظیر بھٹو کی جان کو لاحق خطرات کو نظرانداز کرنے کا الزام مسترد کر دیا۔ پاکستان کو سانحہ راولپنڈی کی تحقیقات میں مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ پاکستانی حکومت سے سب کو بھرپور تفتیش کی توقع ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان ٹام کیسی نے ''واشنگٹن پوسٹ'' سمیت مختلف امریکی اخبارات میں کالم نگار رابرٹ نوواک کے اس دعوے کی تردید کی کہ امریکی محکمہ خارجہ نے بینظیر بھٹو کی جان کو لاحق خطرات کو نظرانداز کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ رپورٹیں بے بنیاد ہیں، ہم بینظیر بھٹو کی جان کو لاحق خطرات کے بارے میں خود ان سے اور ان کے ساتھیوں سے معمول کے مطابق تبادلہ خیال کرتے رہے جبکہ صدر پرویز مشرف اور انکی حکومت کو بھی اعتماد میں لیا جاتا رہا۔ ہم نے ہر موقع پر بینظیر بھٹو کو لاحق سیکورٹی خدشات کو سنجیدگی سے لیا اور ہم نے اس حوالے سے ملنے والی معلومات کو پیپلز پارٹی کی قائد اور ان کی سیکورٹی پر مامور افراد تک پہنچانے کو ہمیشہ یقینی بنایا تھا، دریں اثناء وائٹ ہاؤس کے ترجمان

سکاٹ سٹینزل نے کہا کہ ہم نے بینظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کے لئے پاکستان کو ہر ممکن رہنمائی اور تعاون فراہم کرنے کی پیشکش کی ہے۔ اب پاکستانی حکومت نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ہماری پیشکش قبول کرتی ہے یا نہیں۔ ابھی تک اس ضمن میں ہم سے کوئی تعاون نہیں مانگا گیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان ایک خود مختار ملک ہے اور وہ یہ تحقیقات کرائے گا۔ اس سانحے کی مکمل تحقیقات پاکستان کے عوام اور پاکستان میں طویل المدتی جمہوریت کے مفاد میں ہے۔ اس سوال پر کہ کیا حکومت پاکستان سے بھرپور قسم کی تحقیقات کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ ترجمان نے کہا کہ سب کو اسی کی توقع ہے اور یہی سب کے مفاد میں بھی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں امریکی سفیر نے بینظیر بھٹو کے قتل کے سانحے کے بعد پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ رابطہ کیا ہے۔ صدر جارج ڈبلیو بش نے بھی صدر مشرف سے جمعرات کو ٹیلی فون پر گفتگو کی تھی تاہم صدر بش نے آصف علی زرداری یا ان کے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ کوئی براہ راست رابطہ نہیں کیا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت۔2 جنوری 2008ء)

o

ممتاز امریکی روزنامہ واشنگٹن پوسٹ نے اپنی یکم جنوری 2008ء کی اشاعت میں دعویٰ کیا کہ پاکستانی حکام نے محترمہ بینظیر بھٹو کی زخمی حالت میں جان بچانے کی کوشش کرنے والے ڈاکٹروں پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ شہید رہنما کے آخری لمحات کے بارے میں خاموش رہیں۔ ڈاکٹروں کی ٹیم پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ محترمہ بینظیر بھٹو پر حملے کے نتیجے میں آنے والے زخموں کی تفصیلات کے بارے میں کسی کو معلومات نہ دی جائیں جبکہ حکومتی اہلکاروں نے بینظیر بھٹو کے علاج کے حوالے سے راولپنڈی کے ہسپتال کا تمام ریکارڈ موت کی تصدیق ہونے کے فوری بعد اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ 27 دسمبر کو محترمہ بینظیر بھٹو کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر یہ انکشاف کیا کہ ہمیں حکومت نے بات کرنے سے روک دیا تھا جبکہ ہماری ٹیم میں موجود متعدد ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ پسینے میں شرابور اس ڈاکٹر نے اپنا سر ہاتھوں میں لیتے ہوئے بتایا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کو شدید دباؤ اور پریشانی کا سامنا ہے۔ اخبار کا کہنا

ہے کہ اس سانحے کے بعد متعلقہ ڈاکٹر سخت سیاسی تنقید کی زد میں ہیں۔ وزارت داخلہ کے ترجمان جاوید چیمہ نے دعویٰ کیا تھا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی موت گاڑی کے سن روف کا لیور لگنے کے نتیجے میں ہوئی جبکہ متعدد ٹی وی چینلوں کی ویڈیو فوٹیج سے ظاہر ہوتا ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ایم ایس فیض احمد خان نے بتایا کہ ہمارے ڈاکٹر اس جذباتی اور سیاسی ایشو کا نشانہ بن رہے ہیں جس کی وجہ سے شدید پریشانی کا شکار ہیں۔ کراچی کے ایک اعلیٰ پولیس عہدیدار جمیل یوسف نے بتایا کہ جائے حادثے کو سیل نہ کرنا بہت بڑی غلطی تھی جبکہ ایک 19 سالہ زخمی نوجوان نے بتایا کہ یہ لوگ مجھ سے تفصیل کیوں نہیں پوچھ رہے۔ میں عینی شاہد ہوں اور سچ کو سامنے لانا ضروری ہے۔ ایک اور رپورٹ میں واشنگٹن پوسٹ کے کالم نگار رابرٹ ڈی نووک نے لکھا ہے کہ بینظیر بھٹو نے اپنی شہادت سے قبل صدر پرویز مشرف اور ان کے درمیان امریکی تعاون سے اقتدار کی تقسیم سے متعلق ڈیل سے خود کو دور کر لیا تھا۔ بینظیر بھٹو نے محکمہ خارجہ کے ایک سینئر اہلکار کو تحریری شکایت کی تھی کہ ان کا کیمپ امریکی حمایت یافتہ اقدام کو پاکستان میں جمہوریت کے لئے ہونے والی کوششوں کے لئے زیادہ دیرپا تصور نہیں کرتا۔ اس کی بجائے اس اقدام کو اسلام آباد میں صدر مشرف کو صدر بش کا آدمی ہونے کے طور پر تحفظ دینے کی کوشش قرار دیا جا رہا تھا۔ اخبار کے مطابق 18 اکتوبر کو وطن واپسی کے بعد بینظیر بھٹو نے محکمہ خارجہ سے کئی بار درخواستیں کی تھیں کہ انہیں بہتر تحفظ کے لئے امریکی معاونت چاہیے۔ تاہم امریکہ کی طرف سے ان کے تحفظ میں عدم دلچسپی سے دلبرداشتہ ہو کر بینظیر بھٹو نے اقتدار کی تقسیم کے معاہدے سے خود کو دور کرنا شروع کر دیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صدر بش کا بینظیر بھٹو، صدر مشرف اتحاد بنانے کا فیصلہ القاعدہ و طالبان کے خلاف جنگ میں پاکستان کی سٹریٹجک اہمیت کی بنیاد پر تھا۔

(روزنامہ نوائے وقت۔2 جنوری 2008ء)

o

یکم جنوری کو برطانوی اخبار گلوب اینڈ میل نے پیپلز پارٹی الیکشن مانیٹرنگ گروپ کے رکن سرفراز خان لاشاری کے حوالے سے کہا ہے کہ بینظیر بھٹو امریکی ارکان کانگریس روڈ ایز لینڈ اور ارلن سپیکٹر سے ملنے والی تھیں جس میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی جانب سے انتخابات میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کے آنے والے الیکشن میں دھاندلی کے منصوبوں پر مرتب کی گئی۔ رپورٹ دونوں امریکی سیاست دانوں کو پیش کرنا تھی۔ سرفراز لاشاری جو براہ راست بینظیر بھٹو کے ساتھ کام کر رہے تھے، نے کہا کہ انہوں نے یہ معلومات خفیہ اداروں کے اندرونی ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ گلوب اینڈ میل کے مطابق یہ دستاویزی رپورٹ اسلام آباد میں خفیہ ایجنسی کے ہیڈ کوارٹرز سے حاصل کی گئی معلومات پر مبنی تھی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکہ کے 2001ء سے جاری کئے 10 بلین ڈالر کے امدادی فنڈز انتخابات میں دھاندلی کے لئے اسلام آباد کے جی فائیو کے گھر سے استعمال کئے جا رہے تھے اور اس سے ایک سو حلقہ انتخاب میں مشرف کی حامی جماعت مسلم لیگ (ق) کو جتوانے کے لئے بیلٹ پیپرز اور مہریں تیار کی جا رہی تھیں۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین آصف علی زرداری نے اس رپورٹ کی تصدیق کی ہے۔

o

پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت لیزر گن سے ہوئی۔ اس کا انکشاف 2 جنوری 2008ء کے اخبارات نے کیا۔ لیزر لگنے کے بعد بینظیر بھٹو کے سر سے دماغ باہر نکل آیا تھا۔ طبی ماہرین نے پی پی پی کے راہنماؤں کو بتایا کہ بینظیر بھٹو کے سر میں جو زخم لگا ہے ایسا گولی سے نہیں ہوتا۔ پیپلز پارٹی کے ذرائع نے انکشاف کیا ہے کہ بینظیر بھٹو کی موت کے لئے جو آلات اور ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے یہ بیت اللہ محسود کے پاس نہیں ہو سکتی اور 18 اکتوبر کی رات کراچی میں بینظیر بھٹو کی ریلی پر خودکش حملوں کے بعد بیت اللہ محسود کی جانب سے بینظیر بھٹو کو 2 مختلف پیغامات بھجوائے گئے جن میں کہا گیا کہ ہماری بینظیر بھٹو سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ بینظیر بھٹو اپنے اصل دشمنوں کو پہچان لیں۔ پیپلز پارٹی کے ذرائع نے انکشاف کیا ہے کہ خودکش حملہ لیاقت باغ سے باہر ہوا جبکہ لیاقت باغ میں سٹیج کے پیچھے تھی۔ ایمبولینس گاڑیوں نے ایک لاش اٹھائی ہے وہ لاش کس شخص کی تھی۔

پیپلز پارٹی کے ذرائع کے مطابق 27 دسمبر 2007ء کی رات 9 بجے بینظیر بھٹو کی امریکی سینیٹروں سے ملاقات طے تھی۔ اس ملاقات میں بینظیر بھٹو نے عام انتخابات میں دھاندلی کے حکومتی منصوبوں کے بارے میں اہم انکشاف بھی کرنا تھا۔ پیپلز پارٹی ذرائع کے مطابق بینظیر بھٹو کے ساتھ 2 بلٹ پروف گاڑیاں ہوتی تھیں۔ دھماکے کے وقت دوسری گاڑی 20 سے 30 میٹر کے فاصلہ پر تھی مگر پولیس والوں نے دوسری گاڑی والوں کو یہ نہیں بتایا کہ بینظیر بھٹو پر فائرنگ ہوئی ہے جبکہ ان کو بتایا کہ بینظیر بھٹو کو دوسرے راستہ سے گھر لایا جا رہا ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 2 جنوری 2007ء)

■ ■ ■

پاکستان آمد اور آغاز

1987ء کے آخر اور 1988ء کے اوائل میں صدر ضیاء نے ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کو جو انٹرویوز دیئے ان میں انہوں نے عندیہ دیا تھا کہ وہ 1990ء میں چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑ دیں گے۔ تاہم انہوں نے اپنے اس عزم کا اعادہ بھی کیا کہ وہ اقتدار سے اس وقت تک علیحدہ نہیں ہوں گے۔ جب تک اسلامی نظام کے نفاذ کا عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ مگر جب انہوں نے 29 مئی 1988ء کو محمد خان جونیجو کی منتخب حکومت کو ختم کر کے اسمبلیوں کو توڑ دیا تو اس سے ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ وہ اقتدار کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑیں گے اور ان کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ مطلق العنان حکومت چاہتے ہیں۔ 1985ء میں غیر جماعتی نظام کو جاری کر کے سیاست دانوں کو اقتدار میں شریک کرنے کا جو عمل انہوں نے شروع کیا تھا اسے اپنے لیے بوجھ اور اپنے عزائم کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے ختم کر دیا اور سوا تین سال تک حکومت کرنے والے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو تضحیک آمیز انداز میں معزول کر کے گھر بھیج دیا۔ ان کے اسمبلی توڑنے کے عمل سے ثابت ہوا کہ صرف محمد خان جونیجو ان کے لیے ناقابل برداشت نہیں تھے بلکہ وہ پوری اسمبلی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی پارلیمنٹ کے اندر اور باہر بے حد مضبوط ہو گئی تھی اور محمد خان جونیجو کو پارلیمنٹ میں تین چوتھائی سے بھی زیادہ اکثریت حاصل تھی۔ اگر صدر ضیاء صرف محمد خان جونیجو سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تو وہ ان کے خلاف عدمِ اعتماد کروا کر نیا وزیر اعظم نامزد کر سکتے تھے اور آٹھویں آئینی ترمیم کے تحت انہیں ایسا کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ مگر انہیں علم تھا کہ وہ جونیجو کے خلاف عدمِ اعتماد نہیں کروا سکتے اور مسلم لیگی ارکانِ اسمبلی اس کام میں ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اس لیے انہوں نے پوری اسمبلی کو ہی گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

اسمبلی ٹوٹنے کے بعد پورے ملک میں خوف کی کیفیت طاری ہو گئی۔ عوام ملک کے

مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو گئے۔ افغان جنگ کے بعد ملک میں افراتفری دہشت گردی اور خوف و ہراس کا جو طوفان برپا ہوا تھا اس میں تیزی آ گئی۔ سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ بھارت نے پاکستان سے ملنے والی سرحد پر فوج کی بھاری تعداد جمع کر دی۔ ملک کے طول و عرض میں بموں کے خوفناک دھماکے ہونے لگے۔ سیاسی عناصر صدر ضیاء کے خلاف متحد ہو گئے۔ 1985ء سے لے کر 1988ء کے درمیان جو سیاسی دوست انہوں نے بنائے تھے اسمبلی ٹوٹنے کے بعد وہ ان کے حریف بن گئے۔ ہر ایک ان کے بارے میں بداعتمادی کا اظہار کرنے لگا۔ ان کے اس عمل کو فوج میں بھی ان کے بعض قریبی دوستوں نے ناپسند کیا۔ بالالفاظِ دیگر اسمبلی توڑنے کے بعد وہ دوستوں کی حمایت سے بھی محروم ہو گئے۔ ان کے بیرونی دوست جن میں امریکہ سرفہرست تھا وہ بھی ان سے خفا ہو گیا۔ صدر ضیاء اسلام آباد سے باہر جانے سے گریز کرنے لگے۔ اسمبلی توڑنے کے بعد اڑھائی ماہ کے دوران انہوں نے صرف تین شہروں یعنی پشاور، لاہور اور بہاولپور کا دورہ کیا اور بہاولپور کے دورے سے واپسی پر ان کا جہاز بستی لال کمال کے نزدیک گر کر تباہ ہو گیا۔ جس میں وہ جاں بحق ہو گئے۔ اور اس طرح ان کا گیارہ سال طویل دورِ حکومت اختتام پزیر ہوا۔ صدر ضیاء ہنگاموں اور افراتفری میں برسرِ اقتدار آئے تھے اور اسی طرح کی صورتحال میں ملک و قوم کو چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

صدر ضیاء کی وفات کے چند گھنٹوں بعد سینٹ کے چیئرمین اور مرحوم صدر کے دیرینہ رفیق مسٹر غلام اسحٰق خان نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ جب کہ وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا۔ مسٹر وسیم سجاد سینٹ کے نئے چیئرمین منتخب ہوئے۔ سپریم کورٹ نے پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئرمین مس بےنظیر بھٹو کی رٹ پٹیشن پر سیاسی جماعتوں کے قانون کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور سیاسی جماعتوں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ اور صدر ضیاء کے 29 مئی 1988ء کے حکم جس کے تحت جونیجو حکومت کو برطرف اور اسمبلیوں کو توڑا گیا تھا کو غیر آئینی اور بلاجواز قرار دے دیا۔ تاہم سپریم کورٹ نے جونیجو دور کی اسمبلیوں کو بحال نہ کیا۔ جس کے بعد 16 نومبر کو جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مرکز اور صوبوں میں صدر ضیاء کے دور میں قائم ہونے والی نگران حکومتوں کو عام انتخابات کے انعقاد تک کام کرنے دیا گیا۔ 13 اگست 1988ء کو فدا مسلم لیگ اور جونیجو مسلم لیگ دھڑوں میں تقسیم ہونے والی پاکستان مسلم لیگ 15 اکتوبر 1988ء تک دو متحارب

گروپوں میں بٹی رہی۔ چونکہ چاروں صوبائی وزراء اعلیٰ فدا محمد مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور اسکے مقابلے میں جونیجو مسلم لیگ کمزور تھی۔ اس وجہ سے لاتعداد مسلم لیگی جن کے اپنے مضبوط انتخابی حلقے تھے اور وہ قومی اسمبلی کے سابق ارکان تھے۔ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ تحریکِ استقلال، جمعیت علماء پاکستان اور جونیجو مسلم لیگ نے باہم مل کر پاکستان عوامی اتحاد کے نام سے انتخابی اتحاد قائم کیا۔ اس طرح دوسری طرف 9 جماعتوں جن میں فدا مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی، مرکزی جمعیت اہلحدیث، سید فخر امام گروپ، جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) وغیرہ جماعتیں شامل تھیں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے انتخابی اتحاد قائم کیا۔ جب کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے ایم آر ڈی کی جماعتوں کے ساتھ انتخابی اتحاد تو نہ کیا، مگر انتخابی تعاون پر رضامندی ظاہر کی۔ اور ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کے سربراہوں کے مقابلے میں اپنے اُمیدوار کھڑے نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ 15 اکتوبر 1988ء کو ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا یعنی جونیجو مسلم لیگ نے پاکستان عوامی اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی اور مسلم لیگ کے دونوں متحارب گروپ محمد خان جونیجو کی قیادت میں دوبارہ متحد ہو گئے۔ فدا محمد خان، میاں نواز شریف، جونیجو اور اقبال احمد خان کے حق میں صدارت اور جنرل سیکرٹری کے عہدوں سے دستبردار ہو گئے۔ مگر اس وقت پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کیونکہ اس وقت جونیجو لیگ اور فدا لیگ کے ارکان ایک دوسرے کے خلاف انتخابی میدان میں آ چکے تھے اور انہیں انتخابی نشان بھی الاٹ ہو چکے تھے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود دونوں دھڑوں کے امیدواروں نے ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہونے سے انکار کر دیا اور انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف الیکشن لڑا۔ تاہم اوغام سے جونیجو لیگ کے حامیوں کو نقصان پہنچا۔ اس غلط حکمتِ عملی کی وجہ سے اسلامی جمہوری اتحاد پنجاب میں تقریباً قومی اسمبلی کی 30 ایسی نشستیں گنوا بیٹھے جس پر اس کے اُمیدواروں کی کامیابی یقینی تھی مسلم لیگ کے برعکس پاکستان پیپلز پارٹی نے مؤثر اور کامیاب انتخابی حکمت عملی اختیار کی۔ اور ان لوگوں کو انتخابی ٹکٹ جاری کیے جن کے پاس وسائل بھی تھے اور جن کی کامیابی کا امکان بھی سو فیصد تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پچاس فیصد کے قریب انتخابی ٹکٹیں ان افراد کو دی گئیں جو پیپلز پارٹی میں بالکل نو وارد تھے۔ پیپلز پارٹی کے مخالفین اور پارٹی کے ان رہنماؤں جن کو ٹکٹس نہ دیئے گئے نے الزام عائد کیا کہ پارٹی کی قیادت نے انتخابی ٹکٹ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو فروخت کیے۔

اسمبلیاں توڑنے کے بعد سندھ میں وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کی بجائے سابق وزیر اعلیٰ

مسٹر اختر علی قاضی کو سینئر صوبائی وزیر بنایا گیا تھا۔ جب کہ جنرل رحیم الدین خان کو وہاں کا قائم مقام گورنر بنا کر ایک طرح کا گورنر راج نافذ کر دیا گیا تھا۔ مگر صدر اسحٰق نے مسٹر اختر علی قاضی کو صدر ضیاء کی وفات کے بعد وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ جس پر گورنر رحیم الدین خان نے استعفیٰ دے دیا۔ اسی طرح صدر اسحٰق نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے قائم مقام چیف جسٹسوں کو مستقل کر دیا۔ بحریہ کے سربراہ ایڈمرل افتخار احمد سروہی کو جائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کا چیئر مین مقرر کر دیا گیا۔

O

صدر ضیاء کی وفات کے بعد ملک میں ایک بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے نئی حکومت کی تشکیل تک ایک 13 رکنی ایمرجنسی کونسل قائم کی گئی۔ جس کے ارکان حسب ذیل تھے۔

1. مسٹر محمد اسلم خٹک، سینئر وفاقی وزیر
2. صاحبزادہ یعقوب علی خان، وزیر خارجہ
3. مسٹر محمود اے ہارون، وزیر دفاع
4. ملک نسیم آہیر، وزیر داخلہ
5. مسٹر وسیم سجاد، وزیر قانون و پارلیمانی امور
6. جنرل مرزا اسلم بیگ، چیف آف آرمی سٹاف
7. ایڈمرل افتخار احمد سروہی، چیف آف نیول سٹاف
8. ایئر چیف مارشل لاء حکیم اللہ خان، چیف آف ایئر سٹاف
9. میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب
10. جنرل (ر) رحیم الدین خان، قائم مقام گورنر سندھ
11. لیفٹیننٹ جنرل (ر) فضل حق، وزیر اعلیٰ سرحد
12. میر ظفر اللہ خان جمالی، وزیر اعلیٰ بلوچستان
13. مسٹر اختر علی قاضی، سینئر وزیر سندھ

1988ء کے عام انتخابات

16 نومبر کو ملک میں قومی اسمبلی کے عام انتخابات ہوئے۔ جب کہ صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات 19 نومبر کو ہوئے۔ ان انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کو قومی و صوبائی انتخابات میں مجموعی طور پر دوسری جماعتوں کے مقابلے میں اکثریت حاصل ہوئی۔ جب کہ اسلامی جمہوری اتحاد دوسرے نمبر پر رہا۔ قومی اسمبلی کی 207 نشستوں کے لیے 1246 امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ سابق غیر جماعتی اسمبلی کے 141 ارکان نے انتخابات میں حصہ لیا۔ جب کہ 63 سابق ارکان انتخابات سے ریٹائر ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے 184 امیدواروں کو جب کہ آئی جے آئی نے 72 امیدواروں کو انتخابی ٹکٹ جاری کئے۔ پاکستان عوامی اتحاد نے 92 جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) نے 39، عوامی نیشنل پارٹی نے 30 اور پاکستان نیشنل پارٹی نے 16 امیدوار کھڑے کئے۔ ان انتخابات میں سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو، نیشنل پیپلز پارٹی کے سربراہ اور سندھ کے سابق وزیراعلیٰ مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی، سندھ کے نامور روحانی پیشوا پیر پگاڑا صاحب، نگران کابینہ کے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر الٰہی بخش سومرو، سابق سپیکر قومی اسمبلی سید فخر امام، وفاقی وزیر برائے مذہبی اُمور مولانا وصی مظہر، قومی محاذ آزادی کے چیئرمین مسٹر معراج محمد خان، سابق اٹارنی جنرل آف پاکستان مسٹر یحییٰ بختیار، پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ میر غوث بخش بزنجو، تحریک استقلال کے سربراہ ایئر مارشل (ر) اصغر خان، جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب، مسلم لیگ (قاسم گروپ) کے سربراہ ملک محمد قاسم اور جنرل (ر) ٹکا خان کو اپنے مدِ مقابل امیدواروں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

19 نومبر 1988ء کو ملک میں صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات ہوئے۔ نشستوں کی مجموعی تعداد 460 تھی، پنجاب میں 240 سندھ میں 100، سرحد میں 80 اور بلوچستان میں 40 نشستیں تھی۔ چاروں صوبائی اسمبلیوں کی 460 نشستوں کے لیے 3521 امیدواروں نے

انتخابات میں حصہ لیا۔ جب کہ سیاسی پارٹیوں کے نامزد کردہ اور آزاد امیدواروں کی بالترتیب تعداد 1549 اور 1972 تھی۔ پنجاب کی 240 نشستوں کے لیے مجموعی طور پر 1667، سندھ کی 100 نشستوں کے لیے 904 سرحد کی 80 نشستوں کے لیے 580 اور بلوچستان کی 40 نشستوں کے لیے 373 امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا جب کہ 48 ملین رجسٹرڈ رائے دہندگان نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ ملک بھر میں جو ووٹ ڈالے گئے۔ اُن میں پیپلز پارٹی کو پنجاب میں 32.7 فیصد، سندھ میں 45.1 فیصد، سرحد میں 19.9 فیصد، بلوچستان میں 10.8 فیصد ووٹ ملے۔ جب کہ اسلامی جمہوری اتحاد کو پنجاب میں 33.2 فیصد، سندھ میں 70 فیصد، سرحد میں 25.1 فیصد اور بلوچستان میں 23 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ آزاد اُمیدواروں کو پنجاب میں 21.7 فیصد، سندھ میں 41 فیصد، سرحد میں 28.6 فیصد اور بلوچستان میں 23.9 فیصد ووٹ ملے۔ جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کو پنجاب میں 0.4 فیصد، سندھ میں 0.6 فیصد، سرحد میں 7.5 فیصد اور بلوچستان میں 9.8 فی صد ووٹ ملے۔ صوبائی انتخابات کی ایک نمایاں بات یہ تھی کہ پاکستان پیپلز پارٹی جس نے قومی اسمبلی کے عام انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلے میں پنجاب میں 52 نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کو 94 نشستیں حاصل ہوئیں۔ جب کہ اسلامی جمہوری اتحاد نے جس نے قومی اسمبلی کے عام انتخابات میں مجموعی طور پر پنجاب میں 46 نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس نے صوبائی انتخابات میں 108 نشستیں جیت کر پیپلز پارٹی پر اپنی اکثریت قائم کی۔ جس کے نتیجے میں پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت قائم ہوئی۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج اور سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کی تفصیل ذیل میں دی جاری ہے۔

صوبائی اسمبلیوں کے صوبہ وار انتخابی نتائج

نمبر شمار	سیاسی جماعتوں کے نام	پنجاب	سندھ	سرحد	بلوچستان	حاصل کردہ مجموعی نشستیں
1	پاکستان پیپلز پارٹی	94	67	20	3	184
2	اسلامی جمہوری اتحاد	108	1	28	8	145
3	عوامی نیشنل پارٹی	-	-	12	-	12
4	جمعیت علماء اسلام	1	-	2	-	3
	(ف)	2	-	-	-	2
5	پاکستان عوامی اتحاد	2	-	2	-	4
6	پاکستان جمہوری پارٹی	-	-	2	-	2
7	پاکستان نیشنل پارٹی	1	-	2	-	3
8	نیشنل پیپلز پارٹی (کھر)	-	-	2	6	8
9	بلوچستان نیشنل الائنس	32	31	15	6	84
10	آزاد امیدوار	-	1	-	-	1
11	پنجاب پختون اتحاد وطن پارٹی	-	-	-	1	1
	مجموعی نشستیں	240	100	85	24	449

بے نظیر بھٹو کی بطور وزیر اعظم تقرری

چونکہ قومی اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل تھی۔ اس لیے قائم مقام صدر مسٹر غلام اسحٰق خان نے پی پی پی کی شریک چیئر مین مسز بے نظیر بھٹو کو یکم دسمبر 1988ء کو ملک کی وزیر اعظم نامزد کیا۔ وہ ملک کی پہلی اور برصغیر کی تیسری خاتون وزیر اعظم تھیں۔ انہوں نے 2 دسمبر 1988ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس طرح صدر ضیاء جس خاندان اور جماعت کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لیے گیارہ سال کوششیں کرتے رہے۔ وہ اُن کی وفات کے صرف تین ماہ بعد برسر اقتدار آ گئی۔ اور ملک خاتون وزیر اعظم کے ایک نئے تجربے سے رُوشناس ہوا۔ مرکز میں اگرچہ پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی مگر صدر غلام اسحٰق خان اور وزیر خارجہ یعقوب علی خان کا تعلق اسلامی جمہوری اتحاد سے تھا۔ اسی طرح صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں۔ مگر ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت قائم ہوئی۔ اس طرح بلوچستان میں بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے میر ظفر اللہ جمالی کو صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے وزیر اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ مگر بعد ازاں وہ اسمبلی میں اکثریت برقرار نہ رکھ سکے اور انہوں نے گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دیا۔ جس کے نتیجے میں 15 دسمبر 1988ء کو بلوچستان اسمبلی توڑ دی گئی۔ تاہم اسکے خلاف بلوچستان ہائی کورٹ سے رجوع کیا گیا۔ اور آخر اسمبلی بحال ہوگئی۔ پیپلز پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد صرف پنجاب کے گورنر مخدوم سجاد حسین قریشی کو ہٹا کر پارٹی کے جنرل سیکرٹری جنرل ریٹائرڈ ٹکا خان جو راولپنڈی سے قومی اسمبلی کا الیکشن شیخ رشید کے مقابلے میں ہار گئے تھے کو پنجاب کا گورنر بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم سجاد حسین کو گورنری سے اس لیے ہٹایا گیا کہ انہیں کہا گیا تھا کہ وہ میاں نواز شریف سے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف نہ لیں۔ مگر انہوں نے آئین کے تحت میاں نواز شریف سے حلف لے لیا۔ جس کے خمیازے میں اُنہیں گورنری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بلوچستان اسمبلی بحال ہونے کے بعد وہاں پر بلوچستان

الائینس، جمعیت علماءاسلام (ف) اوراسلامی جمہوری اتحاد نے مل کرمخلوط حکومت قائم کی۔ جس کا وزیراعلیٰ بلوچستان الائنس کے چیئرمین نواب اکبربگٹی کو بنایا گیا۔اس طرح پنجاب اور بلوچستان میں مرکز کی مخالف حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ پاکستان میں نیا تجربہ تھا۔ جب کہ 1973ء میں سرحد اور بلوچستان میں مرکز کی مخالف حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔مگر مرکزی حکومت نے کچھ عرصہ بعداُنہیں توڑدیا۔

12 دسمبر 1988ء کوصدارتی انتخابات ہوئے۔ قائم مقام صدر غلام اسحٰق خان پاکستان جمہوری پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان، مسٹراحمد ابراہیم جعفراور مسٹرمحمودنوروز خان ملک صدر کے عہدے کے لیے اُمیدوار تھے۔قائم مقام صدر غلام اسحٰق خان پاکستان پیپلز پارٹی اوراسلامی جمہوری اتحاد کے متفقہ امیدوار تھے۔ جب کہ اُن کے مدمقابل مضبوط اُمیدوارنوابزادہ نصراللہ خان تھے۔جنہوں نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے عموماًاورایم آرڈی کی تحریک کے دوران صدرضیاءکے دور میں خصوصاً گراں قدرخدمات سرانجام دیں۔انتخابی نتائج کے مطابق مسٹرغلام اسحٰق خان کو 603،نوابزادہ نصراللہ خان کو 140، مسٹراحمد ابراہیم جعفرکو 6اور مسٹرمحمد نوروزخان ملک کوصرف 3ووٹ ملے۔اس طرح مسٹرغلام اسحٰق خان پانچ سال کے لیے پاکستان کے ساتویں صدرمنتخب ہوگئےاور پاکستان میں ایک ایسے سیاسی دورکا آغاز ہواجس کاصدرضیاءکی وفات سے پہلےتصورنہیں کیاجاسکتا تھا۔

بےنظیرکا پہلا اقدام:

وزیراعظم بننے کے بعدریڈیواورٹیلی ویژن پرقوم سے خطاب کے دوران بےنظیربھٹو نے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع کیا۔ 7دسمبر 1988ءکوصرف پنجاب کی جیلوں سے 760 قیدی رہا کیۓ گئے۔موت کی سزاپانے والے 889 قیدیوں کی سزائیں عمرقید میں تبدیل کردی گئیں۔ 18 سال سے کم عمر کے تمام قیدیوں کورہا کرنے کاحکم دیاگیا۔وزیراعظم نے صرف سیاسی قیدیوں کورہا کرنے کا اعلان کیا تھا۔مگر جب رہائی کے احکامات جاری کیۓ گئے اور قیدیوں کورہا کیا گیاتو رہائی پانے والوں میں اکثریت ان قیدیوں کی تھی جوسنگین جرائم میں ملوث تھےاورمختلف عدالتوں سے سزایافتہ تھے۔مثلاً حکومت نے مرحوم صدرضیاءالحق کو بوبی ٹریپ کے ذریعے ہلاک کرنے والے دومجرموں زرشاداورزاہدبنگش جن کوخصوصی عدالت نے بالترتیب 65

اور 25 سال قید بامشقت کی سزاسنائی تھی کوبھی رہا کردیا۔اسی طرح رہا ہونے والے قیدیوں میں ایسے مجرم تھے جوتخریب کاری،قتل،بموں کے دھماکوں اوراغوا کے سنگین جرائم میں ملوث تھے۔اُن میں 54 قیدی ایسے تھے جنہوں نے بیرونِ ملک دہشت گردی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ قتل، ڈکیتی، زنا اور دہشت گردی میں ملوث 64 قیدی سنٹرل جیل ملتان سے رہا کیۓ گئے۔ مواصلات کے ذرائع کوتباہ کرنے،سرکاری املاک کونقصان پہنچانے، دھماکے کرنے،فوج کے خلاف نفرت پھیلانے اورمجرمانہ سازش کرنے کے الزام میں ملوث 186 قیدیوں کوبھی رہا کیا گیا۔اگرچہ رہا ہونے والے قیدی خطرناک مجرم تھےمگرپیپلز پارٹی کے نزدیک وہ سیاسی قیدی تھے کیونکہ اُن کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔چونکہ جنرل ضیاءنے پیپلز پارٹی کواقتدار سے محروم کیا تھااس لیے پیپلز پارٹی کی قیادت اورکارکن اُن کے سخت مخالف تھےاورانہوں نے ان کی حکومت کمزور کرنے،اُس کا تختہ اُلٹنےاورجنرل ضیاءکوقتل کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کیااور بےنظیربھٹو کے بھائی میرمرتضےٰ بھٹو کی طرف سے بنائی گئی تنظیم الذوالفقار نے ضیاءحکومت کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں بھرپورحصہ لیا۔پیپلز پارٹی کے برسراقتدارآنے کے بعدسنگین جرائم میں ملوث افراد کا رہا ہوجانا کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ یہ دراصل سیاسی مجرم تھےلیکن اپوزیشن کے نزدیک یہ نہایت غلط اقدام تھااس لیے اُس نے اس پرسخت احتجاج کیامگرسب سے زیادہ جس نے اُن کی رہائی کی مخالفت کی وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نوازشریف تھے۔اُنہیں خدشہ تھاپیپلز پارٹی کی حکومت رہا کیۓ جانے والے قیدیوں کواُن کی حکومت کے خلاف استعمال کرے گی۔اُنہوں نے 18 جولائی 1989ءکوصدرمملکت کوایک خط لکھااورالزام عائدکیا کہ ’’وفاقی حکومت نے پنجاب میں امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنے کے لیے جیلوں سے عادی مجرموں،تخریب کاروں اوردہشت گردوں کورہا کردیا ہے۔تاکہ پنجاب میں پُرامن حالات خراب ہوں۔‘‘اُنہوں نے مارشل لاء دورمیں بےنظیربھٹو،وفاقی وزراءاورپیپلز پارٹی کے خلاف پنجاب میں درج کیۓ گئے مقدمات واپس لینے سے انکارکیا۔اورآئی جی پولیس پنجاب کوہدایت کی کہ رہاشدہ قیدیوں کی کڑی نگرانی کی جائے۔جنوری 1989ء سے لے کرجولائی 1990ءتک 17 ماہ کے دوران پنجاب کے مختلف شہروں میں بموں کے دھماکے ہوئے۔ 12 ستمبر 1989ءکوگوجرانوالہ میں ایک مسافربس میں بم کادھماکہ ہواجس میں آٹھ افراد ہلاک اور 30 زخمی ہوئے۔ 2 جنوری 1990ءکوحافظ آباد کے نزدیک نہرکاپُل گرگیا۔جس سے 100 افرادڈوب کرجاں بحق ہوگئےاس سانحہ کا سبب تخریب

کاری بیان کیا گیا۔ 3 اپریل 1990ء کو لاہور میں پھر بم کا دھماکہ ہوا جس میں 3 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے۔ 22 اپریل کو واہ آرڈیننس فیکٹری اور اسلام آباد میں بموں کے دھماکے ہوئے جن میں پانچ افراد ہلاک ہوئے۔ 6 مئی 1990ء کو بادامی باغ ریلوے اسٹیشن لاہور کے قریب راولپنڈی جانے والی تیز گام ایکسپریس میں بم کا دھماکہ ہوا جس میں 9 افراد ہلاک اور 70 زخمی ہوئے۔ 20 جون کو لاہور میں ہونے والے بم کے دھماکے میں 4 افراد ہلاک اور 10 شدید زخمی ہوئے۔ 7 جولائی 1990ء کو ملتان کے جنرل بس سٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک مسافر بس میں خوفناک دھماکہ ہوا۔ جس میں 4 افراد ہلاک اور 10 زخمی ہوئے۔ 19 جولائی کو راولپنڈی میں پٹرول کی سپلائی لائن کو بم مار کر تباہ کر دیا گیا۔ 28 جولائی کو لاہور میں مسافر بس میں بم کے دھماکے میں ایک شخص ہلاک اور 30 زخمی ہوئے۔ 3 اگست 1990ء کو ملتان کی تحصیل شجاع آباد میں محرم کے روز بم کا دھماکہ ہوا۔ جس میں 6 افراد ہلاک اور 77 زخمی ہوئے۔ اسی طرح فیصل آباد میں نامعلوم افراد نے لاتعداد فیکٹریوں کو آگ لگائی جس کی وجہ سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ مختصر یہ کہ پنجاب کے شہروں میں جتنے بھی دھماکے ہوئے وفاقی حکومت نے پنجاب حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ وہ صوبے میں امن وامان قائم کرنے میں ناکام ہوگئی ہے جبکہ حقائق اس کے برعکس تھے۔ یہ ''خاد'' اور ''را'' کی کارروائیاں تھیں۔ وفاقی حکومت نے نہ تو کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار کیا اور نہ ہی متاثرہ خاندانوں کو مالی امداد فراہم کی۔ بلکہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے پنجاب میں امن و امان کی نازک صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے اسے سندھ کی نازک صورتِ حال سے مماثلت دے کر یہ تاثر دیا کہ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت سندھ میں امن قائم نہیں کر سکی تو پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت بھی امن قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کے رہنماؤں کے مابین کس قدر ذہنی فاصلہ تھا کہ اُنہوں نے باہم مل کر دہشت گردی کو روکنے اور عوام کے جان و مال کا تحفظ کرنے کی بجائے بدامنی کے واقعات کو ایک دوسرے کی کمزوری اور نااہلیت قرار دیا۔

بلوچستان اسمبلی کیوں ٹوٹی؟

1988ء کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں کوئی بھی سیاسی جماعت بلوچستان میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے آٹھ، پیپلز پارٹی نے تین،

جمعیت علماء اسلام (ف) نے دو اور وطن پارٹی نے ایک نشست حاصل کی۔ جب کہ پانچ آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس طرح کوئی بھی سیاسی پارٹی حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور مخلوط حکومت کا بننا ناگزیر تھا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود آئی جے آئی کے میر ظفر اللہ خاں جمالی صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ مگر یہ حکومت اتنی ناپائیدار تھی کہ 15 دن سے زیادہ نہ چل سکی اور 15 دسمبر 1988ء کی رات کو بلوچستان کے گورنر ریٹائرڈ جنرل محمد موسیٰ نے اچانک اسمبلی توڑ دی ان کے اس اقدام سے پورے ملک میں شور مچ گیا۔ کیونکہ عوام کو یہ توقع نہیں تھی کہ مرکز میں جمہوریت کی علمبردار سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کی حکومت کی موجودگی میں صوبائی اسمبلی ٹوٹ سکتی ہے۔ تاہم وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اس واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسمبلی ان کے مشورے کے بغیر توڑی گئی ہے اور انہیں اسمبلی ٹوٹنے کے بعد اس کا علم ہوا۔ انہوں نے اسمبلی توڑنے کے اقدام کی مذمت کرنے کی بجائے آٹھویں ترمیم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ ''جب تک یہ ترمیم آئین میں موجود ہے۔ اسمبلیاں ٹوٹتی رہیں گی۔'' اور آٹھویں ترمیم کے خاتمے پر زور دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ''گورنر وفاقی حکومت کو آگاہ کیے بغیر اسمبلی توڑنے کا اقدام اٹھا سکتا ہے۔ اپوزیشن کو اگر یہ فیصلہ قبول نہیں تو آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے لیے وفاقی حکومت سے بات کرے ورنہ عدالت میں جائے گورنر کا اقدام آئینی ہے۔''

جمعیت علماء اسلام کے جنرل سیکریٹری مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ 2 دسمبر 1988ء کو بلوچستان اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر 144 ارکان کے ایوان میں میر ظفر اللہ جمالی کو 21 ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ وزیراعلیٰ کے انتخابات کے موقع پر یہی صورت حال برقرار رہی۔ بار بار گنتی کرنے پر ایک رکن اسمبلی نے واک آؤٹ کیا تو پانچ منٹ بعد اسمبلی کے دروازے بند کر دیئے گئے اور دوبارہ گنتی کی گئی تو ووٹ برابر تھے۔ اس موقع پر اسمبلی کے اسپیکر سردار محمد خان بادوزئی جن کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا نے اپنا کاسٹنگ ووٹ استعمال کر کے میر ظفر اللہ جمالی کے وزیراعلیٰ منتخب ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں اسپیکر کے کاسٹنگ ووٹ کے مسئلہ سے بلوچستان کے گورنر، صدر مملکت اور وزیراعظم کو آگاہ کیا گیا۔ اُنہوں نے تحقیقات کرانے کا یقین دلایا۔ ابتدا میں میر ظفر اللہ خان جمالی سے طے ہوا تھا کہ وہ اپنی قومی اسمبلی کی نشست کا حلف اُٹھائیں گے اور صوبائی نشست کو خالی کریں گے اور جمعیت علماء اسلام اُن کے مشورے سے بلوچستان میں صوبائی حکومت تشکیل دے گی۔ مگر جمالی منحرف ہو گئے۔ بعد

ازاں 13 دسمبر 1988ء کو ظفر اللہ جمالی اور طارق رحیم سے مذاکرات ہوئے اور ہم نے اپنا مؤقف دہرایا کہ جمالی مستعفی ہو جائیں کیونکہ وہ غیر قانونی طور پر وزیر اعلیٰ بنے ہیں۔ جمالی نے پیشکش کی کہ اگر جے یو آئی اُنہیں وزیر اعلیٰ تسلیم کرے تو اُسے گورنر کا عہدہ دیا جائے گا۔ ہم نے اس سے اتفاق کر لیا۔ تاہم مطالبہ کیا کہ پہلے جمالی مستعفی ہو کر یکم دسمبر والی پوزیشن پر آ جائیں مگر جمالی مستعفی ہونے پر تیار نہ ہوئے۔ 14 دسمبر کی رات کو ایک بجے تک بلوچستان نیشنل الائنس سے مذاکرات ہوتے رہے جو کامیاب ہوئے اور دو آزاد ارکان اسمبلی نے بھی جمعیت علماء اسلام کی حمایت کرنے کا یقین دلایا۔ 15 دسمبر 1988ء کو اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کے دستخطوں پر مشتمل یادداشت گورنر بلوچستان کو پیش کی جانی تھی کہ صبح ریڈیو سے اسمبلی ٹوٹنے کی خبر سنی گئی۔''

بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے بعد اپوزیشن نے احتجاجاً قومی اسمبلی کے اجلاس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ میر ظفر اللہ جمالی کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ اور پورے ملک میں اسمبلی توڑنے کے اقدام کی مذمت کی گئی۔ اور گورنر کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ پیپلز پارٹی نے اس صورتحال سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور صدر مملکت کو تجویز پیش کی کہ یحییٰ بختیار کو بلوچستان کا گورنر بنایا جائے۔ مگر صدر نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ نواب اکبر بگٹی نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو پر زور دیا کہ وہ اسمبلی بحال کر دیں مگر اُنہوں نے انکار کر دیا۔ 19 دسمبر کو یحییٰ بختیار نے انکشاف کیا کہ وفاقی حکومت 1973ء کے آئین اور بلوچستان اسمبلی کی ایک ساتھ بحالی کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آٹھویں ترمیم نے آئین کو پارلیمانی کی بجائے صدارتی بنا دیا ہے۔ اس سے صدر کو اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر اپوزیشن نے جمالی کے خلاف عدم اعتماد کا نوٹس دیا ہوتا تو گورنر اسمبلی نہ توڑتا۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے جب بلوچستان کے بحران کے بارے میں اخبار نویسوں نے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''بلوچستان میں کوئی بحران نہیں متاثرین قانون کی عدالت میں جائیں یا عوام کی۔''

وفاقی حکومت نے بلوچستان اسمبلی کی بحالی میں بالکل دلچسپی نہ لی۔ بلکہ اپوزیشن کے مطالبہ کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے عوام میں یہ تاثر پھیل گیا کہ گورنر جنرل موسیٰ نے صدر اور وزیر اعظم کی رضامندی سے اسمبلی توڑی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورنر اسمبلی توڑنے والی رات اسلام آباد میں تھے اور وہ ایوان صدر بھی گئے۔ جہاں اُن کی صدر اور وزیر اعظم سے ملاقات بھی ہوئی۔ گورنر اتنا بڑا اقدام صدر اور وزیر اعظم کی رضامندی کے بغیر کیسے اُٹھا سکتے ہیں؟

حقیقت یہ تھی کہ بلوچستان اسمبلی توڑنے میں صدر غلام اسحٰق خان کی رضامندی بھی شامل تھی۔ کیونکہ صدارتی انتخابات میں بلوچستان اسمبلی کے بیشتر ارکان نے صدر کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ مختصر یہ کہ صدر اور وزیر اعظم میں سے کسی نے بھی نہ تو گورنر کے خلاف کاروائی کی نہ اسمبلی کی بحالی کے لیے کوئی اقدام اُٹھایا۔ بلکہ اسمبلی توڑنے کے اتنے بڑے واقعہ کو معمولی اور غیر اہم قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی۔ 22 دسمبر کو ریٹائرڈ جسٹس خُدا بخش مری کو بلوچستان کا نگران وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا اور ان کی پانچ رُکنی کابینہ نے حلف اُٹھایا۔ حکومت سے مایوس ہونے کے بعد اپوزیشن نے عدالت سے رجوع کیا اور اسمبلی کی بحالی کے لیے بلوچستان ہائی کورٹ میں چار پٹیشنز دائر کی گئیں۔ جن کی باقاعدہ سماعت کے بعد بلوچستان ہائی کورٹ نے 23 جنوری 990؛ء کو اسمبلی بحال کر دینے کا حکم دیا اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ ''وزیر اعلیٰ آئینی طور پر گورنر کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دینے کے مجاز نہ تھے۔''

اس فیصلے کے بعد فوراً نگران وزیر اعلیٰ خُدا بخش مری مستعفی ہو گئے۔ 25 جنوری کو آئی جے آئی، جمعیت علمائے اسلام اور بلوچستان نیشنل الائنس کے درمیان مخلوط حکومت کے قیام کے لیے معاہدہ ہوا۔ جس کے تحت تینوں جماعتوں نے نواب اکبر بگٹی کو مخلوط حکومت کا سربراہ بنانے پر رضامندی ظاہر کی اور 5 فروری 1989ء کو انہوں نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ اس طرح پنجاب کے بعد بلوچستان میں بھی پیپلز پارٹی کی مخالف حکومت قائم ہو گئی اور 1973ء جیسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ جب سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی مخالف حکومتیں قائم ہوئی تھیں جنہوں نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسیوں سے اختلاف کیا۔ جس پر اُنہیں توڑ ڈالا گیا۔ نواب اکبر بگٹی ذہنی طور پر پیپلز پارٹی کے مخالف تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کو بلوچستان اسمبلی توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا اور میاں نواز شریف کے ساتھ مل کر صوبوں کے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرحلے پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ بے نظیر کے برسر اقتدار آتے ہی اُن کے خلاف سازشوں کا آغاز ہو گیا اور خصوصاً اسٹیبلشمنٹ میں موجود لوگ جو انہیں پسند نہیں کرتے تھے مسائل پیدا کرنے لگے۔

سندھ کا بحران کس نے پیدا کیا؟

بے نظیر بھٹو کی بطور وزیر اعظم نامزدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی پارٹی نے 1988ء کے عام انتخابات میں صوبہ سندھ سے واضح اکثریت حاصل کی تھی۔ اس وقت سندھ میں امن وامان کی حالت بڑی خراب تھی اور پورا سندھ اغواء، ڈکیتی، قتل وغارت، تخریب کاری اور دہشت گردی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مزید براں یہ کہ سندھ میں لسانی اور نسلی تعصب کی جڑیں بھی گہری ہو چکی تھیں۔ پیپلز پارٹی سے اقتدار کی منتقلی کے بعد یہ توقع کی گئی تھی کہ اس کی قیادت سندھ میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اور بھارت جو اپنے ایجنٹوں اور تخریب کاروں کے ذریعے سندھ میں لاقانونیت اور افراتفری کو ہوا دے رہا ہے اس کی مداخلت کم ہو جائے گی۔ مگر یہ توقعات پوری نہ ہوئیں بلکہ پیپلز پارٹی کے دور میں بدامنی اور بھارتی مداخلت میں اضافہ ہوا اور 20 ماہ کے دوران جس قدر قتل وغارت اور دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے اُس کی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ اس دور میں ہزاروں افراد دہشت گردی کے نتیجے میں ہلاک ہوئے۔ سینکڑوں افراد جن میں نامور سیاستدان، صنعت کار اور تاجر شامل تھے اغوا ہوئے۔ بدامنی کی وجہ سے کراچی اور حیدرآباد میں واقع 60 فی صد صنعتیں بند ہو گئیں اور کراچی کے بے شمار صنعت کار اپنی صنعتیں اور جائیدادیں چھوڑ کر لاہور اور فیصل آباد چلے آئے۔ اسی طرح ہزاروں غیر سندھیوں کو اندرون سندھ کے مختلف علاقوں سے اپنے گھربار چھوڑ کر کراچی، حیدرآباد اور پنجاب میں نقل مکانی کرنی پڑی۔ اس دور میں سندھودیش کی تحریک زور پکڑ گئی۔ اور متعدد مقامات پر قومی پرچم کو نذر آتش کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے کراچی، حیدرآباد اور سندھ کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے غیر سندھیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا اور ان کے خلاف انتہا پسند سندھی تنظیموں کو استعمال کیا۔ جس کی وجہ سے لاتعداد نسلی اور لسانی فسادات ہوئے۔ سندھیوں نے غیر سندھیوں اور غیر سندھیوں نے سندھیوں کو چن چن کر بیدردی سے قتل کیا۔ اس کے علاوہ سندھ میں پنجاب کے خلاف

تعصب کو بھی اُبھارا گیا۔ جس کی وجہ سے کراچی سے پنجاب آنے والی مسافر گاڑیوں اور بسوں کو راستے میں لوٹا گیا۔ اور اُن کے مسافروں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا۔ جس کا آغاز 30 جنوری 1989ء کو جام شورو کے قریب خوشحال ایکسپریس پر ڈاکوؤں کے حملے سے ہوا۔ جس کے دوران مسافروں سے نقدی اور سامان چھینا گیا۔ 3 جنوری 1990ء کو سانگھی ریلوے اسٹیشن پر ملتان سے کراچی جانے والی ذکریا ایکسپریس کو اسٹیشن ماسٹر اور کیبن مینوں کی غفلت کی وجہ سے خوفناک حادثہ پیش آیا۔ جس میں 300 سے زائد مسافر ہلاک اور 800 سے زائد زخمی ہوئے۔ مسافروں سے بھرے ہوئے گاڑی کے آٹھ ڈبے مکمل طور پر تباہ ہو گئے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر اور کیبن مینوں کو علم تھا کہ جس لائن پر زکریا ایکسپریس آرہی ہے۔ اس پر ایک خالی مال گاڑی کھڑی ہے مگر اس کے باوجود اُنہوں نے سگنل تبدیل نہ کیا۔ 31 مئی کو بدین سے حیدرآباد جانے والی مہران ایکسپریس پر لورالائی ریلوے اسٹیشن کے قریب دو ہزار مسلح افراد نے حملہ کر کے 7 مسافروں کو ہلاک اور 20 کو زخمی کیا۔ اس گاڑی میں سوار مسافر بدین اور ٹنڈو محمد خان سے اپنے گھربار چھوڑ کر حیدرآباد جا رہے تھے۔ بعد ازاں حیدرآباد کے اسٹیشن پر متعدد ڈبوں کو آگ لگائی گئی۔ 8 مارچ کو دادو سے 20 میل دُور خیرو ڈیرو کے قریب گاؤں ہاشم جان میں ڈاکوؤں نے اندھادُھند فائرنگ کر کے 20 افراد کو ہلاک کیا۔ 25 اپریل کو کراچی سے پشاور جانے والی عید سپیشل گاڑی پر گمبٹ ریلوے اسٹیشن پر زبردست پتھراؤ کیا گیا۔ اور اُس کے شیشے توڑ دیئے۔ 15 جولائی 1990ء کو کراچی سے لاہور آنے والی کراچی ایکسپریس میں بم کا دھماکہ ہوا۔ جس میں 16 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے گاڑی حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی جب اس میں بم رکھا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد خوفناک دھماکہ ہوا۔ علاوہ ازیں کراچی سے لاہور آنے والی مختلف مسافر گاڑیوں کو لوٹنے اور ان کے مسافروں کو زدوکوب کرنے کی درجنوں وارداتیں ہوئیں۔ اندرونِ سندھ نیشنل ہائی ویز پر راہ زنی کے بے شمار واقعات رونما ہوئے اور مسلح ڈاکو گاؤں کے گاؤں لوٹنے لگے۔ 12 مئی 1990ء کو ٹنڈو آدم کے ایک گاؤں حاجی سوان خان گوپانگ کو ڈاکوؤں نے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اُنہوں نے اس گاؤں کے مکینوں سے 10 لاکھ روپے تاوان طلب کیا تھا۔ تاوان ادا نہ کرنے پر ڈاکوؤں نے ایک اور گاؤں جام سموں کو آگ لگائی اور ٹنڈو اللہ یار، ٹنڈو جام اور ٹنڈو قیصر کے زمینداروں سے اپنی جانوں کو بچانے کے عوض لاکھوں روپے تاوان طلب کیا۔ اسی روز سکھر کے ایک گاؤں خان واہن سے ڈاکوؤں نے 12 افراد کو اغوا کیا اور تاوان کی رقم 10 لاکھ روپے کا

بند و بست کرنے کے لیے ان میں سے 8 کو رہا کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر مقررہ مدت میں تاوان ادا نہ کیا گیا تو وہ بقیہ 4 افراد کو گولی مار دیں گے۔ 9 مئی 1990ء کو ڈاکو سندھ کے وزیر داخلہ مخدوم رفیق الزماں کے سُسر گل محمد طاہرانی کو اغوا کر کے لے گئے اور بڑی مشکل سے 7 روز بعد انہیں ضلع دادو کے پہاڑی علاقوں سے برآمد کیا گیا۔ 21 مئی 1990ء کو ڈاکوؤں نے جام شورو کے قریب مسافر بسوں کو لوٹا۔ خواتین کی بے حرمتی کی۔ 12 مسافروں کو ایک بس سے اُتار کر گولی ماردی۔ مئی 1990ء کے مہینے میں سندھ کے مختلف علاقوں سے 100 افراد کو اغوا کیا گیا۔ اور تاوان نہ ملنے پر ان میں سے 40 افراد کو قتل کر دیا گیا۔ 4 جنوری 1990ء کو سینٹ میں سندھ میں امن و امان کی صورت حال پر بحث کے دوران حکومت کی طرف سے بتایا گیا کہ 1989ء کے دوران سندھ میں ہر 19 ویں منٹ پر واردات ہوئی اور ہر آٹھویں گھنٹے کے بعد اغوا کی واردات ہوئی۔ ہر چھ گھنٹے بعد ایک شخص کو قتل کیا گیا۔ سندھ کے مختلف تھانوں میں ان جرائم کے 2700 مقدمات درج کئے گئے جب کہ اس عرصہ میں 1070 افراد اغوا ہوئے۔ 260 کاریں چھینی گئیں۔ 545 دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے۔ اور 28 ڈکیتی کی وارداتیں ہوئیں۔

دہشت گردی اس قدر پھیل گئی کہ 16 اکتوبر 1989ء کو سندھ کے تین وزراء مسٹر جاوید اختر، شمس العارفین اور الطاف حسین کاظمی کی کاروں پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی اور فرار ہو گئے۔ 31 اگست 1989ء کو سنٹرل جیل حیدر آباد کے قیدیوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سمیت پانچ سپاہیوں کو یرغمال بنالیا۔ ان کو چھڑوانے کے لیے پولیس نے زبردست فائرنگ کی جس کے نتیجے میں 9 قیدی ہلاک اور 20 زخمی ہوئے۔ 8 جنوری کو سندھ اسمبلی کے رُکن رحیم بخش جمالی نے کراچی کی ایک لیڈی ڈاکٹر فوزیہ کو قتل کر کے اس کی نعش سپر ہائی وے پر پھینک دی۔ مئی 1990ء میں دادو کے قریب سروے آف پاکستان کے چار ملازمین اسمٰعیل، ریحان، صابر انیس اور منظور کو ڈاکوؤں نے اغوا کیا۔ جس کے بعد غیر ملکی ماہرین اور کارکنوں نے اندرون سندھ آئل فیلڈ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح تیل و گیس کی ترقیاتی کارپوریشن کے چار ملازموں کو قتل کیا گیا۔ جس کے خلاف کارپوریشن کے ملازمین نے پورے ملک میں ہڑتال کی۔ 7 جون کو کراچی میں نامعلوم نقاب پوشوں نے پاک لینڈ سیمنٹ فیکٹری کے 13 ورکروں کو فیکٹری کی بس سے اُتار کر گولی ماردی۔ 2 جولائی کو ملک کے سب سے بڑے پاور ہاؤس جام شورو کو سندھی اور غیر سندھی ملازمین کے درمیان فسادات کے بعد غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیا گیا۔

سندھ میں لاقانونیت اس قدر پھیل گئی کہ اخبار نویسوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور صرف ایک ماہ میں مجموعی طور پر سندھ میں چار اخبار نویسوں کو قتل کیا گیا۔ ان میں روزنامہ نوائے وقت کے نمائندے مظاہر حسین نقوی، روزنامہ جنگ کے نمائندے راحت کاظمی، پاکستان پریس انٹرنیشنل کے نمائندے احمد کمال اور زمین اخبار کے نمائندے محمد علی خالد شامل ہیں اور یہ لاقانونیت کی انتہا تھی۔ 20 ماہ کے دوران فسادات اور قتل و غارت کے واقعات اور ان میں ہلاک و زخمی ہونے والوں کی تعداد کا اندازہ درج ذیل گوشوارے سے لگایا جا سکتا ہے۔

(گوشوارہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

	کراچی		حیدرآباد		اندرونِ سندھ	
تاریخ	ہلاک	زخمی	ہلاک	زخمی	ہلاک	زخمی
15 دسمبر 1988ء	10	18	-	-	-	-
کیم جنوری 1989ء	1	2	-	-	-	-
24 جنوری 1989ء	-	-	-	-	3	13
31 جنوری 1989ء	-	3	-	-	-	-
کیم فروری 1989ء	3	-	-	-	-	-
5 فروری 1989ء	-	-	1	1	-	-
6 فروری 1989ء	-	-	2	1	-	-
10 فروری 1989ء	-	-	-	-	1	-
26 فروری 1989ء	-	-	-	-	5	-
10 مارچ 1989ء	2	-	-	-	-	-
11 مارچ 1989ء	8	-	-	-	-	-
14 مارچ 1989ء	-	5	-	-	-	-
17 مارچ 1989ء	-	12	-	-	-	-
2 اپریل 1989ء	3	7	-	-	1	1
6 اپریل 1989ء	-	-	13	50	-	-
7 اپریل 1989ء	-	-	-	7	-	-
8 اپریل 1989ء	-	3	-	-	-	-
10 اپریل 1989ء	1	1	2	-	-	-

تاریخ	ہلاک	زخمی	ہلاک	زخمی	ہلاک	زخمی
14 اپریل 1989ء	2	4	-	-	-	-
19 اپریل 1989ء	-	-	-	-	10	12
23 اپریل 1989ء	4	5	-	-	-	-
24 اپریل 1989ء	-	-	-	-	4	2
28 اپریل 1989ء	-	-	4	-	-	-
10 جولائی 1989ء	8	15	13	20	-	-
19 جولائی 1989ء	-	-	6	20	-	-
5 اگست 1989ء	8	15	-	-	-	-
19 اگست 1989ء	15	25	-	-	-	-
31 اگست 1989ء	-	-	9	21	-	-
17 ستمبر 1989ء	-	-	6	25	-	-
19 ستمبر 1989ء	-	-	3	4	-	-
2 نومبر 1989ء	4	10	-	-	-	-
13 دسمبر 1989ء	-	-	7	28	-	-
17 دسمبر 1989ء	-	-	19	30	-	-
20 دسمبر 1989ء	4	10	-	-	-	-
26 دسمبر 1989ء	-	-	3	7	-	-
3 جنوری 1989ء	-	-	-	-	400	1000
30 جنوری 1990ء	11	5	-	-	4	6
31 جنوری 1990ء	-	-	3	20	20	10

4	2	-	1	-	-	2 فروری 1990ء
-	4	-	1	-	-	4 فروری 1990ء
-	4	-	-	-	3	6 فروری 1990ء
-	18	-	-	150	41	7 فروری 1990ء
-	-	-	-	10	7	8 فروری 1990ء
20	7	1	2	-	-	6 مارچ 1990ء
-	-	-	-	40	4	9 مارچ 1990ء
-	3	14	6	-	-	11 مارچ 1990ء
-	-	6	7	-	-	22 مارچ 1990ء
-	5	15	5	-	-	25 مارچ 1990ء
-	-	-	3	-	-	28 مارچ 1990ء
-	-	-	-	10	3	29 مارچ 1990ء
-	-	-	-	-	1	11 اپریل 1990ء
-	-	-	-	1	13	30 اپریل 1990ء
-	-	-	-	15	10	9 مئی 1990ء
-	-	-	-	-	6	10 مئی 1990ء
-	-	7	4	-	3	17 مئی 1990ء
-	-	18	11	-	-	19 مئی 1990ء
-	-	7	4	-	-	21 مئی 1990ء
-	-	20	6	-	4	23 مئی 1990ء

-	-	6	3	-	-	24 مئی 1990ء
-	-	-	16	-	2	25 مئی 1990ء
-	-	107	20	-	-	26 مئی 1990ء
-	-	250	85	60	29	27 مئی 1990ء
-	-	-	-	-	31	28 مئی 1990ء
-	-	-	-	40	18	29 مئی 1990ء
-	-	-	-	75	34	30 مئی 1990ء
-	-	-	-	50	37	31 مئی 1990ء
-	-	-	25	12	10	یکم جون 1990ء
10	7	-	10	-	-	3 جون 1990ء
-	5	-	-	-	-	5 جون 1990ء
-	-	-	17	-	13	7 جون 1990ء
-	2	-	16	-	-	5 جولائی 1990ء
-	-	-	-	-	2	7 جولائی 1990ء
-	-	20	16	150	60	15 جولائی 1990ء
-	-	8	6	-	-	19 جولائی 1990ء
1077	541	712	355	753	405	میزان

مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد 1301

مجموعی طور پر زخمی ہونے والوں کی تعداد 2542

سندھ کے مختلف علاقوں میں سرکاری محکموں میں کام کرنے والے پنجابی ملازمین پر بھی حملے کیے گئے گورنمنٹ کامرس کالج خیر پور کے لیکچرر عباس رضا زیدی کو قتل کیا گیا۔ اسی طرح سکھر کے کالج کے پرنسپل جن کا تعلق لاہور سے تھا کو ہلاک کیا گیا۔ ان افراد کی نعشیں جب پنجاب میں ان کے آبائی علاقوں میں لائی گئیں تو لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

ایم کیو ایم جو ابتداء میں پیپلز پارٹی کی مرکز اور سندھ میں سیاسی حلیف تھی وہ سندھ حکومت سے علیحدہ ہو گئی۔ 4 جون کو صوبائی بجٹ سندھی زبان میں پیش کیا گیا۔ جس کے خلاف ایم کیو ایم کے ارکان نے احتجاجاً اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھی زبان میں بجٹ پیش کر کے قومی زبان کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔

جون 1989ء میں قومی اسمبلی میں جب متحدہ اپوزیشن معرض وجود میں آئی تو ایم کیو ایم کے ارکان نے بھی اس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم 29 جولائی 1989ء کو وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے ایم کیو ایم کے قائد مسٹر الطاف حسین سے چار گھنٹے تک طویل ملاقات کی۔ جس کے بعد پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان 9 نکاتی نیا سمجھوتہ ہوا۔ اور دونوں نے مل کر کام کرنے کا عہد کیا۔ ایم کیو ایم کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ مگر یہ معاہدہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ایم کیو ایم نے 23 اکتوبر 1989ء کو پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنا دوسرا معاہدہ بھی ختم کر دیا۔ اور الزام لگایا کہ سندھ حکومت نے ایم کیو ایم کے ارکان پر تشدد کیا۔ پیپلز پارٹی کی رفاقت چھوڑنے کے بعد ایم کیو ایم نے آئی جے آئی سے مرکزی سطح پر تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ تک وہ اپنے اس فیصلے پر کاربند رہی۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی قیادت نے اسے آئی جے آئی سے توڑنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ کراچی، حیدر آباد اور اندرونِ سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے حامیوں کے مابین ہولناک فسادات شروع ہو گئے۔ جو پیپلز پارٹی کی حکومت کی برطرفی تک جاری رہے۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان محاذ آرائی کی وجہ سے صوبہ سندھ کا انتظامی و سیاسی ڈھانچہ ختم ہو گیا۔ امن نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ دہشت گردی، تخریب کاری، قتل و غارت، اغوا اور ڈکیتی کے واقعات روز کا معمول بن گئے۔ 20 دسمبر 1989ء کو ایم کیو ایم کے حامی سینکڑوں مردوں اور عورتوں نے گرفتار کارکنوں کو چھڑانے کے لیے کراچی میں ماڈل کالونی پولیس اسٹیشن پر حملہ کیا اور ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلائی جس سے چار افراد ہلاک اور 10 زخمی ہوئے۔ دسمبر 1989ء میں سندھ حکومت نے شر

پسندوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف آپریشن کلین اپ شروع کیا جس کے دوران 950 افراد گرفتار کیے گئے۔ ان میں ایم کیو ایم کے ارکان بھی شامل تھے۔ 7 فروری کو ایم کیو ایم کی اپیل پر ''پیپلز پارٹی کی دہشت گردی'' کے خلاف کراچی میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ہر قسم کا کاروبار بند رہا۔ نقل و حمل کے ذرائع مسدود رہے۔ اس روز خونی فسادات ہوئے اور پورا کراچی خون میں نہا گیا۔ فسادات میں 41 افراد ہلاک اور 150 زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں چار پولیس کے سپاہی بھی شامل تھے۔ 35 دکانوں، ایک بنک، پانچ آئل ٹینکر اور متعدد ٹرکوں کو نذر آتش کیا گیا۔ اس روز نامعلوم سیاہ شیشوں والی کاروں سے لوگوں پر فائرنگ کی گئی۔ 8 فروری کو بھی فسادات ہوئے جن میں سات افراد ہلاک ہوئے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ سندھ میں روزانہ درجنوں افراد دہشت گردی، تخریب کاری اور قتل و غارت کا شکار ہو رہے تھے مگر حکومت یہ بتانے سے قاصر تھی کہ ان جرائم کے پیچھے کون سے عناصر کارفرما ہیں۔ حکومت کے اس رویہ کے باعث عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اور ہر فرد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔ 11 فروری 1990ء کو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس نے تمام پاکستانیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ کیونکہ اس روز پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے ایک دوسرے کے اغوا کردہ 27 یرغمالیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان ہیڈ کوارٹر میں ایک دوسرے کے اغوا شدہ افراد کی بازیابی کے لیے پہلے باقاعدہ مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات کراچی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کی ہدایت پر مسلسل تین روز تک ہوئے جس کے بعد پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم کے 9 ارکان اور ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی کے 18 افراد کو ایک دوسرے کے حوالے کیا۔ ابتداء میں دونوں فریقوں کے درمیان رابطہ سندھ فورس کے انسپکٹر جنرل میجر ملک عبدالمعید نے کرایا۔ جس کے بعد ان کے دفتر میں دونوں فریقوں کے درمیان یرغمالیوں کے تبادلے کے سلسلے میں مذاکرات ہوئے یہ پاکستان کی تاریخ کا انوکھا واقعہ تھا کہ دو سیاسی تنظیموں نے ایک دوسرے کے کارکنوں کو اغوا کیا اور یرغمال بنا کر پھر اُنہیں اذیت دی۔ یہ سیاست میں دہشت گردی کا کھلا ثبوت تھا۔ اور سادہ لوح افراد ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے کہ یہ کیسی جمہوریت ہے جس میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے دہشت گردی کی جا رہی ہے۔ اس واقعہ کے بعد ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے حامیوں کے درمیان نفرت کم نہ ہوئی بلکہ ان کے درمیان فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ 11 فروری کو پاکستان سٹیل ملز کراچی میں پیپلز پارٹی اور ایم

کیوایم کے حامیوں کے مابین مسلح تصادم ہوا۔ مسلح گروہوں نے اسٹیل ملز کے پلانٹ پر قبضہ کرلیا۔ اورافسران کو یرغمال بنالیا۔ اوران کے درمیان باہمی فائرنگ سے تین افراد زخمی ہوئے۔ جس کے بعد سٹیل ملز کو فوج کے حوالے کردیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد حالات اتنے خراب ہوگئے کہ 24 فروری 1990ء کو وفاقی حکومت نے سندھ کے وزیراعلیٰ سید قائم علی شاہ کو تبدیل کردیا اوران کی جگہ مسٹرآفتاب شعبان میرانی کو سندھ کا نیا وزیراعلیٰ مقرر کیا گیا۔ تاہم اس تبدیلی کے بعد بھی فسادات جاری رہے۔ 11 مارچ اور 24 اپریل 1990ء کو دومرتبہ میرپور ماتھیلو میں کھاد فیکٹری پر لیبر یونین نے قبضہ کرکے 200 کارکنوں اور افسروں کو یرغمال بنایا۔ جس کی وجہ سے کھاد فیکٹری بند ہوگئی۔ اوراس سے کروڑوں کا نقصان ہوا۔ 6 اپریل 1990ء کو ناتھ ناظم آباد اور کراچی کے دوسرے علاقوں میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے حامیوں کے درمیان زبردست تصادم ہوا۔ جس میں متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس تصادم میں زخمی ہونے والوں میں پی ایس ایف کراچی کے رہنما نجیب احمد بھی شامل تھے۔ جو بعدازاں 11 اپریل کو وفات پاگئے۔ جس کے بعد ایم کیو ایم کے لاتعداد کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ گھر گھر چھاپے مارے گئے۔ ایم کیو ایم نے اپنے گرفتار کارکنوں کو رہائی کے لیے زبردست احتجاجی مظاہرے کئے۔ مگر اس کے باوجود حکومت نے انہیں رہا نہ کیا۔ جس کے بعد 8 اپریل کو ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے تادم مرگ بھوک ہڑتال کردی جس میں ہزاروں مرد وخواتین نے حصہ لیا۔ بھوک ہڑتال کی وجہ سے الطاف حسین کی حالت خراب ہوگئی۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف اور متحدہ اپوزیشن کے متعدد رہنما خود کراچی گئے۔ اورانہوں نے الطاف سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کی اپیل کی اور حکومت پر زور دیا کہ وہ ایم کیو ایم کے کارکنوں کو رہا کرے مگر سینئر وفاقی وزیر بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ '' قاتل رہا نہیں کئے جائیں گے۔ الطاف حسین کو بھوک ہڑتال کا شوق ہے تو وہ ضرور کریں۔'' الطاف حسین کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے کراچی میں کشیدگی شدت اختیار کرگئی۔ جس کی وجہ سے وہاں پر ٹینک اور بکتر بند دستے تعینات کرنا پڑے۔ متحدہ اپوزیشن کے رہنماؤں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ ایم کیو ایم کے قائد سے مذاکرات کرے۔ صدر اسحٰق نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ اپوزیشن کے کافی دباؤ کے بعد وفاقی حکومت الطاف حسین اورسی او پی کے لیڈروں سے مذاکرات پر آمادہ ہوئی اور گورنر سندھ فخرالدین ابراہیم نے وفاقی حکومت کی طرف سے بات چیت کی۔ جس کے نتیجے میں 14 اپریل کو الطاف حسین نے تادم مرگ بھوک ہڑتال ختم کردی۔ اور 15 مئی کو وہ علاج کے لیے

لندن روانہ ہوگئے۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان قتل وغارت کی وجہ سے حالات اتنے خراب ہوگئے کہ 62 غیرملکی سرمایہ کاروں نے کراچی اوراندرون سندھ میں امن وامان کی خراب صورت حال کے پیش نظر منظور شدہ صنعتی یونٹ قائم کرنے سے انکار کردیا۔

ایم کیو ایم کے قائد کی لندن روانگی کے بعد وزیراعظم کی ہدایت پر سندھ حکومت نے شر پسندوں کے خلاف بھرپور کلین اپ آپریشن شروع کیا اور حیدرآباد سے 600 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ جب کہ سکھر، خیرپور، نواب شاہ اور دوسرے علاقوں سے 240 افراد گرفتار کئے گئے۔ گرفتار شدہ افراد میں اکثریت کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا۔ حکومت کی اس مہم کے نتیجے میں ایک مرتبہ پھر کراچی، حیدرآباد اور سندھ کے دوسرے علاقوں میں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ 21 مئی کو حیدرآباد کے علاقے لطیف آباد میں 26 افراد فسادات کا شکار ہوئے۔ جب کہ 25 مئی کو کوٹری میں 18 اور کراچی میں 4 افراد ہلاک ہوئے۔ 26 اور 27 مئی کو آئی جی پولیس سندھ آغا سعادت علی کی قیادت میں پولیس اور ایگل سکواڈ نے حیدرآباد کے علاقہ قلعہ پکا کو گھیرے میں لے لیا۔ اور اندھا دھند فائرنگ شروع کردی جو پانچ گھنٹے تک جاری رہی۔ وہاں کے مکینوں نے پولیس کارروائی کو سندھی قوم پرستوں کا حملہ سمجھتے ہوئے جوابی فائرنگ کی اور ہزاروں افراد خوفزدہ ہوکر اپنے گھروں سے نکل آئے۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں جنہوں نے قرآن مجید کے نسخے ہاتھوں میں اُٹھا رکھے تھے کہ بے گناہوں کا قتل عام بند کیا جائے۔ تاہم پولیس کی گولیاں لگنے سے دو خواتین ہلاک ہوگئیں۔ پولیس نے قلعہ پکا کے علاقے میں کارروائی کرنے سے پہلے پانی اور بجلی کی سپلائی بند کردی۔ اس اپریشن کے دوران غیر سرکاری رپورٹوں کے مطابق 100 افراد ہلاک اور 300 زخمی ہوئے جب کہ سرکاری رپورٹوں کے مطابق 28 افراد ہلاک اور 100 زخمی ہوئے کراچی میں اس آپریشن کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ اور لاکھوں افراد کرفیو کی پابندی توڑ کر سڑکوں پر نکل آئے۔ اور 27 مئی سے لے کر 7 جون تک بارہ روز کے دوران سینیٹر محسن صدیقی سمیت 163 افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ لاقانونیت کی انتہا تھی کہ شرپسندوں نے عباسی شہید ہسپتال کراچی پر حملہ کرکے 10 زخمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کے دوران وفاقی حکومت کے بقول چار ہزار شرپسندوں اور دہشت گردوں کو گرفتار کیا گیا۔ اس اثناء میں تقریباً سندھ کا پورا صوبہ مقامی اور مہاجر میں تقسیم ہوگیا۔ اندرونِ سندھ کے شہروں ٹنڈومحمد خاں، دادو، خیرپورا، نواب شاہ، سکھر،

شکار پور، روہڑی اور لاڑکانہ میں رہنے والے غیر سندھی خاندانوں کو خوفزدہ کر کے نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور وہ اپنی جانوں کو بچانے کے لیے ایک طرف کراچی اور حیدر آباد اور دوسری طرف پنجاب نقل مکانی کرنے لگے۔ ان کے لیے حیدر آباد اور رحیم یار خاں اور صادق آباد میں امدادی کیمپ قائم کیے گئے۔ پنجاب حکومت کے دعوے کے مطابق 20 ہزار سے زائد افراد نے سندھ کے مختلف علاقوں سے پنجاب کی طرف نقل مکانی کی۔ جب کہ وفاقی حکومت نے اس کی تردید کی۔ متحدہ اپوزیشن نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے صدر سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہنگامی اختیارات استعمال کر کے سندھ حکومت کو برطرف کر دیں اور ہنگامی حالت کا اعلان کریں۔ ازخود صدر اسحٰق خان نے قلعہ پکا آپریشن کی مذمت کی۔ اور کہا کہ ’’یہ کتنے دکھ کی بات ہے چار نامعلوم مجرموں کی گرفتاری کے لیے نہتے بچوں اور خواتین پر فائرنگ کی گئی۔ صوبائی اداروں نے ناقص منصوبہ بندی اور سوجھ بوجھ کے بغیر کارروائی کی۔‘‘ اس واقعہ کے بعد پورے ملک میں سندھ پولیس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ بے گناہ شہریوں کی ہلاکت پر سوگ منایا گیا اور ذمہ دار پولیس افسران کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر وفاقی حکومت نے صدر کی مذمت اور عوام کے مطالبے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بلکہ سینئر وفاقی وزیر بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ ’’ایوان صدر سے آنے والا بیان ایم کیو ایم نے جاری کرایا ہے۔ ایم کیو ایم میں بھارتی ایجنٹ چھپے ہیں۔ بھارتی حکومت ان کے رشتہ داروں کے ذریعے کارروائیاں کرواتی ہے۔ حیدر آباد اپریشن نہایت کامیاب رہا اور پولیس کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔‘‘ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ سندھ میں گوریلا سرگرمیوں جیسی صورت حال ہے گورنر راج اس مسئلہ کا حل نہیں۔ 1986ء سے لے کر اب تک جن افراد کے نام ایف آئی آر میں درج ہیں۔ اُنہیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے گا۔‘‘ انہوں نے چار جون 1990ء کو صدر سے ملاقات کر کے اُنہیں بتایا کہ ایک لسانی گروپ کراچی میں امن امان کی صورت حال کو خراب کرنے کا باعث ہے۔ جب کہ صدر نے 5 جون کو اسلام آباد کے اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہ ’’دہشت گرد کسی ایک تنظیم یا گروپ میں نہیں بلکہ تمام جماعتوں میں موجود ہیں۔ دہشت گردوں کی بلاامتیاز بیخ کنی کرنی چاہیے۔‘‘

قلعہ پکا آپریشن کے واقعہ سے نہ صرف سندھ کی صورتِ حال سنگین ہوگئی۔ بلکہ اس سے قومی سطح پر وفاقی حکومت کے خلاف بھی شدید ردعمل ہوا۔ صدر کے علاوہ بعض فوجی جرنیلوں نے بھی اس اپریشن پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس آپریشن کے بعد صدر پر اس قدر دباؤ بڑھ گیا کہ وہ

اسمبلیوں کو توڑنے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کرنے پر آمادہ ہوگئے۔

سندھ کی نازک صورتِ حال کا اندازہ سابق وزیراعلیٰ سندھ سید قاسم علی شاہ کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں اُنہوں نے انکشاف کیا کہ مارشل لاء کی پیدا کردہ لسانی تنظیموں کی وجہ سے صرف ایک روز کے اندر کراچی میں 160 اور حیدر آباد میں 207 افراد قتل ہوئے۔ دسمبر 1988ء میں سندھ پولیس کی حالت یہ تھی کہ وہ صرف یونیفارم کی حد تک تھی اور اُسے گولی چلانا نہیں آتی تھی۔ قائم علی شاہ کے بیان کے برعکس وفاقی حکومت نے سندھ میں پولیس کی تنظیم اور اسے جدید اسلحہ سے لیس کرنے کے منصوبے پر 50 کروڑ روپے خرچ کیے۔ مگر امن امان کی صورتِ حال ٹھیک نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ وڈیرے اور حکومت میں شامل اہم شخصیات خود غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھیں۔ اس ضمن میں اہم واقعہ برطانی نژاد سید غلام مرتضےٰ بخاری کا اغوا تھا۔ جسے لاڑکانہ سے پیپلز پارٹی کے ایم پی اے غلام حسین انہڑ نے تاج محل ہوٹل کراچی سے اغوا اور اسے قید میں ڈال کر نہ صرف تشدد کیا بلکہ اُس کی ٹانگ سے ریموٹ کنٹرول بم باندھ کر اس سے 95 لاکھ روپے تاوان وصول کیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اس کیس میں بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری کو گرفتار کیا گیا اور کراچی کی خصوصی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔

پنجاب سے محاذ آرائی کا آغاز

1988ء کے عام انتخابات کئی لحاظ سے 1985ء کے عام انتخابات سے مختلف تھے۔ یہ پارٹی بنیاد پر ہوئے۔ جب کہ 1985ء کے عام انتخابات غیر جماعتی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے۔ 1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں نے بھرپور حصہ لیا۔ جب کہ 1985ء کے عام انتخابات کا پیپلز پارٹی اور ایم آر ڈی کی دوسری جماعتوں نے بائیکاٹ کیا تھا۔ 1988ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی مخالف سیاسی جماعتوں پر مشتمل سیاسی اتحاد اسلامی جمہوری اتحاد نے حصہ لیا۔ جب کہ 1985ء کے عام انتخابات میں کسی سیاسی اتحاد نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اور غیر جماعتی ایوان منتخب ہوا تھا۔ یہ انتخابات جنرل ضیاء کے مارشل لاء میں منعقد ہوئے تھے۔ جبکہ 1988ء کے انتخابات نگران حکومت نے کروائے تھے اور ان میں پیپلز پارٹی نے مجموعی طور پر 92 اور اسلامی جمہوری اتحاد نے 56 نشستیں حاصل کیں۔ صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے 184 اور اسلامی جمہوری اتحاد نے 145 نشستیں حاصل کیں۔ اس طرح ان انتخابات میں کوئی بھی سیاسی جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کرسکی۔ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو سادہ اکثریت حاصل ہوئی۔ اور اسلامی جمہوری اتحاد نے پنجاب میں سادہ اکثریت حاصل کی۔ تاہم پیپلز پارٹی سندھ میں واضح اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ اور اُس نے 100 میں سے 67 نشستیں حاصل کیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے وہاں صرف ایک نشست حاصل کی۔ پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم، عوامی نیشنل پارٹی اور فاٹا کے 8 آزاد اراکین اسمبلی کے تعاون سے مرکز میں حکومت قائم کی اور سندھ میں بھی اس کی حکومت بنی۔ اگرچہ اسلامی جمہوری اتحاد نے سرحد میں پیپلز پارٹی کے مقابلے 8 نشستیں زیادہ حاصل کی تھیں۔ مگر اندرونی اختلافات کی وجہ سے اتحاد کی حکومت نہ بن سکی اور پیپلز پارٹی نے عوامی نیشنل پارٹی کے تعاون سے وہاں پر مخلوط حکومت بنائی۔ بلوچستان میں کوئی سیاسی جماعت اکثریت حاصل نہ کرسکی۔ جس کی وجہ سے

وہاں پر صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بنی۔ جو صرف پندرہ روز تک چل سکی۔ اس کے بعد اسمبلی کو توڑ دیا گیا۔ اور بلوچستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جسٹس خدا بخش مری کو نگران وزیراعلیٰ مقرر کیا گیا۔ تاہم 23 جنوری 1989ء کو بلوچستان ہائی کورٹ نے گورنر کے حکم کو کالعدم قرار دے کر اسمبلی بحال کر دی اور سا کے دو روز بعد آئی جے آئی، بلوچستان نیشنل الائنس اور جمعیت علماء اسلام (ف) کے درمیان مخلوط حکومت کے قیام کا معاہدہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں نواب اکبر بگٹی کو بلوچستان کا وزیراعلیٰ منتخب کیا گیا۔ بالفاظ دیگر مرکز، سندھ اور سرحد میں پیپلز پارٹی کی جب کہ پنجاب اور بلوچستان میں اسکی مخالف حکومتیں قائم ہوئیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مرکز اور پنجاب میں دو مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ جو ایک دوسرے کی حریف تھیں۔ صوبہ پنجاب میں مرکز کی مخالف حکومت کا قائم ہو جانا پیپلز پارٹی کے لیے نیک شگون نہ تھا۔ کیونکہ آبادی کے لحاظ سے پنجاب ملک کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ صوبہ تھا اور اس کے تعاون کے بغیر مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا مستحکم ہونا بعید از قیاس تھا۔

O

پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو جنہوں نے یکم دسمبر کو وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا اور پاکستان اور دنیائے اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہوئی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ اگر پنجاب میں میاں نواز شریف کی حکومت قائم ہوگئی تو پھر اُن کی حکومت کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس لیے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اُٹھاتے ہی پنجاب کے گورنر مخدوم سجاد حسین قریشی کو ٹیلیکس کے ذریعے ہدایت کی کہ وہ میاں نواز شریف سے وزیراعلیٰ کے عہدے کا حلف نہ لیں اور صدر مملکت پر زور دیا کہ وہ ان کی مقرر کردہ تاریخ کو پنجاب اسمبلی کا اجلاس طلب کریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کو پنجاب میں مطلوبہ اکثریت حاصل کرنے اور حکومت بنانے کے لیے وقت مل جائے۔ مگر صدر مملکت اور گورنر پنجاب نے اُن کی یہ خواہش پوری نہ کی اور میاں نواز شریف پنجاب کے اعلیٰ منتخب ہوگئے۔ وزیراعظم بننے کے بعد بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی پریس کانفرنس کے دوران الزام لگایا کہ نگران حکومت نے 1988ء کے عام انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کی۔ اور اگر دھاندلی نہ کی جاتی تو پنجاب میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم

ہو چکی ہوتی۔ ان کا یہ الزام براہ راست میاں نواز شریف کی ذات پر تھا۔ کیونکہ انتخابات کے دوران وہ پنجاب کے نگران وزیر اعلیٰ تھے۔ اُن کے اس الزام نے دبی ہوئی چنگاریوں پر تیل چھڑک دیا۔ اور مرکز اور پنجاب کے درمیان نہ بجھنے والی اختلافات کی آگ بھڑک اُٹھی اور ایک سرے خلاف الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

O

پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے رہنما اور پیپلز پارٹی کے سرکردہ لیڈر سردار فاروق احمد خاں لغاری نے 2 فروری 1989ء کو اعلان کیا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جائے گی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ نواز شریف کی حکومت تین ماہ سے زیادہ نہیں چل سکتی۔ اور بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ جب وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ''اسمبلی کو اُن کی ایماء پر نہیں توڑا گیا۔ اگر اسمبلی توڑنی ہوتی تو ہم پنجاب اسمبلی توڑتے۔'' مخدوم الطاف نے متعدد بار میاں نواز شریف کی حکومت کے خاتمہ کا مطالبہ کیا۔ اور کہا کہ اُن کی حکومت کا خاتمہ جمہوریت کے لیے مفید ہے۔ اس طرح وفاقی حکومت نے گورنر پنجاب جنرل (ر) ٹکا خان کو بھی وزیر اعلیٰ پنجاب کے خلاف استعمال کیا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مختصر یہ کہ وفاقی حکومت نے میاں نواز شریف کی حکومت ختم کرنے کے لیے پورے تین ماہ تک زمین ہموار کی۔ اور شیڈول کے مطابق اور صور حال کا جائزہ لیے بغیر 6 مارچ 1989ء کو 80 ارکان اسمبلی کے دستخطوں پر مشتمل تحریکِ عدم اعتماد کا نوٹس پنجاب اسمبلی کے اسپیکر میاں منظور احمد وٹو کے حوالے کر کے میاں نواز شریف کو اقتدار سے باہر کرنے کے لیے عملی کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ پنجاب کابینہ کے ارکان کو مستعفی ہونے کی ترغیب دی گئی اور ان کوششوں کے نتیجے میں صوبائی وزیر خوراک سردار مقصود احمد لغاری ءاپنے کزن سردار فاروق احمد لغاری کی ایماء پر اپنی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ 12 مارچ کو پنجاب اسمبلی کے ارکان ملک رفیق کھر اور مسٹر سلیمان تاثیر نے اسمبلی کے اسپیکر میاں منظور احمد وٹو کو ہٹانے کا نوٹس دیا۔ اور الزام عائد کیا کہ وہ نواز شریف کے خلاف پیش کی گئی عدم اعتماد کی تحریک کے سلسلے میں جانبداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے کی جانے والی تمام سازشوں میں برابر کے شریک ہیں۔

میاں نواز شریف کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو کامیاب بنانے کے لیے وفاقی حکومت نے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے۔ قومی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے قائد چوہدری شجاعت حسین نے الزام عائد کیا کہ تحریک عدم اعتماد کو کامیاب بنانے کے لیے خفیہ فنڈ سے پانچ کروڑ اور بیرونی ذرائع سے 20 کروڑ حاصل کیے گئے۔ میاں نواز شریف نے کہا کہ وفاقی حکومت کے وزیر اور مشیر اُن کی ساتھیوں کو توڑنے کے لیے نوٹوں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس لائے مگر اُنہیں مایوس لوٹنا پڑا۔ کیونکہ اسلامی جمہوری اتحاد کے کسی ایم پی اے کو توڑنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میاں نواز شریف کی یہ بات 13 مارچ 1989ء کو درست ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس دن اُنہوں نے اور میاں منظور احمد وٹو نے دوبارہ اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اور اُن کے حق میں 152 ووٹ ڈالے گئے۔ جب کہ قائد ایوان کے انتخاب میں انہوں نے 147 ووٹ حاصل کیے تھے اور اس مرتبہ اُنہیں پانچ ووٹ زیادہ ملے۔ مختصر یہ کہ وفاقی حکومت تحریک عدم اعتماد کے ذریعے میاں نواز شریف کی حکومت کو ختم کرنے میں ناکام ہو گئی۔ جس سے پنجاب حکومت کو استحکام حاصل ہوا۔ اور میاں نواز شریف کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔ مگر اس کے باوجود مرکزی حکومت نے میاں نواز شریف کو ہٹانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔ اور صوبے میں بدامنی کی بنیاد پر میاں نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 22 ستمبر 1989ء کو فیصل آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اطلاعات ونشریات کے وزیر مملکت ملک احمد سعید اعوان نے اعلان کیا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اور صوبے میں گورنر راج نافذ ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے الزام عائد کیا کہ میاں نواز شریف وفاق کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اسی طرح پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد رانا شوکت محمود نے گورنر پنجاب پر زور دیا کہ وہ وزیر اعلیٰ کی سرگرمیوں کا نوٹس لیں اور ان کے خلاف فوری طور پر کارروائی کریں۔ وزیر مملکت برائے منشیات میاں مظفر شاہ نے دھمکی دی کہ وفاقی حکومت کے ایک اشارے پر پنجاب اسمبلی ٹوٹ سکتی ہے۔ اور نواز شریف جیل جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ آئی جے آئی کے سرکردہ رہنما منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ اور آئی جے آئی نے پنجاب میں حکومت سازی میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کی تھی۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر مسٹر فخر زماں نے کہا کہ پیپلز پارٹی نواز شریف کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کے لیے تحریک چلائے گی۔ 15 دسمبر 1989ء کو پنجاب کے گورنر جنرل (ر) ٹکا خاں نے کہا کہ پنجاب حکومت کی

طرف سے پیپلز پروگرام میں رکاوٹیں جاری رہیں تو بطور گورنر وہ اپنے آئینی اختیارات استعمال کریں گے۔ کوئی بھی صوبہ پیپلز پروگرام میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ انہوں نے یہ بھی کہ پنجاب میں گورنر راج کے نفاذ پر غور ہوسکتا ہے۔ اس بیان کے بعد ہر طرف یہ افواہ پھیل گئی کہ حکومتِ پنجاب کو توڑا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے اس قسم کی افواہوں کو اس انداز سے پھیلایا کہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ میاں نواز شریف کی حکومت اب کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ اور کسی بھی لمحے ختم ہوسکتی ہے۔ مگر اس قسم کی تمام افواہیں اور احساسات 28 دسمبر 1989ء کو دیئے جانے والے صدر غلام اسحٰق کے بیان کے نیچے دفن ہوگئے۔ جس میں اُنہوں نے اعلان کیا کہ پنجاب میں گورنر راج نافذ نہیں ہوگا۔ اس طرح پیپلز پارٹی کی طرف سے میاں نواز شریف کو اقتدار سے ہٹانے کے کا منصوبہ ایک مرتبہ پھر ناکام ہوگیا۔

O

پیپلز پارٹی کی حکومت جب میاں نواز شریف کو بطور وزیر اعلیٰ انتخاب نہ رکوا سکی تو اس نے پارٹی کے سیکرٹری جنرل ریٹائرڈ جنرل (ر) ٹکا خان کو پنجاب کا گورنر بنوانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ جنرل ٹکا خاں کو صدارتی انتخابات میں قائم مقام صدر مسٹر غلام اسحٰق خان کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کا امیدوار نامزد کیا گیا۔ اس کے بعد اُن سے بارگیننگ کی گئی۔ اور اُنہیں کہا گیا کہ اگر وہ ٹکا خان کو پنجاب کا گورنر مقرر کردیں تو پیپلز پارٹی صدارتی انتخابات میں اُن کی حمایت کرے گی۔ اس وقت چونکہ پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی اور سندھ اسمبلی میں اکثریت حاصل تھی اور پنجاب اسمبلی میں بھی اس کے حامی ارکان کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔ اس لیے غلام اسحٰق خان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ کرنے اور انتخابات میں اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے جنرل ٹکا خان کو پنجاب کا گورنر مقرر کردیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور 6 دسمبر 1988ء کو ٹکا خان کو پنجاب کا اکیسواں گورنر مقرر کیا گیا۔ 9 دسمبر کو اُنہوں نے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ اور دوسرے روز وہ صدارتی انتخابات سے دستبردار ہوئے۔ جنرل ٹکا خاں اُس وقت تک صدارتی انتخابات کے دستبردار نہ ہوئے جب تک انہوں نے اپنے عہدے کا حلف نہ اُٹھایا۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی قیادت نے قائم مقام صدر سے گورنر کے عہدے کے لیے سودے بازی نہ کی مگر سیاسی حلقوں میں اُس نے یہ تاثر دیا کہ اُس نے قومی

مفاہمت کے جذبے کے تحت نوابزادہ نصر اللہ خاں کے مقابلے میں مسٹر اسحٰق خان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس طرح پیپلز پارٹی نے ایک تیر سے دو نشانے کئے۔ اس نے میاں نواز شریف پر جنرل ٹکا خاں کو مسلط کرنے کے لیے مسٹر غلام اسحٰق کو اپنے اُوپر مسلط کرلیا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو اپنے 20 ماہ کے دورِ حکومت میں نہ تو پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کی حکومت کو ختم کرسکیں اور نہ ہی صدر غلام اسحٰق کا اعتماد حاصل کرسکیں۔

ٹکا خان کے گورنر بننے کے بعد اُن کے اور وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کے درمیان چپقلش شروع ہوگئی۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا کہ جب انہوں نے صوبے کے انتظامی معاملات میں مداخلت شروع کردی اور سرکاری افسران کو براہِ راست ہدایت دینے لگے۔ اس کا وزیر اعلیٰ نے فوری نوٹس لیا اور 7 جنوری 1989ء کو گورنر کو ایک خط کے ذریعے سرکاری ملازمین کو براہِ راست ہدایات دینے سے منع کیا اور کہا کہ وہ آئین کے تحت وزیر اعلیٰ کے مشورے کے پابند ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے اپنے معاملات میں گورنر کی مداخلت کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لیے پنجاب اسمبلی کے ذریعے ان قوانین میں ترامیم کرائی جن کے تحت گورنر صوبے کے انتظامی امور میں مداخلت کرسکتا تھا۔ جولائی 1989ء میں پنجاب اسمبلی نے 7 ترمیمی بل منظور کئے۔ ان میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا ترمیمی بل، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا ترمیمی بل، پنجاب یونیورسٹی کا ترمیمی بل، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کا ترمیمی بل، پنجاب پبلک سروس کمیشن کا ترمیمی بل اور ادارہ تعلیم و تربیت کا ترمیمی بل شامل تھے۔ ان بلوں کی منظوری کے بعد مذکورہ اداروں کے سربراہوں کی تقرری، تبادلے اور دوسرے اختیارات کلی طور پر وزیر اعلیٰ کو حاصل کئے گئے۔ مگر جب ان سات بلوں کو گورنر کے دستخطوں کے لیے 29 جولائی کو ارسال کیا گیا تو انہوں نے نظر ثانی کے لیے پنجاب اسمبلی کو یہ بل واپس بھیج دیئے اور ان پر دستخط نہ کئے۔ اسی طرح یکم اپریل 1990ء کو اسلامی اقدار کی ترویج کے کمیشن کے قیام کا آرڈیننس گورنر کو بھیجا گیا مگر اس پر بھی اُنہوں نے دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ اسلامی نظریاتی کونسل کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اور صوبائی سطح پر اس قسم کا کمیشن قائم نہیں کیا جاسکتا۔ 29 جون کو پنجاب اسمبلی نے حکومت کی جانب سے پیش کردہ پنجاب سروسز ٹریبونل ایکٹ کے ترمیمی بل کو منظور کرلیا۔ جس کے تحت پنجاب سروسز ٹریبونل کے معاملات میں گورنر پنجاب کا عمل دخل ختم ہوگیا اور تمام اختیارات وزیر اعلیٰ کو منتقل ہوگئے۔ دسمبر 1989ء میں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے درمیان تعلقات اس قدر کشیدہ ہوگئے کہ گورنر

نے دھمکی دی کہ اگر پیپلز پروگرام کے راستے میں رکاوٹیں جاری رہیں تو وہ بطور گورنر اپنے آئینی اختیارات استعمال کریں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں گورنر راج کے نفاذ کے بارے میں بھی غور کر سکتے ہیں۔ اُن کے اس بیان نے سیاسی حلقوں میں ہلچل مچادی اور میاں نواز شریف کی حکومت کے خاتمہ کی قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ جن کو دور کرنے کے لیے 28 دسمبر کو صدر مملکت غلام اسحٰق خان نے اعلان کیا کہ پنجاب میں گورنر راج نافذ نہیں ہوگا۔ جس کے بعد گورنر پنجاب نے وزیر اعلیٰ کے خلاف آئینی اختیارات استعمال کرنے کی دھمکی کبھی نہ دی۔ اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ تک خاموش رہے کیونکہ اُنہیں خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کو گورنر کے عہدے سے نہ ہٹادیا جائے۔

▪ ▪ ▪

نواب اکبر بگٹی سے اختلافات کا آغاز کیسے ہوا؟

نواب اکبر بگٹی نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالتے ہی وفاقی حکومت سے بلوچستان سے نکلنے والی گیس کی ساڑھے چار ارب روپے رائلٹی طلب کی لیکن وفاقی حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے وفاقی حکومت کو 95 کروڑ روپے سُود کی ادائیگی روک دی۔ 13 اپریل 1989ء کو وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور نواب اکبر بگٹی ء کے درمیان اسلام آباد میں باقاعدہ مذاکرات ہوئے۔ جو ناکام ہوگئے۔ مذاکرات کے بعد بلوچستان کے وزیر اعلیٰ 5 نے الزام عائد کیا کہ وفاقی حکومت بلوچستان کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہے۔ اور آٹھویں ترمیم کے مسئلے پر سودے بازی کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ تعاون نہیں کیا جاسکتا۔ مذاکرات کی ناکامی کے بعد وفاقی حکومت اور بلوچستان حکومت کے درمیان محاذ آرائی شدت اختیار کرگئی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کی پالیسیوں پر کھلم کھلا تنقید شروع کردی۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف نے بھی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ کے مؤقف کی حمایت کی۔ اس طرح پنجاب نے پہلی مرتبہ کسی چھوٹے صوبے کے مطالبات کے حق میں آواز اُٹھائی۔ وفاقی حکومت نے بلوچستان حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کردی اور فرنٹیئر کور کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میر باز خان کھیتران کو صرف نواب اکبر بگٹی کو تنگ کرنے کے لیے وفاقی کابینہ میں شامل کیا گیا۔ وہ ماحولیات کے وزیر تھے۔ مگر اکثر بلوچستان کے دورے پر رہتے تھے اور وہاں پر نواب اکبر بگٹی کے خلاف تقریریں کرتے تھے ایک دفعہ جب راقم الحروف نے ان سے ان کی ماحولیات کی وزارت کے اغراض و مقاصد دریافت کئے تو اُنہوں نے بتایا کہ جب سے وہ وزیر بنے ہیں اس دن سے وہ اپنے دفتر میں نہیں گئے۔ اس لیے وہ اپنی وزارت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں۔ تاہم بلوچستان کے حالات کا اُنہیں بخوبی علم ہوتا اور بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بلوچستان افیئرز کے وزیر ہیں۔ مرکز اور

بلوچستان کے درمیان محاذ آرائی کی وجہ سے ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے کئی ناگزیر منصوبے بھی
التوا میں پڑ گئے ۔مثال کے طور پر وفاقی حکومت نے نجی شعبے میں بلوچستان میں دریائے حب پر بجلی
گھر قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر بلوچستان حکومت نے مجوزہ بجلی گھر کے قیام کے لیے این او سی
جاری کرنے سے انکار کر دیا۔

سب سے زیادہ جس مسئلہ پر مرکز ،بلوچستان اور پنجاب کے درمیان محاذ آرائی ہوئی وہ
پیپلز پروگرام تھا۔ جسے وفاقی حکومت نے شروع کیا۔اس کو شروع کرنے کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ
پنجاب اور بلوچستان میں وزیر اعلیٰ کے ارکان قومی وصوبائی اسمبلی غیر موثر ہو کر رہ گئے تھے اور وہ
اپنے حلقے کے لوگوں کے مسائل حل کرنے سے اس لیے قاصر تھے کہ مقامی انتظامیہ ان کو اہمیت
نہیں دیتی تھی اور نہ ان کی بات مانتی تھی۔اسی طرح دونوں صوبائی حکومتوں نے ان کے لیے نہ تو
فنڈز مخصوص کیے اور نہ ہی ان کو ترقی کے عمل میں شامل کیا۔ جب کہ آئی جے آئی کے قومی وصوبائی
اسمبلی کے ارکان اور سینٹروں کے لیے فنڈز مخصوص کیے گئے صوبائی محکموں اور ضلعی انتظامیہ کو ان
کے مشورے سے منصوبے بنانے اور کام کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہاں تک کہ کمشنر، ڈپٹی کمشنر،
ڈی آئی جی اور ایس ایس پی بھی آئی جے آئی کے ارکان کی سفارش پر تعینات کیے گئے ۔اس سے
ارکانِ اسمبلی کے وقار میں اضافہ ہوا۔اس صورتِ حال میں پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی نے محسوس
کیا کہ عوام میں اُن کی مقبولیت کم ہو رہی ہے۔ان کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے اور عوام میں اُن
کے اثر ورسوخ کو بڑھانے کے لیے وفاقی حکومت نے چاروں صوبوں میں پیپلز پروگرام شروع
کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے لیے 89-1988ء کے بجٹ میں تین ارب روپے اور
90-1989ء میں چار ارب روپے رکھے گئے ۔اس پر عملدرآمد کے لیے 11 مئی 1989ء کو
ضلع کی سطح پر کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور 1988ء کے انتخابات میں شکست کھا جانے والے پیپلز
پارٹی کے رہنماؤں کو اُن کا سربراہ (ایڈمنسٹریٹر) مقرر کیا گیا۔ پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں نے
پیپلز پروگرام کو مسترد کر دیا۔اور اُسے صوبائی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔اپوزیشن نے بھی اس
کی مخالفت کی اور اعتراض کیا کہ شکست خوردہ افراد کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا ہے اور اس کا مقصد عوام
کی ترقی نہیں بلکہ کارکنوں کو نوازنا اور اُن کی جیبیں بھرنا ہے۔ان اعتراضات کے بعد 28 دسمبر
1989ء کو وفاقی حکومت نے پیپلز پروگرام کے غیر منتخب ایڈمنسٹریٹروں کو ہٹا دیا۔ اور اُن کی جگہ
منتخب ارکان اسمبلی کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ اس تبدیلی کی ایک وجہ اپوزیشن کی غیر منتخب

ایڈمنسٹریٹروں پر تنقید اور دوسرا پارٹی کے ارکان قومی وصوبائی اسمبلی اور پیپلز پروگرام کے
ایڈمنسٹریٹروں کے مابین چپقلش تھی۔ جب وفاقی حکومت نے پیپلز پروگرام پر عملدرآمد کا آغاز کیا
تو پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں نے اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں
صوبوں میں پیپلز پروگرام کے منصوبوں پر کام کرنے والے ٹھیکیداروں کو گرفتار کیا گیا اور زیر تعمیر
منصوبوں کو مسمار کیا گیا۔ جسکے خلاف عوام میں ردعمل بھی پیدا ہوا۔ 4 دسمبر 1989ء کو پنجاب
حکومت نے صوبے کے تمام ڈپٹی کمشنروں اور اسسٹنٹ کمشنروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے علاقوں
میں پیپلز پروگرام کے کسی بھی منصوبے پر کام نہ کرنے دیا جائے اور ہر ٹھیکیدار کو پابند کیا جائے کہ وہ
صوبائی حکومت سے این او سی حاصل کرے۔ یہ ہدایت موصول ہوتے ہی ضلعی انتظامیہ نے پیپلز
پروگرام کے ایڈمنسٹریٹروں کو قانونی نوٹسوں کے ذریعے ترقیاتی کام بند کرنے کی ہدایت کی۔ یکم
جنوری 1990ء کو شیخوپورہ میں پیپلز پروگرام کے دفتر کو آگ لگائی گئی اور اہلکاروں کو مارا پیٹا گیا۔
بلوچستان حکومت نے بھی سرکاری ملازمین کو پیپلز پروگرام میں تعاون کرنے سے روک دیا۔اس
مخالفت کی وجہ سے پنجاب اور بلوچستان میں پیپلز پروگرام پر عملدرآمد مشکل ہو گیا۔ تاہم وفاقی
حکومت نے اسے اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا اور فرنٹیئر کور کے ذریعے اسے نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔
بلوچستان کے مختلف علاقوں میں فرنٹیئر کور کی زیر نگرانی پیپلز پروگرام کے تحت ترقیاتی منصوبوں پر
کام شروع کرایا گیا۔ جس کے خلاف بلوچستان حکومت نے سخت مزاحمت کی۔ جس کی وجہ سے
فرنٹیئر کور اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ کشیدگی اس وقت
تیز ہوئی کہ جب وزیر اعلیٰ نواب اکبر بگٹی کے حلقۂ انتخاب ڈیرہ بگٹی میں پیپلز پروگرام کے تحت
ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے ۔کشیدگی کے نتیجے میں نامعلوم افراد نے فرنٹیئر کور کے جوانوں پر
متعدد بار حملے کیے جس کے بعد ایسے افراد کو غیر مسلح کرنے کے لیے فرنٹیئر کور نے اکبر بگٹی کے حلقے
کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ فرنٹیئر کور اور نامعلوم افراد کے درمیان دو جگہ پر مسلح تصادم
ہوا۔ جس کے نتیجے میں دونوں جانب سے پانچ افراد ہلاک اور چھ زخمی ہوئے ۔اس واقعہ کے اصل
پس منظر کو چھپانے کے لیے یہ تاثر اُبھارا گیا کہ فرنٹیئر کور نے اکبر بگٹی کے حلقے میں ڈاکوؤں اور
سمگلروں کے خلاف کارروائی کی تھی۔ اور اس دوران علیحدگی پسند سندھی رہنما مسٹر جی ایم سید اپنے
ساتھیوں کے ہمراہ بلوچستان جا رہے تھے۔ اُن کی گرفتاری کے لیے وزیر اعظم کی ہدایت پر فرنٹیئر
کور نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ تاہم اس واقعہ پر بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نے شدید

ردعمل کا اظہار کیا اور اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کی دھمکی دی۔ اُنہوں نے صدرِ مملکت سے اپیل کی کہ ''وہ وفاق کو بچانے کے لیے آئین کے تحت اپنے ہنگامی اختیارات استعمال کریں'' اور الزام عائد کیا کہ ''وفاقی حکومت فرنٹیئر کور کے ذریعے پروگرام پر عملدرآمد کرا رہی ہے جو صوبائی معاملات میں غیر آئینی مداخلت ہے''۔ جب صورتِ حال مزید خراب ہونے لگی تو صدرِ مملکت نے وزیرِ اعلیٰ اور فرنٹیئر کور کے کمانڈر کے درمیان باقاعدہ مذاکرات کرانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ جس کے بعد دونوں کے درمیان باقاعدہ مذاکرات ہوئے اور فرنٹیئر کور نے اکبر بگٹی کے حلقے کی ناکہ بندی ختم کردی۔ اس طرح یہ خطرناک بحران ٹل گیا۔

پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں نے جب دیکھا کہ وفاقی حکومت پیپلز پروگرام کو ترک کرنے پر تیار نہیں تو اُنہوں نے پیپلز پروگرام کے متوازی ترقیاتی پروگرام شروع کردیا۔ پنجاب میں یہ ''تعمیرِ وطن پروگرام'' کے نام سے شروع کیا گیا اور اس کے لیے بجٹ میں بھاری رقم مختص کی گئی۔ جہاں پیپلز پارٹی کی حکومت نے پنجاب حکومت کے لیے مسائل پیدا کرنے کے لیے اقدامات کئے وہاں اُس نے بلوچستان کے خلاف بھی ایسے اقدامات کئے جس سے اُس کی معیشت متاثر ہوئی۔ مثلاً سکھر بیراج سے نکلنے والی کرتھار نہر سے ملنے والے 1300 کیوسک پانی میں کمی کردی گئی۔ اس سے نصیر آباد ڈویژن کا علاقہ متاثر ہوا کیونکہ وہ اس نہر کے پانی سے سیراب ہوتا تھا جس کے بعد بلوچستان نے بھی دریاؤں کے پانی کی صوبوں میں تقسیم کا مسئلہ جلد از جلد طے کرنے کا مطالبہ کیا اور اس نے بھی دوسرے صوبوں کے ملازمین کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کردی۔ 2 جون 1990ء کو صوبہ سرحد کا ڈومیسائل رکھنے والے 20 سرکاری ملازمین کو واپس ان کے صوبے میں بھیج دیا گیا اور مزید دو سو ملازمین کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نواب اکبر بگٹی نے کہا کہ اگر بلوچستان کو گیس کے ساڑھے چار ارب روپے نہ دیئے گئے تو وہ صوبے میں تیل و گیس اور دوسرے وسائل کی تلاش کی اجازت نہیں دیں گے۔

وفاقی حکومت نے پیپلز پروگرام کے تحت ترقیاتی منصوبوں کے علاوہ مستحق افراد کو سائیکلیں، سلائی مشینیں اور کھاد مفت تقسیم کی۔ اس پروگرام کے تحت کھاد کا اس قدر ذخیرہ کرلیا گیا کہ پنجاب میں کھاد کی قلت پیدا ہوگئی۔ اور اسکی دستیابی کے لیے کاشتکاروں نے مظاہرے کئے۔ اپوزیشن نے الزام عائد کیا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے پنجاب کی زرعی معیشت کو نقصان پہنچانے کے لیے کھاد کو ذخیرہ کر کے پنجاب میں اس کی مصنوعی قلت پیدا کی اور اسے سندھ میں تقسیم کیا۔

منصوبہ بندی اور ترقی کے صوبائی وزیر مخدوم زادہ شاہ محمود قریشی نے الزام عائد کیا کہ پیپلز پروگرام کے تحت کھاد کے ذخائر جمع کرنے کی وجہ سے کھاد کی مصنوعی قلت پیدا ہوئی۔

○

پنجاب اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی مخالف سیاسی جماعتوں کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد بعض سیاسی مبصرین کا خیال تھا کہ ملک میں متوازن سیاسی نظام نشوونما پائے گا اور مرکزی و صوبائی حکومتیں اپنے اپنے دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے کام کریں گی اور خود بخود چیک اینڈ بیلنس سسٹم قائم ہوجائے گا مرکز اور پنجاب میں مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومتوں کا قائم ہونا پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور اس کی کامیابی کے بارے میں قیاس آرائیاں بھی کی گئیں جو اس لیے غلط ثابت ہوئیں کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں شامل سیاست دانوں نے اپنے سیاسی اختلافات کو ذاتی رنگ دے کر ایک دوسرے کے خلاف انتقامی کارروائیاں کیں جن کی وجہ سے مرکز اور صوبوں کے مابین محاذ آرائی میں اضافہ ہوا۔

انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا۔ جب 18 مارچ 1989ء کو وزیرِ اعظم کے معاون خصوصی مسٹر خالد احمد نے تمام قومی بنکوں کو ہدایت کی کہ وہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں نواز شریف اور قومی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے قائد چوہدری شجاعت حسین اور اُن کے خاندان کے افراد کے صنعتی اداروں کو مالی سہولتیں فراہم کرنا بند کریں اور اپوزیشن کے ارکان شیخ محمد رشید، سید تسنیم نواز گردیزی، میاں عمر حیات لالیکا، مسٹر صدیق خان کانجو اور میونسپل کارپوریشن لاہور کے میئر میاں محمد اظہر کے کھاتوں کی چھان بین کریں۔ اسی طرح انکم ٹیکس کے محکمے کو بھی ان افراد کے اثاثوں کی چھان بین کرنے کا حکم دیا گیا۔ بعد ازاں 16 جون 1989ء کو سینیٹر آصف وردگ کو سرحد بدر کیا گیا اور صوبے میں اُن کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خاتمے کے بعد کسی سیاسی رہنما کی صوبہ بدری کا یہ پہلا واقعہ تھا کیونکہ محمد خان جونیجو اور نگران حکومتوں کے دور میں کسی سیاسی رہنما کو صوبہ بدر نہ کیا گیا۔ آصف وردگ کو صوبہ بدر کرنے کے علاوہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں نواز شریف کے دورہ سرحد کا بھی سخت نوٹس لیا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ سرحد حکومت کو پیشگی اطلاع دیئے بغیر آئندہ سرحد کا دورہ نہ کریں۔ سرحد حکومت نے یہ کارروائی اس لیے کہ کی اس کے بقول میاں نواز شریف اور آصف وردگ سرحد

حکومت کو ختم کرنے کے لیے سازش کر رہے تھے۔ متحدہ اپوزیشن نے آصف وردگ کی صوبہ بدری کا سخت نوٹس لیا اور اسے توڑنے کا فیصلہ کیا۔ قومی اسمبلی میں ڈپٹی اپوزیشن لیڈر چوہدری عبدالغفور نے دھمکی دی کہ پیپلز پارٹی کے وفاقی وزراء اور رہنما بھی صوبہ بدر کئے جا سکتے ہیں انہوں نے کہا کہ سینٹ کے رکن کو صوبہ بدر کرنا آئین کی خلاف ورزی ہے اس شدید ردعمل کے بعد 22 جون کو آصف وردگ کی صوبہ بدری کے احکامات واپس لے لئے گئے۔ تاہم انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ بند نہ کیا گیا بلکہ آئی ایس آئی اور انٹیلی جنس بیورو کو قومی اسمبلی کے رکن شیخ رشید احمد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور حکومت کو رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ شیخ رشید پر وفاقی حکومت نے الزام عائد کیا کہ راولپنڈی میں فتح جنگ روڈ پر انہوں نے کشمیری مہاجرین کا کیمپ قائم کر رکھا ہے اور وہاں پر کشمیری حریت پسندوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی جا رہی ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے آئی جے آئی کے رہنماؤں کی طرف سے ضیاء دور میں بنکوں سے حاصل کئے گئے قرضوں اور پلاٹوں کے مسئلہ کو بھی اچھالا۔ تاکہ عوام کی نظروں میں ان کی سیاسی ساکھ خراب ہو۔ مثلاً یکم جولائی 1989 کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین مسٹر حاکم علی زرداری جو وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے سُسر بھی تھے نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ مرحوم صدر جنرل ضیاء کی ہدایت پر کراچی، پشاور، لاہور اور راولپنڈی میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹلوں کی فروخت میں حکومت کو ایک ارب 90 کروڑ روپے کا نقصان ہوا جبکہ مختلف سرکاری کارپوریشنوں کو اس قسم کے فیصلوں سے گیارہ ارب دو کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ ایک سابق کوارٹر ماسٹر جنرل نے مسلح افواج کی کروڑوں روپے کی زمین فروخت کر کے رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرالی۔ ضیاء دور میں مختلف صنعتی گروپوں نے بنکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے چار ارب روپے کے قرضے معاف کرائے۔ چاروں مذکورہ ہوٹل ہاشوانی گروپ کو 12 کروڑ 80 لاکھ روپے میں فروخت کئے گئے۔ جبکہ بیرون ملک پاکستانیوں کے ایک گروپ نے ایک ارب 90 کروڑ روپے کی پیش کش کی تھی۔ ہاشوانی گروپ نے اپنی جیب سے صرف ایک کروڑ روپے ادا کئے جبکہ بقیہ رقم بنکوں سے قرض لے کر ادا کی۔ انہوں نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ مسلم لیگ کے پارلیمانی لیڈر چوہدری شجاعت حسین گروپ نے 50 کروڑ روپے کے قرضے حاصل کئے۔ جبکہ پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف کے اتفاق گروپ نے دو ارب 25 کروڑ روپے کے قرضے لئے اُس کے علاوہ جونیجو دور حکومت میں 12 افراد میاں نواز شریف،

چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی، ڈاکٹر بشارت الٰہی، چوہدری نذیر احمد، اسلام الدین شیخ اور سلیم سیف اللہ وغیرہ نے مجموعی طور پر 9 ارب 20 کروڑ روپے کے قرضے حاصل کئے۔ اور بنکوں و مالیاتی اداروں سے دو ارب 90 کروڑ روپے کے قرضے معاف کرائے۔ زرعی ترقیاتی بنک نے مختلف افراد کے 16 کروڑ روپے کے قرضے معاف کئے۔ یہ قرضے سکیورٹی فراہم کئے جانے کے باوجود معاف کئے گئے۔ مسٹر حاکم علی زرداری نے بتایا کہ 1977ء سے 1985ء کے درمیان 50 اعلیٰ فوجی افسران اور شخصیات کو اسلام آباد میں پلاٹ الاٹ کئے گئے۔ ان میں لیفٹیننٹ جنرل شفیق، لیفٹیننٹ جنرل فضل حق، جنرل رحیم الدین خان، مسز شفیقہ ضیاء، میجر جنرل سید میاں، لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم، لیفٹیننٹ جنرل محمد شریف، لیفٹیننٹ جنرل سعید قادر، میجر جنرل محبوب احمد، ائر مارشل اے رشید شیخ، ائر کموڈور سجاد حیدر، جسٹس غلام حید شاہ، جسٹس جاوید اقبال، جسٹس ایم محبوب احمد، جسٹس رسم ایس سندھو اور بریگیڈیئر شیخ محمد الیاس وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ پلاٹوں کی الاٹمنٹ میں اقربا پروری کرنے پر کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو 40 کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ جب یہ تفصیلات خبارات میں شائع ہوئیں تو سیاسی حلقوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ وفاقی حکومت نے ضیاء اور جونیجو دور میں بنکوں اور مالیاتی اداروں سے قرضے حاصل کرنے والوں کے نام بھی اخبارات میں شائع کرائے۔ جس پر صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں میں کھلبلی مچ گئی۔ چوہدری شجاعت حسین نے مسٹر حاکم علی زرداری کے الزامات کی باقاعدہ تحقیقات کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر تحقیقات نہ کرائیں گئی تو وہ خود اسے عدالت میں لے جائیں گے۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ حکومت میں آتے ہی حاکم علی زرداری نے 86 کروڑ روپے کا قرضہ چند دنوں میں منظور کرایا اور 30 کروڑ روپے وصول بھی کر لئے۔ پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی انہوں نے سندھ میں معدنیات کی کھدائی کے لیے زمین پٹہ پر لی۔ سرکاری افسروں کو برطرفی کی دھمکیاں دے کر مالی فوائد حاصل کئے۔ اتفاق گروپ نے الزام لگایا کہ زرداری خاندان نے سکرنڈ شوگر ملز اور مورگہ ہوٹل اسلام آباد کے لیے تجارتی بنکوں کے کنسورشیم سے 342.700 ملین کے قرضے حاصل کئے 1971ء میں حاکم علی زرداری صرف 10 لاکھ تین ہزار روپے اور 189 ایکڑ اراضی کے مالک تھے۔ 1977ء میں وہ 74 لاکھ تین ہزار روپے اور 1500 ایکڑ اراضی کے مالک بن گئے۔ 2 مئی 1989ء کو سکرنڈ شوگر ملز کے قرضے کی پہلی قسط پانچ کروڑ روپے وصول کی گئی۔ زرداری گروپ لمیٹڈ کے نام سے ایک فرم نے فلیٹ

بنانے کے لیے 35 لاکھ روپے کا قرضہ لیا جو 1988ء میں بڑھ کر 70 لاکھ روپے ہو گیا۔ مگر یہ قرضہ واپس نہ کیا گیا۔

حاکم علی زرداری کے الزامات کی وجہ سے مرکز اور پنجاب کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ چونکہ اپوزیشن میں شامل صنعتی خاندانوں پر بدعنوانی کے سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ اس لیے وہ خاندان اب براہِ راست زرداری خاندان کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ اور آہستہ آہستہ وہ زرداری اور بھٹو خاندان کے خلاف متحاد ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے چوہدری شجاعت گروپ اور اتفاق گروپ کو مالی نقصان پہنچانے کے لیے تمام ممکنہ حربے استعمال کیے۔ مثلاً اتفاق فاؤنڈری کے لیے امریکہ سے سکریپ لانے والے جہاز سے کئی ماہ تک سکریپ نہ اتارا گیا۔ کیونکہ وفاقی حکومت کی ہدایت پر ریلوے نے کراچی سے لاہور سکریپ لانے کے لیے ویگنیں فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور امریکہ جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کافی عرصہ کھڑا رہا 24 جولائی 1989ء کو امریکی سفیر نے ریلوے سے درخواست کی کہ اتفاق فاؤنڈری کے لیے لایا جانے والا سکریپ جہاز سے اتارا جائے۔ جو ایک ماہ سے کھڑا ہوا ہے اور فاؤنڈری کو ایک کروڑ روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا ہے۔ لیکن ریلوے نے پھر بھی ویگنیں فراہم نہ کیں۔ جس کے بعد اتفاق گروپ نے لاہور ہائی کورٹ میں ریلوے کے خلاف رٹ دائر کی جس کی باقاعدہ سماعت کے بعد 12 نومبر 1989ء کو عدالتِ عالیہ نے ریلوے کو ہدایت کی کہ وہ اتفاق فاؤنڈری کو روزانہ 30 ویگنیں فراہم کرے۔ فاؤنڈری کے ڈائریکٹر جاوید شفیع نے عدالت کو بتایا کہ ویگنیں فراہم نہ کی جانے کی وجہ سے فاؤنڈری کو 30 کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد کرنے کی بجائے وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ میں اس کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ جس کی باقاعدہ سماعت کے بعد اسے مسترد کر دیا گیا۔ اور سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھا۔ اس طرح اتفاق فاؤنڈری نے وفاقی حکومت اور ریلوے کے خلاف عدالتی جنگ جیت لی۔ تاہم اس تنازعہ کی وجہ سے پورے چھ ماہ تک امریکہ سے سکریپ لانے والا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کھڑا رہا اور اتفاق فاؤنڈری کو 50 کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ اتفاق گروپ نے سینئر سول جج لاہور کی عدالت میں 14 جولائی 1990ء کو وفاقی حکومت انڈسٹریل بنک اور وزارت خزانہ کے خلاف 50 کروڑ روپے ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا۔

19 اگست 1989ء کو چوہدری شجاعت کی صنعتوں کے اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال

کرنے کے لیے ایک برطانوی فرم مقرر کی گئی۔ اسی طرح پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف اور ان کے خاندان کے اثاثوں اور دولت کی چھان بین کے لیے مختلف محکموں کی تین تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ جنرل ضیاء اور ان کے خاندان کی جائیداد اور اثاثوں کی چھان بین کرنے کے لیے انکم ٹیکس کے اعلیٰ حکام پر مشتمل انکوائری ٹیم تشکیل دی گئی۔ جنرل ضیاء کے خاندان سے آرمی ہاؤس خالی کروایا گیا۔ ایف آئی اے کو آئی جے آئی اور اپوزیشن کے رہنمائوں کے خلاف تحقیقات کرنے اور خفیہ ایجنسیوں کو اپوزیشن کے لیڈروں کے فون ٹیپ کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایف آئی اے نے ریاض باٹلرز لاہور پر چھاپہ مارا اور اس کا ریکارڈ قبضے میں لینے کی کوشش کی۔ اس فیکٹری پر اس لیے چھاپہ مارا گیا کہ مرحوم جنرل اختر عبدالرحمٰن کے صاحبزادے ہارون اختر اس کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ ایف آئی اے نے ہفت روزہ حرمت کے ایڈیٹر زاہد ملک کو قومی راز افشا کرنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ جبکہ پی آئی اے کے سابق ایم ڈی ائر مارشل وقار عظیم کو بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے سابق چیئرمین ایڈمرل ایم آئی ارشد کے خلاف کروڑوں روپے خورد برد کرنے کے مقدمات کی از سر نو تحقیقات کی گئی جنرل ضیاء نے اپنے دور میں یہ مقدمات واپس لینے کا حکم دیا تھا۔ سٹیٹ بنک کے گورنر مسٹر آئی اے حنفی کو چار ماہ کی جبری رخصت پر بھیج دیا گیا کیونکہ انہوں نے پلیسمنٹ بیورو کی سفارش پر 52 افراد کو ملازمتیں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح انٹیلی جنس بیورو کے دو اہلکاروں کو زدوکوب کرنے اور سرکاری امور میں مداخلت کرنے کے الزام میں اسلام آباد پولیس نے چوہدری شجاعت حسین اور شیخ رشید احمد کے خلاف مقدمات درج کیے اور ان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے گئے۔ چوہدری شجاعت حسین نے الزام لگایا کہ اہلکار ان کا تعاقب کر رہے تھے اور انہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا جبکہ وزیر داخلہ چوہدری اعتزاز احسن نے اس الزام کی تردید کی۔ اکتوبر 1989ء میں جب ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ معاہدہ ختم کرنے اور آئی جے آئی سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تو ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین اور اس کے دوسرے رہنماؤں کے گھروں پر فائرنگ کی گئی اور ایم کیو ایم کے سینکڑوں کارکنوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ پاکستان جمہوری پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ خاں جنہوں نے ضیاء دور میں پیپلز پارٹی کا مکمل ساتھ دیا تھا اور جمہوریت کی بحالی کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت سے بھی بڑھ کر جدوجہد کی تھی نے کوٹ ادو کے ضمنی انتخابات پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں غلام مصطفیٰ جتوئی کی حمایت کی تو 26 جنوری 1989ء کو ملتان

میں ان کی گاڑی پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے حملہ کیا اور پتھراؤ کیا۔

وفاقی حکومت نے ایف آئی اے کے اختیارات میں اضافہ کر دیا اور اسے پولیس کے اعلیٰ افسروں یعنی ڈی آئی جی اور ایس پی کو بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کرنے اور قتل کے مقدمات کی تفتیش کرنے کا اختیار دیا جس کے بعد پنجاب حکومت نے تمام صوبائی محکموں کو ہدایت کی کہ وہ ایف آئی اے کو کسی قسم کا کوئی ریکارڈ نہ دکھائیں۔

وفاقی حکومت نے متحدہ اپوزیشن کے رہنما مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی کا بھی احتساب کیا۔ ان کی پانچ ملوں کی منظوری اور دو ارب روپے کا قرضہ جو پہلی حکومت نے منظور کیا تھا منسوخ کر دیا۔ اور ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے اس وقت سنگین بدعنوانیاں کی تھی جب وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے جس کے جواب میں 10 جون 1990ء کو مسٹر جتوئی نے پیپلز پارٹی کی حکومت کی بدعنوانیوں پر مشتمل دستاویزات قومی اسمبلی کے سپیکر کے سامنے پیش کیں جن میں الزام لگایا گیا کہ ڈیوٹی فری شاپس ایک کمپنی کو دی گئی پانچ سو ایکڑ اراضی پر پولٹری فارموں کے نام پر الاٹ کی گئی اور 50 پٹرول پمپوں پر سندھ میں زبردستی قبضہ کیا گیا۔ اسی طرح آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کو ہٹانے کی کوشش کی گئی اور ان کو طرح طرح سے تنگ کیا گیا۔ 23 ستمبر 1989ء کو انہوں نے صدر مملکت اور بری فوج کے سربراہ کے نام خطوط میں الزام عائد کیا کہ ''وفاقی حکومت ان کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کر رہی ہے اور آزاد کشمیر کے اندرونی معاملات میں کھلم کھلا مداخلت کر رہی ہے۔''

جب وفاقی حکومت نے آئی جے آئی کے رہنماؤں کے خلاف کارروائیاں شروع کیں تو آئی جے آئی کی صوبائی حکومت نے بھی پنجاب میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے خلاف انتقامی کارروائیاں کیں۔ 6 اگست 1989ء کو لاہور پولیس نے قابل اعتراض تقریر کرنے پر پنجاب اسمبلی میں ڈپٹی اپوزیشن لیڈر مسٹر سلمان تاثیر کو گرفتار کر لیا۔ تاہم لاہور ہائی کورٹ نے ان کی ضمانت منظور کر لی۔ 17 اگست 1989ء کو اسلامی جمعیت طلبہ ملتان کے قائم مقام ناظم ولایت رندھاوا اور کارکن بہرام کو قتل کرنے اور قتل کی سازش کرنے کے الزام میں ملتان پولیس نے وفاقی وزیر ملک مختار احمد اعوان پیپلز پارٹی ملتان ڈویژن کے سیکرٹری جنرل حبیب اللہ شاکر اور پی ایس ایف ملتان کے 7 کارکنوں کے خلاف مقدمہ درج کیا۔ اس کے فوراً بعد حبیب اللہ شاکر اور پی ایس ایف کے چھ کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ جبکہ تین فرار ہو گئے۔ ملک مختار اعوان گرفتاری سے بچنے

کے لیے کئی ماہ تک سندھ پولیس کی زیر نگرانی کراچی میں مقیم رہے۔ بعد ازاں سندھ ہائی کورٹ میں پیش ہونے کا حکم دیا۔ جس کے بعد انہوں نے لاہور ہائی کورٹ میں ضمانت کی درخواست دائر کی اور باقاعدہ سماعت کے بعد ان کی ضمانت کنفرم کر دی گئی۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر جنہیں وفاقی حکومت نے پنجاب حکومت کو ختم کرنے کا مشن سونپا تھا۔ 17 اپریل 1990ء کو لاہور پولیس نے ان کے خلاف اسلامی اتحاد کے رکن پنجاب اسمبلی ملک بشیر الدین پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا۔ اس طرح ان کے چھوٹے بھائی ملک غلام میلاد کھر کے خلاف ایک نوجوان خاتون اور اس کی والدہ کو اغوا کرنے اور اس کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کیا گیا۔ اس سے پہلے لاہور پولیس نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ درج کیا تھا۔ مقدمہ کھر کی سابقہ بیوی تہمینہ کھر کے بہنوئی مطلوب احمد کی رپورٹ پر درج کیا گیا۔ جس میں انہوں نے الزام لگایا کہ انہوں نے اپنی بیوی عدیلہ کے ساتھ کھر کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہے تاہم اس کیس میں بھی لاہور ہائی کورٹ نے کھر کی ضمانت لے لی۔

بہاولپور پولیس نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے افسر بکار خاص محمد حسین آزاد کے خلاف قابل اعتراض تقاریر کرنے پر مقدمہ درج کیا۔ 5 اکتوبر 1989ء کو فیروز والہ، شیخوپورہ، میں پیپلز پارٹی کے رکن اسمبلی مسٹر وصی ظفر اور فیکٹری کے منیجر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس فیکٹری میں دھماکے سے سات افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ مرکز پنجاب محاذ آرائی کی وجہ سے پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کے رہنما اور کارکن دونوں حکومتوں کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنے اور طرح طرح کی تکلیفوں اور قانونی مشکلات کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔

محاذ آرائی کا ردعمل:

پنجاب حکومت کے ساتھ محاذ آرائی کی وجہ سے وفاقی حکومت نے قومی بنکوں اور مالیاتی اداروں کو ہدایت کی کہ وہ میاں نواز شریف کے اتفاق گروپ چوہدری شجاعت حسین گروپ اور آئی جے آئی کے دوسرے بڑے صنعت کاروں کو مالی سہولتیں فراہم نہ کریں۔ اس کے علاوہ ورکرز ویلفیئر فنڈ، زکوٰۃ فنڈ، کاشتکاروں کو دیئے جانے والے قرضوں کی مطلوبہ رقم، سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں پانچ فیصد اضافے کی رقم، الیکشن 1988ء کے اخراجات اور مطلوبہ ترقیاتی فنڈ پنجاب حکومت کو فراہم نہ کیے۔ بلکہ سٹیٹ بنک میں پنجاب کے پی ایل اے اکاؤنٹ

میں پڑے ہوئے ایک ارب روپے کی رقم منجمد کرلی۔ جس کی وجہ سے پنجاب حکومت کو سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

پنجاب حکومت نے مالی وسائل جمع کرنے کے لیے بنک آف پنجاب قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وفاقی حکومت نے اس کی شدید مخالفت کی اور اسے وفاق کو کمزور کرنے کی کوشش قرار دیا۔ اس مخالفت کے باوجود پنجاب حکومت نے یکم اگست 1989ء کو بنک آف پنجاب قائم کیا۔ اور مسٹر تجمل حسین کو اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ بنک نے صوبے کے تمام بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھولیں۔ وفاقی حکومت نے ٹیلی ویژن کو اپوزیشن، پنجاب اور بلوچستان حکومتوں کے خلاف وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ اپوزیشن کی سرگرمیوں کو بار بار مطالبے کے باوجود مناسب کوریج نہ دی گئی۔ پنجاب حکومت نے ٹیلی ویژن پر اپنی سرگرمیوں کی تشہیر کے لیے ایک گھنٹے کا وقت قیمتاً طلب کیا اور تمام شرائط پوری کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ مگر وفاقی حکومت نے انکار کر دیا۔ جس کے بعد پنجاب حکومت نے اپنا ٹیلی ویژن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور وفاقی حکومت سے اس کی اجازت طلب کی۔ آزاد کشمیر کی حکومت نے بھی اپنا ٹیلی ویژن قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور وفاقی حکومت سے اس کی اجازت طلب کی جب کہ ایک پرائیویٹ ادارے پیپلز ٹیلیویژن نیٹ ورک پرائیویٹ لمیٹڈ نے بھی وفاقی حکومت سے اجازت طلب کی۔ ان تینوں درخواستوں پر غور وخوض کرنے کے بعد 2 جنوری 1990ء کو وفاقی حکومت نے پنجاب کی حکومت کی درخواست داخل دفتر کردی۔ تاہم آزاد کشمیر کی درخواست کو زیرِ غور رکھا۔ جب کہ پرائیویٹ ادارے پیپلز نیٹ ورک کو کام کرنے کی اجازت دے دی۔ پنجاب حکومت نے وفاقی حکومت کے اس اقدام کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ اور الزام عائد کیا کہ پیپلز ٹیلی ویژن نیٹ ورک کو سیاسی مفادات کے تحت کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے تاہم اس سے پہلے کہ سپریم کورٹ کوئی فیصلہ کرتی پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے چھ روز بعد پنجاب میں زکوٰۃ فنڈ سے 38 کروڑ روپے کی تقسیم کی تحقیقات کا حکم دیا اور پنجاب کو زکوٰۃ فنڈ سے رقم کی مزید فراہمی روک دی۔ جس میں پوری صوبے میں زکوٰۃ کی تقسیم رُک گئی۔ 22 اپریل 1989ء کو وفاقی حکومت نے ملک بھر میں کام کرنے والی زکوٰۃ وعُشر کمیٹیوں کو ختم کر کے زکوٰۃ وعُشر کا انتظامی ڈھانچہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور اپنے ارکانِ اسمبلی کو ایڈمنسٹریٹرز زکوٰۃ وعُشر مقرر کیا۔ زکوٰۃ فنڈ براہِ راست وزارتِ خزانہ کی تحویل میں دے دیا اور فیصلہ کیا کہ وفاقی حکومت صوبائی زکوٰۃ کونسلوں

کے ارکان اور اُن کے چیئرمینوں کو مقرر کرے گی۔ پنجاب حکومت نے وفاقی حکومت کے اس فیصلے کی شدید مذمت کی اور اُسے صوبائی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔ اس نے پیپلز پارٹی کے زکوٰۃ و عشر ایڈمنسٹریٹروں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنا نظام زکوٰۃ رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جون 1989ء کے بجٹ میں 10 کروڑ روپے کے سرمایہ سے بیت المال قائم کیا گیا۔ اور اس کے ذریعے مستحق افراد کو زکوٰۃ کی تقسیم شروع کی گئی۔ وفاقی حکومت نے خصوصاً ضمنی انتخابات کے دوران واپڈا کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ اور پیپلز پارٹی کے حامیوں کو بڑی تعداد میں بجلی کے کنکشن دیئے گئے۔ صرف ان دیہاتوں میں بجلی پہنچائی گئی جہاں پیپلز پارٹی کے حامی رہتے تھے۔ اور تقریباً 2500 دیہاتوں کو بجلی پہنچائی گئی اور اس سلسلے میں پنجاب حکومت کی سفارش کو نظر انداز کیا گیا۔ جس کے بعد صوبائی حکومت نے بجلی کی تقسیم کا نظام اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا۔

O

وفاق اور صوبوں کے درمیان محاذ آرائی سے قومی معیشت غیر معمولی متاثر ہوئی۔ قومی پیداوار میں کمی ہوئی۔ سیاسی عدم استحکام میں اضافہ ہوا۔ لاقانونیت اور بدعنوانی کو فروغ حاصل ہوا۔ غیر یقینی کیفیت کی وجہ سے سرمایہ کاری میں کمی ہوئی۔ لاقانونیت کی وجہ سے صنعتی پیداوار متاثر ہوئی۔ سیاسی بنیادوں نے قرضوں کے اجراء اور اُن کی معافی کی وجہ سے بنکوں کی مالی حالت خستہ ہوگئی۔ وفاقی اور صوبائی افسران ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ ہر صوبہ اپنے حقوق مانگنے لگا۔ بلوچستان نے گیس کی رائلٹی کا مطالبہ کیا۔ سرحد اور آزاد کشمیر نے بجلی سے حاصل ہونے والی آمدنی میں سے حصہ طلب کیا۔ پنجاب نے آبادی کی شرح کے مطابق مالی وسائل طلب کئے۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں گندم کی قلت پیدا ہوگئی۔ اور وفاقی حکومت کو 22 لاکھ ٹن گندم درآمد کرنا پڑی۔ پنجاب حکومت نے اپنی ضروریات کے لیے 16 لاکھ ٹن گندم طلب کی۔ مگر وفاقی حکومت نے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے صرف پنجاب میں 210 فلور ملیں بند ہوگئیں۔

صوبوں کے درمیان دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر جیسے اہم قومی مسائل حل نہ ہوسکے۔ جس سے ملک کو سالانہ اربوں روپے کا نقصان ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق مرکز پنجاب محاذ آرائی کی وجہ سے پنجاب سے تقریباً 10 ارب روپے کے صنعتی اور دیگر منصوبے دوسرے صوبوں کو منتقل ہوگئے۔ قومی معیشت کو 65 ارب روپے کا نقصان ہوا۔ جب

کہ 15 ارب روپے غیر مستحق افراد کی جیبوں میں چلے گئے۔قومی خزانے سے ہارس ٹریڈنگ اور ارکان اسمبلی وفاداریاں تبدیل کرانے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کئے گئے۔سرکاری اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔بے نظیر بھٹو کی کابینہ کے ارکان، مشیروں اور خصوصی معاونوں کی تعداد 60 سے زیادہ تھی۔اوراُن کی تنخواہوں اور مراعات پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اور ایک اندازے کے مطابق 1989ء کے دوران اشیاء صرف کی قیمتوں میں 20 فیصد اضافہ ہوا۔قومی بچت کی شرح میں بھی کمی واقع ہوئی۔حکومت نے عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت نیشنل سیونگ کی مختلف سکیموں پر دیئے جانے والے منافع کی شرح میں کمی کر دی۔جس کی وجہ سے لوگوں نے وہاں سے اربوں روپے نکلوالئے۔بنکوں کے ڈیپازٹس میں 7 فیصد کمی واقع ہوئی۔مہنگائی میں اس لیے تیزی سے اضافہ ہوا کہ حکومت نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیکس لگائے اور کرنسی نوٹ چھاپے اس کے علاوہ اشیاء صرف کی قیمتوں می بار بار اضافہ کیا۔مثلاً برسراقتدار آتے ہی پیپلز پارٹی کی حکومت نے 8 دسمبر 1988ء کو 12 ارب 13 کروڑ روپے کے ٹیکس لگائے۔5 جنوری 1989ء کو واپڈا نے 5 پیسے فی یونٹ بجلی کے نرخوں میں اضافہ کیا۔ گندم کی قیمت میں اڑھائی روپے اضافہ کیا گیا۔

1989ء کے قومی بجٹ میں مزید ٹیکس عائد کئے گئے یہاں تک کہ پاسپورٹ فیس ڈاک کی شرح اور ٹیلیفون کے چارجز میں اضافہ کیا گیا۔کاغذ اور گتہ پر سیلز ٹیکس عائد کیا گیا۔جس سے درسی کتب مہنگی ہوگئیں۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 89-1988ء میں ضروری اشیاء کی قیمتوں میں 13.5 فیصد اضافہ ہوا۔اسی طرح اگست 1989ء میں بجلی، گیس اور پانی کے نرخوں میں 20 فیصد اور پٹرول کی مختلف مصنوعات کی قیمتوں میں 15 فیصد اضافہ کیا گیا۔250 گز سے زیادہ شہری اراضی خریدنے والے اور 800 سی سی سے زیادہ طاقتور گاڑیوں کو خریدنے والوں پر ٹیکس لگایا گیا۔یکم دسمبر 1989ء کو پنجاب، سندھ اور بلوچستان نے سٹیٹ بنک میں اپنے کھاتوں سے تمام رقوم نکلوالیں۔اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اربوں روپے کی اوڈی بھی لی۔ مہنگائی میں اضافہ کہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وفاقی حکومت اشیاء ضرورت کی قیمتوں میں وقتاً فوقتاً اضاہ کرتی رہی۔جنوری 1990ء میں سیمنٹ کے نرخوں میں 5 روپے فی بوری اضافہ کیا۔26 مارچ 1990ء کو پٹرولیم کی مختلف مصنوعات اور کھاد کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا۔اس اضافے کو ایک کڑوی گولی قرار دیا گیا۔اس سے مہنگائی میں بے پناہ اضفاہ ہوا۔پورے ملک میں مہنگائی کے

خلاف ہڑتالیں کی گئیں۔مظاہرے ہوئے اور وفاقی حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔

جون 1990ء کے بجٹ میں وفاقی حکومت نے 12 ارب 95 کروڑ روپے کے مزید ٹیکس لگائے۔گندم، بجلی، ٹیلی فون اور سگریٹ کے نرخ بڑھائے۔ریڈیو اور ٹیلیویژن کی سالانہ فیسوں میں اضافہ کیا گیا۔پاسپورٹ فیس میں 100 روپے سے 300 روپے اضافہ کیا گیا۔بجلی کے نرخ 8.3 فیصد بڑھائے گئے۔زکوٰۃ وعشر آرڈیننس کو فنانس بل کا حصہ بنایا گیا۔سیاسی انتشار کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ کھرب روپے بجٹ سے قبل ملک سے باہر منتقل کئے گئے۔غذائی صورت حال اس قدر خراب ہوگئی کہ حکومت کو 1990ء میں 7 ارب 63 کروڑ روپے کی گندم درآمد کرنا پڑی۔تیل کے بحران کی وجہ سے 5 ارب 78 کروڑ روپے کی کھاد باہر سے منگوائی گئی۔ایک اندازے کے مطابق پیپلز پارٹی کے 20 ماہ کے دور میں تقریباً دو کھرب روپے ہارس ٹریڈنگ اور بدعنوان کی نذر ہوئے۔پی آئی اے کے کرایوں میں 20 ماہ کے دوران مجموعی طور پر 20 فیصد اضافہ کیا گیا۔مرکز اور صوبوں کے درمیان محاذ آرائی کی وجہ سے ٹیکسوں کی وصولی میں 8 ارب روپے کی کمی ہوئی۔جس کی وجہ سے بجٹ میں خسارہ بڑھ کر 60 ارب روپے تک پہنچ گیا۔جو 1989ء میں 45 ارب 66 کروڑ روپے تھا۔پاکستان کی برآمدات اور درآمدات میں فرق 105 ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔جس کو پورا کرنے کے لیے دوست ممالک اور غیر ملکی وملکی اداروں سے قرضے لینے پڑے۔دوسرے ممالک میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی طرف سے بھیجی جانے والی رقوم میں بھی کمی ہوئی۔

صوبوں کے مابین وسائل کی تقسیم پر اختلافات پیدا ہوئے۔اور اس بنیاد پر صوبے ایک دوسرے پر تنقید کرنے لگے۔پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف نے 27 جولائی 1990ء کو الزام لگایا کہ ''70 فیصد قرضے سندھ کو دیئے گئے۔پنجاب کو 56 کی بجائے 40 فیصد مالی وسائل فراہم کئے گئے۔رینجرز میں 10 ہزار افراد سندھ سے بھرتی کئے گئے۔60 ہزار تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کو روزگار مہیا کرنے کے منصوبے میں پنجاب کو حصہ نہیں دیا گیا۔سیم وتھور کو ختم کرنے کے لیے مخصوص فنڈ میں سندھ اور سرحد کا حصہ بڑھا کر دیا گیا۔پنجاب کا حصہ کم کیا گیا۔باسمتی چاول اور کپاس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے پنجاب کو اس کا حصہ نہیں دیا گیا۔'' اس بیان سے پنجاب کی سیاسی قیادت میں احساس محرومی کا پتہ چلتا ہے۔پنجاب حکومت کی طرف سے وفاقی حکومت کی مخالفت کا بدلہ اندرونِ سندھ میں رہنے والے پنجابیوں سے لیا گیا۔ان کے گھر جلائے گئے۔اُن کی فصلوں اور کاروبار کو تباہ کیا گیا ان کی زمینوں اور جائیداد پر قبضہ کر کے اُنہیں سندھ سے پنجاب نقل مکانی

کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پنجاب حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 20 ہزار سے زائد غیر سندھی اندرونِ سندھ سے نقل مکانی کر کے رحیم یار خاں اور پنجاب کے دوسرے ضلعوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے نقل مکانی کرنے والے افراد کی بحالی کے لیے ایک کروڑ روپے کی گرانٹ کا اعلان کیا۔ تاہم وفاقی حکومت کی ہٹ دھرمی کی حد یہ تھی کہ نہ تو سے نے غیر سندھیوں کی نقل مکانی کا اعتراف کیا۔ اور نہ ہی ان کے ساتھ زبانی ہمدردی ظاہر کی۔ جس سے پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ اور اس کا اظہار 1990ء کے عام انتخابات میں ہوا۔ جس میں پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی صرف 114 صوبائی اسمبلی کی نشستیں حاصل کیں۔ یہ تاریخ میں پیپلز پارٹی کی پنجاب میں سب سے بڑی شکست تھی۔ جس کے پس پردہ اسٹیبلشمنٹ کی پوری سازش کام کر رہی تھی اور بالآخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے۔

■ ■ ■

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور......

وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد 4 دسمبر 1988ء کو بے نظیر بھٹو نے جو کابینہ تشکیل دی۔ اس میں اسلامی جمہوری اتحاد کے سینیٹر صاحبزادہ یعقوب علی خان کو بطور وزیر خارجہ شامل کیا۔ وہ صدر ضیاء کے دور سے وزیر خارجہ چلے آ رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے نہ صرف انہیں قبول کیا بلکہ انہیں اپنے 20 ماہ کے دور میں وزیر خارجہ کے عہدے پر برقرار رکھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ سمجھا گیا کہ اس نے جنرل ضیاء کی وضع کردہ خارجہ پالیسی کو من وعن تسلیم کیا۔ حالانکہ 1988ء کے الیکشن میں بے نظیر بھٹو نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مارشل لاء حکومت کی تمام پالیسیوں کو ختم کر دیں گی۔ اور اس کے تمام نشانات مٹا دیں گی۔ مگر اقتدار سنبھالتے ہی انہوں نے تقریباً ان تمام پالیسیوں کو قبول کیا۔ جن کی وہ گزشتہ گیارہ سال سے مخالفت کرتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ اُن کی ایسی مجبوری تھی جس سے نجات ممکن ہی نہیں تھی۔ بصورتِ دیگر فوج میں موجود ضیاء کی باقیات انہیں کبھی اس منصب تک پہنچنے نہ دیتے۔ انہوں نے صدارتی انتخابات میں اپنا امیدوار واپس لے کر اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار مسٹر غلام اسحاق کی حمایت کی۔ غلام اسحٰق خان اس وقت قائم مقام صدر تھے۔ پہلے پیپلز پارٹی نے اپنے سیکرٹری جنرل ریٹائرڈ جنرل ٹکا خاں کو صدارتی امیدوار نامزد کیا مگر بعد ازاں انہیں پنجاب کا گورنر مقرر کروا کر ان کے کاغذات واپس لے لئے۔ جبکہ غلام اسحٰق خان کے علاوہ دیگر امیدواروں میں نوابزادہ نصر اللہ خاں، احمد ایچ جعفری اور ملک نوروز خان شامل تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں وہ سیاست دان تھے جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جمہوریت کی بحالی کے لیے مسلسل جدوجہد میں صرف کیا تھا۔ اور انہوں نے جنرل ضیاء کے دور میں پیپلز پارٹی کے ساتھ ایم آر ڈی کے تحت بھرپور جدوجہد کی اور اس نازک اور برے وقت میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دی۔ مگر بے نظیر بھٹو نے ان کی ان قربانیوں کو ذرہ بھر اہمیت نہ دی اور اپنے تمام قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو ہدایت کی کہ وہ نوابزادہ کے مقابلے میں اسحٰق خان کو

ووٹ دیں۔ حالانکہ ان کی پارٹی کے بعض لیڈر نوابزادہ کے حق میں تھے۔ اور از خود نوابزادہ نصر اللہ
خاں نے 8 دسمبر 1988ء کو وزیر اعظم پارلیمنٹ میں ان کے چیمبر میں ملاقات کی اور ان پر زور دیا
کہ ایم آر ڈی کے مقاصد کے حصول کے لیے پیپلز پارٹی ان کو ووٹ دے۔ کیونکہ انہوں نے
جمہوریت کی بحالی کے لیے پورے گیارہ سال جنگ لڑی ہے۔ مگر ان کی خواہش کو نظر انداز کیا
گیا۔ چنانچہ 12 دسمبر 1988ء کو صدارتی انتخابات ہوئے۔ جس میں قائم مقام صدر غلام اسحق
خان کو 446 میں سے 348، نوابزادہ نصر اللہ خاں کو 91، احمد ابراہیم جعفر کو چھ اور ملک نوروز خان
کو ایک ووٹ ملا۔ پارلیمنٹ سے اسحق خان کو 233 اور نوابزادہ کو 39 ووٹ ملے جبکہ بلوچستان
اسمبلی سے نوابزادہ کو دو اور اسحق خان کو 15 ووٹ ملے۔ سرحد سے اسحق خان کو 47 اور نوابزادہ کو
33 ووٹ ملے۔ سندھ سے اسحق خان کو 104 اور نوابزادہ کو ایک ووٹ ملا۔ اور غلام اسحق خان
ملک کے آٹھویں صدر منتخب ہوئے۔ مولانا فضل الرحمٰن اور پیپلز پارٹی کے بعض رہنماؤں نے
الزام عائد کیا کہ بے نظیر بھٹو نے فوج اور بیوروکریسی کو خوش کرنے کے لیے اسحق خان کو
ووٹ دیا۔ اور یہ الزام کسی حد تک درست بھی تھا۔ کیونکہ بے نظیر بھٹو نے جب غلام اسحق خان
کو حمایت کا فیصلہ کیا اس وقت انہیں بخوبی علم تھا کہ اسحق خان ان کے حریف سیاسی اتحاد آئی
جے آئی کے امیدوار ہیں۔ اور ان کا شمار مرحوم جنرل ضیاء کے قریبی شخصیتوں میں ہوتا
ہے۔ انہیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ آٹھویں ترمیم کے تحت صدر کو لامحدود اختیارات حاصل
ہیں۔ جن میں وزیر اعظم کو نامزد کرنا، مسلح افواج، اعلیٰ عدالتوں کے سربراہوں اور چیف
الیکشن کمشنر کو مقرر کرنے اور ہنگامی حالت میں اسمبلیوں کو توڑنے کے اختیارات شامل تھے۔
مگر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے اسحق خان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا جس کا
دوسرا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے برسر اقتدار آتے ہی آٹھویں ترمیم جس کو ختم کرنے کا تہیہ
کر کے وہ اقتدار کی دہلیز تک پہنچی تھیں کو تسلیم کر لیا۔ اگر چہ انہیں علم تھا کہ صدر اور وزیر اعظم
اختیارات میں واضح عدم توازن موجود ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس وقت غلام
اسحاق کو نہ صرف صدر قبول کیا بلکہ جمہوریت کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کرنے پر انہیں
خراج تحسین پیش کیا۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ نتائج کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے یہ
فیصلہ کیا تھا۔

بے نظیر بھٹو کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ ضیاء دور میں جدوجہد کرنے والے اور

حکومت بنانے میں تعاون کرنیوالے اپنے سیاسی حلیفوں کے اعتماد کو برقرار نہ رکھ سکیں۔ اور وزیر
اعظم بننے کے دو ماہ بعد انہوں نے ان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً 12 دسمبر 1988ء کو
بینظیر بھٹو نے جب اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تو اس وقت ان کے حق میں 148 ارکان نے ووٹ
دیئے۔ پیپلز پارٹی کے ارکان کے علاوہ انہیں اعتماد کا ووٹ دینے والوں میں بیگم عابدہ حسین، ڈاکٹر
شیر افگن، طارق مگسی، ذوالفقار علی برق اور محمد حسین انصاری شامل تھے جبکہ نوابزادہ نصر اللہ خاں،
خان عبدالولی خان، مولانا فضل الرحمٰن، ملک غلام مصطفےٰ کھر اور بلوچستان نیشنل الائنس کے ارکان
ایوان میں موجود نہیں تھے اور 55 ارکان نے بے نظیر بھٹو کے خلاف ووٹ دیا۔ تاہم ایم کیو ایم، فاٹا
اور عوامی نیشنل پارٹی کے ارکان نے ان کے حق میں ووٹ دیا۔ مگر صرف چھ ماہ کے عرصہ کے دوران
پیپلز پارٹی کے مخالف ارکان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ جس کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی
حکومت کا منفی رویہ تھا۔ جون 1989ء میں متحدہ اپوزیشن معرض وجود میں آئی۔ اور یکم نومبر
1989ء کو جب بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد پر رائے شماری ہوئی تو ان کے خلاف 107
ووٹ پڑے۔ یعنی اپوزیشن کے ارکان کی تعداد 55 سے بڑھ کر 107 ہو گئی۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے
حامی ارکان کی تعداد 148 سے کم ہو کر 119 رہ گئی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو قومی اسمبلی میں سادہ
اکثریت حاصل تھی اور سینٹ میں اس کے حامی ارکان کی تعداد برائے نام تھی جبکہ وفاقی حکومت دو
تہائی اکثریت کے بغیر کسی قانون یا آئینی ترمیم کو نہ تو منسوخ کر سکتی تھی اور نہ وضع کر سکتی تھی اس
معاملے میں وہ بے بس تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خاموشی اور افہام و تفہیم سے قومی اسمبلی میں دو تہائی
اکثریت حاصل کرتی مگر اس نے سینٹ کو توڑنے، آٹھویں ترمیم کو منسوخ کرنے اور صوبوں کے
ساتھ محاذ آرائی کی پالیسی اختیار کی جس کی وجہ سے وہ عدم استحکام کا شکار ہو گئی اور تقریباً تمام سیاسی
قوتیں اس کے خلاف متحد ہو گئیں۔ مزید براں یہ کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے پنجاب اور بلوچستان
کے علاوہ آزادہ کشمیر میں مسلم کانفرنس کی حکومت بھی ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ترقیاتی فنڈز
روک لئے اور 12 ستمبر 1989ء کو اسے توڑنے کا فیصلہ کیا اور وہاں پر نگران حکومت کے قیام کے
لیے آزاد کشمیر کے چیف جسٹس کو اسلام آباد طلب کیا۔ مگر اپوزیشن کے دباؤ صدر اور چیف آف
آرمی سٹاف کی مداخلت پر یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ تاہم اس اقدام سے یہ تاثر ابھرا کہ پیپلز پارٹی
ملک میں ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اور اپنے مخالفوں کو برداشت کرنے کا اس میں
حوصلہ نہیں۔

بے نظیر بھٹو کی ایک اور سیاسی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ایسے افراد کو اپنی پارٹی میں دوبارہ شامل کیا۔ جنہوں نے ان کے والد اور پیپلز پارٹی سے بے وفائی کی اور ان کے والد کی حکومت کے خاتمہ کے بعد پیپلز پارٹی کو چھوڑ گئے تھے۔ ان میں قابل ذکر پنجاب کے سابق وزراء اعلیٰ ملک غلام مصطفےٰ کھر اور مسٹر حنیف رامے تھے۔ ان افراد کو کابینہ کے بعض ارکان اور پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کی مخالفت کے باوجود پیپلز پارٹی میں نہ صرف شامل کیا گیا بلکہ اہم قومی معاملات اور پارٹی امور میں ان سے مشورے کیے گئے ان افراد کی شمولیت سے پیپلز پارٹی کو کوئی سیاسی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ پارٹی میں نفاق پیدا ہوا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی پارٹی کے اہم ارکان اسمبلی کو اپنی کابینہ میں شامل کرنے کے علاوہ انتخاب ہارنے والے اور انتخاب جیتنے کی اہلیت نہ رکھنے والے رہنماؤں کو اپنا مشیر اور معاون خصوصی مقرر کیا۔ ان میں راؤ رشید، ملک محمد قاسم، مسٹر خالد احمد، ڈاکٹر نصیرا ے شیخ، اقبال اخوند، میجر جنرل (ر) نصیر اللہ بابر، وی اے جعفری اور بہی منیوالا نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ 40 رہنماؤں کو اپنا افسر بکار خاص (او ایس ڈی) مقرر کیا اس قدر مشیر مقرر کیے گئے کہ ان کی تعداد وفاقی وزراء سے زیادہ ہوگئی اور اہم قومی معاملات اور پارٹی امور میں وفاقی وزراء کے برعکس مشیروں کا عمل دخل بڑھ گیا۔ جس کی وجہ سے وفاقی وزراء اور مشیروں کے مابین چپقلش شروع ہوگئی۔ تاہم نومبر 1989ء میں جب وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی تو وفاقی وزراء اور ارکان اسمبلی کی غیر معمولی اہمیت بڑھ گئی جس کے بعد بے نظیر بھٹو کو اپنے قریبی مشیروں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ اور بالآخر انہیں فارغ کر کے وفاقی وزراء اور ارکان اسمبلی کو اہمیت دینا پڑی جس کے بعد مشیر وزیراعظم اور وفاقی وزراء کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ اور انہوں نے ان کے خلاف زیر زمین سرگرمیاں شروع کردیں۔

سینٹ اور بلدیاتی اداروں کو توڑنے کی کوشش:

اگرچہ سینٹ اور بلدیاتی ادارے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے تھے۔ لیکن اُن کے ارکان کی اکثریت آئی جے آئی کی ہم خیال تھی۔ جنرل ضیاء کے برسر اقتدار آنے کے بعد 1979ء میں پہلی مرتبہ غیر جماعتوں بنیادوں پر بلدیاتی اداروں کے انتخابات ہوئے۔ اسکے بعد 1983ء اور 1987ء میں بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات

ہوئے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں ہی سید فخر امام، یوسف رضا گیلانی، میاں غلام حیدر وائیں، مخدوم احمد محمود، ملک فاروق اعظم، میاں منظور وٹو، شیخ رشید احمد، مخدوم زادہ شاہ محمود قریشی، مسٹر صدیق خان کانجو، ملک نور ربانی کھر، چوہدری پرویز الٰہی، چوہدری عبدالغفور، اور میاں شہباز شریف جیسے سیاسی رہنما قومی وصوبائی منظر پر اُبھرے۔ پیپلز پارٹی جب 1988ء میں برسر اقتدار آئی تو اس وقت بلدیاتی اداروں کی جڑیں مضبوط ہوچکی تھیں۔ اگرچہ ان اداروں کے ایوان عوام کے براہِ راست ووٹوں کے ذریعے منتخب ہوئے تھے مگر ان میں پارٹی پالیٹکس داخل نہ ہونے دی گئی۔ خاص طور پر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو ان سے باہر رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے ان اداروں میں جتنے لوگ منتخب ہوکر گئے ان کی اکثریت ذہنی طور پر پیپلز پارٹی کی مخالف تھی۔ پیپلز پارٹی کو ان اداروں کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا کہ جب پنجاب حکومت نے پیپلز پروگرام کی مخالفت کی اور کہا کہ وفاقی حکومت کے پاس اس پروگرام پر عملدرآمد کرنے کے لیے کوئی ایجنسی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے فنڈز صوبوں کو منتقل کیے جائیں تاکہ وہ بلدیاتی اداروں کے ذریعے اُن کو استعمال میں لا سکتے۔ تاہم پیپلز پارٹی کی حکومت نے بلدیاتی اداروں کے غیر جماعتی ایوانوں کو توڑ کر جماعتی بنیادوں پر از سر نو انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ان میں اپنے کارکن داخل کر کے ان کے ذریعے پیپلز پروگرام پر عملدرآمد کرایا جاسکے۔ بلدیاتی اداروں کو توڑنے سے پہلے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی صدارت میں ان کی کابینہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں اس اقدام کے نتائج اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ جس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان اداروں کو توڑ دیا جائے لیکن اس کے لیے وقت کا تعین وزیراعظم پر چھوڑ دیا گیا۔ 22 فروری 1989ء کو بلدیات اور دیہی ترقی کے وفاقی وزیر سید فیصل حیات نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''عنقریب بلدیاتی انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔ اس بات کا اصولی طور پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ وزیراعظم اس کا جلد اعلان کریں گی۔'' پنجاب حکومت نے اس اعلان کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کیا اور صوبائی وزیر بلدیات چوہدری پرویز الٰہی نے کہا کہ ''آئین کے تحت وفاقی حکومت بلدیاتی اداروں کو نہیں توڑ سکتی اگر وفاقی حکومت نے ایسا کوئی اقدام اٹھایا تو اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔'' اسی طرح کا ردعمل بلدیاتی اداروں میں بھی پیدا ہوا۔ اور بلدیاتی ارکان نے قراردادوں کے ذریعے وفاقی حکومت کی مخالفت شروع کردی۔ اس بڑھتی ہوئی مخالفت کی وجہ سے وفاقی حکومت کی مخالفت

شروع کر دی۔ اس بڑھتی ہوئی مخالفت کی وجہ سے وفاقی حکومت کو احساس ہوا کہ بلدیاتی اداروں کو توڑنا آسان کام نہیں۔ چنانچہ اپریل 1989ء میں یہ ارادہ ترک کر کے ضلعی سطح پر پیپلز پروگرام کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تاہم پورے چار ماہ تک یہ مسئلہ وفاقی اور پنجاب حکومتوں کے درمیان باعث نزاع بنا رہا۔

پیپلز پارٹی کی مرکز میں حکومت قائم ہونے کے صرف 13 دن بعد اٹارنی جنرل مسٹر یحیٰ بختیار نے مطالبہ کیا کہ سینٹ غیر جماعتی اسمبلیوں کی منتخب کردہ ہے۔ اس لیے توڑ دیا جائے۔ 11 مارچ 1989ء کو وفاقی وزیر قانون سید افتخار علی گیلانی نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سینٹ کی آئینی حیثیت کے بارے میں سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد چاروں صوبوں کے ہائی کورٹوں میں سینٹ کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا گیا۔ جن کی باقاعدہ سماعت ہوئی اور سینٹ کے خلاف رٹ درخواستوں کو مسترد کیا گیا۔ عدالتوں نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ سینٹ کو توڑنے سے ملک میں انتشار پیدا ہوگا۔ وفاقی حکومت نے ان فیصلوں کے خلاف 25 مارچ 1990ء کو سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جسے باقاعدہ حکومت کی طرف سے چلائی جانے والی مہم کے خلاف سینٹ میں ایک تحریک استحقاق پیش کی۔ جس پر باقاعدہ بحث کے بعد چیئرمین سینٹ مسٹر وسیم سجاد نے رولنگ دی کہ "سینٹ کو توڑنے کا مطالبہ آئین کی صریح خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ سینٹ کا ادارہ آئین کی آرٹیکل نمبر 89 کے تحت قائم کیا گیا ہے اور اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ سینٹ کی وجہ سے چیک اینڈ بیلنس کا نظام قائم ہے۔ جو اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔" بعض مبصرین کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت اس لیے بھی سینٹ کو توڑنا اور اس کے طریقہ انتخاب کو بدلنا چاہتی تھی کہ اس سے صدر غلام اسحٰق خان بھی متاثر ہو سکتے تھے۔ کیونکہ صدر بننے سے پہلے وہ سینٹ کے چیئرمین تھے۔ اور 1973ء کے آئین میں صدر کی عدم موجودگی میں اسپیکر قومی اسمبلی یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو قائم مقام صدر کے فرائض سونپے گئے تھے جب کہ آٹھویں ترمیم میں یہ فرائض چیئرمین سینٹ کو سونپے گئے آٹھویں ترمیم اور سینٹ کے خاتمہ سے یہ شق خود بخود ختم ہو سکتی تھی اور اس صورت میں صدر اسحٰق کے انتخاب کو چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ مگر تمام تر کوششوں کے باوجود پیپلز پارٹی کی حکومت یہ مقصد حاصل نہ کر سکی۔

8 ویں ترمیم:

آٹھویں ترمیم 1986ء میں منظور کی گئی تھی اس کے تحت صدر جنرل ضیاء کے دورِ حکومت میں کیے گئے تمام اقدامات بشمول فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو قانونی تحفظ دیا گیا اور اس ترمیم کے بعد صدر کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور 1973ء کے تحت صدر صرف آئینی سربراہ تھے اور انہیں کسی قسم کے انتظامی اختیارات حاصل نہیں تھے۔ اور تمام اختیارات وزیراعظم کے ہاتھ میں تھے۔ جب کہ آٹھویں ترمیم کی 1973ء کے آئین میں شمولیت کے بعد صدر کو وزیراعظم کو مارچ 1990ء تک نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ قومی اسمبلی کو توڑنے، مسلح افواج کے تینوں سربراہوں، جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین، سپریم کورٹ، ہائی کورٹوں کے سربراہ اور چیف الیکشن کمشنر کی تقرری کا اختیار بھی انہیں حاصل ہو گیا۔ صوبے کے گورنروں کا تقرر کرنے، ہائی کورٹ کے ججوں کا تبادلہ کرنے اور ان کی ترقی و تنزلی کا اختیار بھی صدر کے ہاتھ میں چلا گیا۔ یہ اختیارات صدر کے پاس چلے جانے سے وزیراعظم کے اختیارات بہت محدود ہو گئے۔ 1988ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت برسراقتدار آئی تو اس نے آٹھویں ترمیم کو اپنے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار اور اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کیا۔ کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ جنرل ضیاء کے دور میں قائم کیے گئے کسی بھی ادارے کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ اس دور میں برطرف کیے گئے کسی ملازم کو نہ تو وہ بحال کر سکتی تھی اور نہ ہی فوجی عدالتوں سے سزا یافتہ کسی بھی شخص کی سزا معاف کر سکتی تھی۔ وزیراعظم ملک کی چیف ایگزیکٹو ہونے کے باوجود مسلح افواج کے سربراہ کو مقرر نہیں کر سکتی تھیں اور نہ تبدیل کر سکتی تھیں۔ وہ مارشل لاء حکومت کے کسی فیصلے کو نہ تو منسوخ کر سکتی تھیں۔ ان کا الیکشن کمیشن، فوج، وفاقی شرعی عدالت، سپریم کورٹ و دوسری اعلیٰ عدالتوں کے انتظامی امور میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ آٹھویں ترمیم کی موجودگی میں صدر وزیراعظم کو کسی وقت برطرف کر سکتا تھا۔ اور پوری قومی اسمبلی کو توڑ کر اس کے ارکان کو گھر بھیج سکتا تھا۔ اختیارات کے اس عدم توازن کو ختم کرنے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم بننے کے فوراً بعد آٹھویں ترمیم کو ختم کرنے کے لیے بھرپور مہم چلائی۔ 14 جنوری 1989ء کو انہوں نے کہا کہ "آٹھویں ترمیم جمہوریت پر ایک سیاہ دھبہ ہے۔ اُسے دھوئے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھیں گی۔" وفاقی وزیر قانون سید افتخار حسین گیلانی نے آٹھویں ترمیم پر ریفرنڈم کرانے کی

تجویز پیش کی جسے اپوزیشن نے اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ قومی اسمبلی کی موجودگی میں ریفرنڈم کرانے کی ضرورت نہیں۔ بعدازاں وفاقی وزیر قانون نے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ملک کی تقریباً تمام بڑی بار ایسوسی ایشنوں سے خطاب کیا۔ اور قانون کے پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد کو آٹھویں ترمیم کے منفی پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ مزید براں یہ کہ سندھ ہائی کورٹ میں اس ترمیم کے خلاف رٹ دائر کی گئی۔ جسے باقاعدہ ساعت کے بعد مسترد کر دیا گیا۔ مگر وفاقی حکومت نے اپنی جدوجہد ترک نہ کی۔ اور سپریم کورٹ میں ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی۔ مگر پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح جب بلوچستان اسمبلی توڑی گئی اور اپوزیشن نے اس کی بحالی کا مطالبہ کیا تو اس کی بحالی کو آٹھویں ترمیم کے خاتمہ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ مگر بلوچستان ہائی کورٹ نے اسمبلی بحال کر دی اور پیپلز پارٹی کی حکومت کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ اپوزیشن نے حکومت سے کہا کہ وہ آٹھویں ترمیم کے جن حصوں میں ترمیم کرنا چاہتی ہے اس کی نشاندہی کرے۔ مگر حکومت نے کلی طور پر اس ترمیم کو ختم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اپوزیشن کا موقف تھا کہ اگر آٹھویں ترمیم کو کلی طور پر ختم کیا گیا تو سینٹ، وفاقی شرعی عدالت، قومی و صوبائی اسمبلیوں کی اضافی نشستیں، قرارداد مقاصد جو اس ترمیم کے تحت 1973ء کے آئین کا حصہ بنائی گئی تھی اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور کئی دوسرے ادارے متاثر ہوں گے۔ اس لیے اس ترمیم کا مکمل طور پر خاتمہ قومی اداروں کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اپوزیشن نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ حکومت مذاکرات کے ذریعے پہلے آٹھویں ترمیم کے متنازعہ حصوں پر اتفاق رائے پیدا کرے۔ اس کے بعد اس کے خاتمہ کی بات کریں۔ ابتداء میں اس تجویز کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ مگر بعدازاں جب حکومت کو محسوس ہوا کہ وہ تنہا آٹھویں ترمیم کو ختم نہیں کر سکتی تو اس اپوزیشن اور پنجاب حکومت سے مذاکرات شروع کیے مگر اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ آٹھویں ترمیم کا کوئی نتیجہ نکلتا، اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا۔

پیپلز پارٹی کی کوششوں کو اس وقت تقویت حاصل ہوئی جب میاں نواز شریف کی کابینہ کے صوبائی وزیر خوراک سردار مقصود احمد لغاری نے اچانک 8 مارچ کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ اور کہا کہ میاں نواز شریف کا برسراقتدار رہنا قومی مفاد میں نہیں۔ 12 مارچ کو دو ارکان اسمبلی ملک رفیق کھر اور سلیمان تاثیر نے اسپیکر پنجاب اسمبلی میاں منظور وٹو کو ہٹانے کے لیے نوٹس دیا۔ اور ان پر الزام عائد کیا کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہے۔ اور وفاقی حکومت کے خلاف

میاں نواز شریف کی طرف سے کی جانے والی تمام سازشوں میں برابر کے شریک ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود پیپلز پارٹی اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی۔ کیونکہ 13 مارچ کو میاں نواز شریف اور میاں منظور احمد وٹو نے اسمبلی سے دوبارہ اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اعتماد کی قرارداد صوبائی وزیر قانون سردار نصراللہ خاں دریشک نے پیش کی۔ میاں نواز شریف کو 152 اور میاں منظور احمد وٹو کو 155 ووٹ ملے۔ میاں نواز شریف دسمبر 1988ء میں قائد ایوان منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت اُنہیں 147 ووٹ ملے تھے۔ یعنی اُنہوں نے ماضی کے مقابلے میں چار ووٹ زیادہ حاصل کیے بالفاظ دیگر وفاقی حکومت عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعے میاں نواز شریف کی حکومت کو ختم کرنے میں ناکام ہو گئی۔

O

تحریک عدم اعتماد کی ناکامی سے وفاقی حکومت کو کئی طرح کا نقصان ہوا۔ ایک تو اُس کی ساکھ متاثر ہوئی۔ دوسرا میاں نواز شریف کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ تیسرا آئی جے آئی نے اس کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد پیش کرنے کے لیے گراؤنڈ ورک کرنا شروع کر دیا۔ اور پنجاب اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے پارلیمانی گروپ کو کمزور کرنے کے لیے ایسی حکمتِ عملی تیار کی کہ دوبارہ پنجاب حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش نہ کی جا سکے۔ اس مقصد کے لیے پیپلز پارٹی کے جن ارکان کو توڑا گیا ان میں منظور احمد موہل، شاہد مرزا، ملک قادر بخش وارن اور مخدوم علی رضا شامل ہیں۔ مخدوم علی رضا کو پنجاب کابینہ میں بھی شامل کیا گیا۔ جب کہ متعدد ارکان اسمبلی نے اندرون خانہ پنجاب حکومت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اور اس کے بدلے وہ اپنے سیاسی و مالی مفادات حاصل کرتے رہے۔ اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے بعد میاں نواز شریف نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے کوشش شروع کی۔ انہوں نے کئی بار کراچی اور پشاور کے خفیہ دورے کیے جس کا مقصد عوامی نیشنل پارٹی اور ایم کیو ایم کو پیپلز پارٹی سے توڑنا تھا۔ اور آئی جے آئی کے لیے ان کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے خفیہ طور پر پیپلز پارٹی کے ارکان قومی اسمبلی سے رابطے کیے۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے، پیپلز پارٹی نے اُن پر ایک اور وار کیا اور 12 جولائی 1989ء کو ان کے معاون خصوصی چوہدری نثار احمد ڈھلوں اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اور انہوں نے آئی جے آئی کے فارورڈ بلاک میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ اس

دھچکے کے باوجود میاں نواز شریف، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی، آصف وردگ، میاں شہباز شریف، مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی اور آئی جے آئی کے دوسرے مقتدر رہنمائس نے وفاقی حکومت کے خلاف اپنی زیرِ زمین سرگمیاں جاری رکھیں۔ ان کی بھرپور کوششوں کے نتیجے میں 4 جون 1989ء کو بے نظیر بھٹو جب امریکہ کے دوسرے پر تھیں قومی اسمبلی میں اپوزیشن پارٹیوں نے اتحاد قائم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور کوٹ ادو سے ضمنی انتخاب میں منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے رکن مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی کو اس کا قائد منتخب کیا گیا۔ اس اتحاد کا قیام بے نظیر بھٹو کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ کیونکہ اس میں جمعیت علماء اسلام، پاکستان جمہوری پارٹی، جمعیت علماء پاکستان، عوامی نیشنل پارٹی اور دیگر آئی جے آئی سیاہر پارلیمانی پارٹیاں شامل تھیں اور ایم کیو ایم کے ارکان نے بھی متحدہ اپوزیشن کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ سرحد میں مخلوط حکومت کے قیام کے وقت عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کے مابین ہونے والا معاہدہ اے این پی کا گورنر مقرر نہ ہونے کی وجہ سے 27 اپریل 1989ء کو ختم ہو گیا اور اے این پی کے وزراء نے استعفے دیدیئے۔ اسی طرح کراچی اور حیدر آباد میں ایم کیو ایم کے ارکان اسمبلی اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین و دیگر رہنماؤں کے گھروں پر 29 اپریل کو فائرنگ اور انہیں ہراساں کرنے کے واقعات کے بعد سندھ حکومت میں شامل ایم کیو ایم کے وزراء بھی 2 مئی 1989ء کو مستعفی ہو گئے۔ بیگم عابدہ حسین نے بھی متحدہ اپوزیشن میں شمولیت اختیار کر لی۔ 15 جون 1989ء کو عوامی نیشنل پارٹی اور آئی جے آئی کے درمیان باہمی تعاون کا باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ اور اسکی توثیق مسلم لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ نے کی۔ آئی جے آئی اور ایم کیو ایم کے درمیان ہونے والے 17 نکاتی معاہدے کا باقاعدہ اعلان 23 اکتوبر 1989ء کو کیا گیا۔ قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم کے قائد اور ڈپٹی قائد ڈاکٹر عمران فاروق اور امین الحق نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ ''پیپلز پارٹی نے معاہدے کی کسی شق پر عمل نہیں کیا۔ سندھ میں غیر سندھیوں کی زندگی غیر محفوظ ہے۔ ایم کیو ایم کے ارکان اسمبلی کو تشدد کا نشانہ بنانے کے علاوہ وفاقی حکومت نے شکست خوردہ افراد کو مشیر مقرر کیا ہے۔'' متحدہ اپوزیشن بننے سے قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے مخالف ارکان کی تعداد 94 ہو گئی۔

بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک:

23 اکتوبر کو متحدہ اپوزیشن کے 186 ارکان کے دستخطوں پر مشتمل وزیر اعظم کیخلاف تحریکِ عدم اعتماد کا نوٹس قومی اسمبلی کے اسپیکر کے حوالے کیا گیا۔ اور فاٹا کے آزاد ارکانِ اسمبلی نے بھی اسکی حمایت کا اعلان کیا۔ تحریکِ عدم اعتماد کے منصوبے کو اس قدر خفیہ رکھا گیا کہ جب یہ اچانک پیش کی گئی تو پیپلز پارٹی کی قیادت حیران ہو گئی۔ کیونکہ اس وقت اس کے وزراء اور مشیر جہانیاں میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں پارٹی کے امیدوار کی مہم میں مصروف تھے جب کہ کچھ وزراء کراچی اور لاہور کے دوروں پر تھے۔ انہیں فوراً دارالحکومت میں طلب کیا گیا۔ بعض کو خصوصی طیارے بھیج کر بلایا گیا۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے الزام عائد کیا کہ ''ہمارے ساتھیوں کی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لیے اُنہیں 50 سے 60 لاکھ روپے کی پیشکش کی گئی ہے۔'' تاہم ان کی سیاسی ساکھ کو اُس وقت دھچکا پہنچا جب 25 اکتوبر 1989ء کو محنت و افرادی قوت کے وزیر مملکت طارق گمسی نے وفاقی کابینہ سے مستعفی ہو کر تحریک عدم اعتماد کی حمایت کا اعلان کیا۔ بے نظیر بھٹو نے اُنہیں برطرف کرنے کے علاوہ ان پر الزام عائد کیا کہ طارق گمسی نے مکمل وفاقی وزیر کا عہدہ کے لیے دو کروڑ روپے نقد اور ایک پجارو جیپ طلب کی تھی۔ مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپوزیشن کے پاس چلے گئے۔ اس کے برعکس طارق گمسی نے الزامات کی تردید کی اور کہا کہ بے نظیر بھٹو حکومت چلانے اور صوبوں سے بہتر تعلقات قائم کرنے میں ناکام ہو گئی۔ متحدہ اپوزیشن نے عدم اعتماد کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مخلوط حکومت تشکیل دینے کا اعلان کیا۔ اور مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی کو وزارتِ عظمٰی کے عہدے کے لیے نامزد کیا گیا۔ 26 اکتوبر کو متحدہ اپوزیشن کے 99 ارکان نے عدم اعتماد کی تحریک کی تائید کی۔ 27 اکتوبر کو پارلیمانی امور کے وفاقی وزیر طارق رحیم نے ایم کیو ایم کے پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی قائد عظیم طارق اور دیگر قائدین سے ملاقات کی۔ اور تقریباً 5 گھنٹے تک ان سے طویل مذاکرات کئے مگر وہ لاحاصل ثابت ہوئے۔ ایم کیو ایم نے آئی جے آئی کے ساتھ اپنا معاہدہ توڑنے سے انکار کر دیا جس کے بعد پیپلز پارٹی کو اپنی حکومت بچانے کی فکر ہوئی۔ اس نے اپنے حامی ارکان اسمبلی کو آئی جے آئی کے رہنماؤں سے دور رکھنے کے لیے سی 130 طیارے کے ذریعے سوات پہنچا دیا۔ جب کہ آئی جے آئی نے اپنے حامی 109 ارکان کو بلوچستان ہاؤس اسلام آباد سے مری منتقل کر دیا۔ اور ان کی

کڑی نگرانی کی گئی۔ یہ اقدام اراکین اسمبلی کے وقار کے منافی تھا۔ پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی کی طرف سے ایک دوسرے کے ارکان کو حبسِ بے جا میں رکھنے کا الزام عائد کیا گیا۔ غلام مصطفےٰ جتوئی نے الزام عائد کیا کہ وفاقی حکومت سیاسی مقاصد اور ارکانِ اسمبلی کو لانے اور لے جانے کے لیے ایئر فورس کے طیارے، ہیلی کاپٹر اور پی آئی اے کے طیارے استعمال کر رہی ہے۔ اُنہوں نے مزید الزام عائد کیا کہ متحدہ اپوزیشن کے ارکان رئیس شبیر اور ہمایوں سیف اللہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے صدر مملکت سے اپیل کی کہ وہ عدم اعتماد کی تحریک پر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کو یقینی بنائیں۔ صدر نے اُنہیں اس امر کی یقین دہائی کرائی۔ بری فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے کہا کہ ''جسے اکثریت حاصل ہوگی وہ حکومت کرے گا۔ مارشل لاء کا کوئی جواز نہیں۔ ارکان اسمبلی کو حبسِ بے جا میں رکھنا غلط بات ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے پارلیمانی اور جمہوری روایات کے عین مطابق ہے۔'' امریکہ نے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ اور کہا کہ وہ ائی جے آئی اور پیپلز پارٹی کے درمیان عدم اعتماد کی جنگ میں غیر جانبدار رہے گا۔ بالفاظ دیگر امریکہ صدر مملکت اور چیف آف آرمی سٹاف گیارہ ماہ بعد اس نکتے پر متفق ہو گئے کہ اگر بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور جمہوریت کے لیے پیپلز پارٹی کا برسرِ اقتدار رہنا ضروری نہیں۔

عدم اعتماد کی تحریک پر رائے شماری کے لیے یکم نومبر کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس روز پیپلز پارٹی کے ارکان کو جہاز کے ذریعے منگورہ سے اسلام آباد سخت حفاظتی انتظام میں لایا گیا۔ جب کہ آئی جے آئی کے حامی ارکان اسمبلی کو مری سے چار کوچوں میں پنجاب پولیس کی زیرِ نگرانی لایا گیا۔ ہر کوچ کے ساتھ پنجاب پولیس کے چار کمانڈوز تھے ان کوچوں کے ہمراہ ایک پانچویں کوچ بھی تھی۔ جو پولیس کمانڈوز سے بھری ہوئی تھی۔ متحدہ اپوزیشن کو سو فیصد یقین تھا کہ اس کی تحریک کامیاب ہوگی۔ اور بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ مگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ 232 ارکان کے ایوان میں سے تحریکِ عدم اعتماد کے حق میں 107 ووٹ پڑے۔ اس طرح صرف 7 ووٹوں سے تحریک ناکام ہو گئی۔ اور بے نظیر کی حکومت کو ایک نئی زندگی ملی۔ پیپلز پارٹی کے رکن اسمبلی خورشید عالم چیمہ جو مری سے آئی جے آئی کے ارکان کے ساتھ اسلام آباد آئے تھے۔ ایوان میں داخل ہوتے ہی پیپلز پارٹی کی مخصوص نشستوں پر جا بیٹھے اور آئی جے آئی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان، پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی مسٹر ممتاز احمد تارڑ،

ملک مختیار احمد اعوان، مہر رشید، عارف خان حسن اور سردار ایوب الائی غیر حاضر رہے اور ووٹ نہ ڈالا۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے دو ارکان سید قربانی علی شاہ اور رانا چندر سنگھ نے پیپلز پارٹی کے خلاف ووٹ دیا۔ سرکاری بنچوں پر ارکان اسمبلی کی تعداد 124 بیان کی گئی۔ عدم اعتماد کی ناکامی کا بنیادی سبب آئی جے آئی کے چار ارکان رئیس شبیر احمد، مخدوم احمد انور عالم، میاں غلام احمد مانیکا اور چوہدری انور عزیز تھے۔ جنہوں نے عین وقت پر متحدہ اپوزیشن کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کی بے وفائی سے پہلے بقول میاں نواز شریف متحدہ اپوزیشن کو 119 ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے جانے کے بعد پیپلز پارٹی کے ارکان جو عدم اعتماد کی تحریک کی حمایت پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے ارادے بدل لئے اور آئی جے آئی کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں متحدہ اپوزیشن کے حامیوں کی تعداد 119 سے کم ہو کر 107 رہ گئی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان چاروں ارکان نے عدم اعتماد کے نوٹس پر دستخط کئے۔ اور ایوان میں اسکی تائید کی۔ مگر اچانک اُنہوں نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ جس کی وجہ سے متحدہ اپوزیشن اپنا مقصد پورا نہ کر سکی۔ تحریکِ عدم اعتماد کی ناکامی کا پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں نواز شریف کو بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے وفاداریاں تبدیل کرنے والے چاروں ارکان کے حلقوں کے بار بار دورے کئے۔ اور عوامی جلسوں سے خطاب کے دوران لوگوں پر زور دیا کہ وہ نہ صرف ان کا حقہ پانی بند کر دیں بلکہ ان کا سیاسی و معاشرتی بائیکاٹ بھی کریں اور ایسے بددیانت افراد کو آئندہ ووٹ نہ دیں۔ چنانچہ 1990ء کے عام انتخابات میں ان چاروں ارکان کے خلاف مضبوط امیدوار کھڑے کئے گئے۔ جس کے نتیجے میں مخدوم احمد عالم کے سوا کوئی بھی قومی اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہو سکا۔ ان ارکان نے پیپلز پارٹی کی حمایت کا فوری فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ سردار رئیس شبیر احمد اور غلام احمد مانیکا کا جون 1989ء سے پیپلز پارٹی کی قیادت سے رابطہ تھا۔ اور انہوں نے 30 جون کو وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ طویل ملاقات کی تھی۔ جس کا آئی جے آئی کی قیادت نے سنجیدگی سے نوٹس نہ لیا۔ کیونکہ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ مخدوم انور عالم، چوہدری انور عزیز، رئیس شبیر اور غلام احمد مانیکا رعین وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ جب کہ چوہدری انور عزیز جو جونیجو حکومت میں وفاقی وزیر بلدیات و دیہی ترقی تھے اور انہوں نے اپنے ایم این اے کے فنڈز سیالکوٹ کی ایک سوسائٹی کے نام خفیہ طور پر منتقل کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے اُن سے استعفیٰ لیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اپنی پارٹی کو دھوکہ دے گئے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد متحدہ اپوزیشن نے الزام لگایا کہ رائے شماری کے وقت

22 ارکانِ اسمبلی کو وزیر اعظم کے چیمبر میں بلایا گیا اور پھر اُنہیں واپس نہیں آنے دیا گیا۔ اور اس طریقے سے عدم اعتماد کی تحریک کو ناکام بنایا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے 23 نومبر 1989ء کو کراچی میں اخبار نویسوں کو بتایا کہ اگر تحریک عدم اعتماد کامیاب ہو جاتی تو انہیں اور پیپلز پارٹی کے 100 لیڈروں کو گرفتار کر لیا جاتا۔ کیونکہ حکومت پنجاب نے راولپنڈی میں ہزاروں پولیس والے جمع کر رکھے تھے۔ پارلیمنٹ کو توڑنے اور سندھ میں پیپلز پارٹی کو ختم کرنے کا باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا۔

تحریک عدمِ اعتماد کی ناکامی کے بعد بے نظیر بھٹو نے آئی جے آئی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی۔ اور مخلوط حکومت کی آڑ میں آئی جے آئی کے ارکانِ قومی اسمبلی کو توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ صدر اور بری افواج کے ساتھ ملاقات کر کے مخلوط حکومت کے بارے میں ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے، وسطی مدت کے انتخابات کروانے، مشترک مفادات کی کونسل اور نیشنل فنانس کمیشن کے اجلاس بلانے کے لیے اپنے منصوبے سے اُنہیں آگاہ کیا۔ جنرل مرزا اسلم بیگ نے 7 نومبر 1989ء کو بے نظیر بھٹو کے اقدام کو سراہتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ ''وسیع البنیاد حکومت کے قیام کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ میں نے گیارہ ماہ پہلے یہ تجویز پیش کی تھی مگر حکومت اب اس کے لیے کوشش کر رہی ہے۔'' صدر اور چیف آف آرمی سٹاف کی طرف سے پیش کی گئی مخلوط حکومت کی تجویز کا مطلب یہ تھا کہ آئی جے آئی اور متحدہ اپوزیشن کو مرکزی حکومت میں شامل کیا جائے، تاکہ مرکز اور صوبوں کے درمیان محاذ آرائی اور ملک سے تصادم کی فضا کا خاتمہ ہو۔

20 مارچ کو 1990ء کو سیالکوٹ سے آئی جے آئی کے رکن قومی اسمبلی انوار الحق چوہدری نے وفاقی حکومت کی حمایت کا اعلان کیا۔ جس کے بدلے میں انہیں وزیر اعظم کا معاون خصوصی مقرر کیا گیا۔ اسی طرح پیپلز پارٹی وزیر اعلیٰ کے معاون خصوصی اقبال نکا کو بھی توڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ کافی عرصہ تک وہ خفیہ طور پر ملک غلام مصطفیٰ کھر کو وزیر اعلیٰ کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کے علاوہ آئی جے آئی کے دوسرے ارکان قومی وصوبائی اسمبلی کو وفاقی حکومت کی حمایت کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب میاں نواز شریف کو اقبال نکا کی اپنے خلاف سرگرمیوں کو علم ہوا تو اُنہوں اُسے برطرف کر دیا۔ اور الزام لگایا کہ اُس نے وزیر اعلیٰ کے جعلی دستخطوں سے تیس افراد کو ملازمتیں دلوانے کی کوشش کی تھی۔ برطرفی کے بعد اقبال نکا کھل کر سامنے آ گئے۔ اور اُنہوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ مزید براں یہ کہ جون 1990 کے

بجٹ سیشن کے دوران سرحد میں آئی جے آئی کے پارلیمانی لیڈر سلیم سیف اللہ نے اپنی والدہ کلثوم سیف اللہ اور بھائی انور سیف اللہ کے ہمراہ وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ اور اُنہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جس سے سرحد اسمبلی میں آئی جے آئی انتشار کا شکار ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں آفتاب شیر پاؤ کی حکومت مستحکم ہوگئی۔ اسی طرح چوہدری انور عزیز، رئیس شبیر احمد، غلام مصطفیٰ باجوہ اور سیف اللہ خاندان کے حامی ارکان نے قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کا حامی گروپ قائم کر لیا۔ علاوہ ازیں آزاد کشمیر کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کو مسلم کانفرنس کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور 29 جون 1990ء کو وزیر اعظم کے عہدے کے لیے منعقدہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار مسٹر ممتاز راٹھور کو مسلم کانفرنس کے اُمیدوار سردار سکندر حیات کے مقابلے میں 14 ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی ہوئی۔ اور آزاد کشمیر میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اگرچہ جنوری سے لے کر جولائی 1990ء تک پیپلز پارٹی مسلسل کامیابیاں حاصل ہوئیں اور قومی اسمبلی میں اس کے حامی ارکان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ تاہم اسے اس کے لیے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی اور بے نظیر بھٹو کو اپنے اصولوں اور پارٹی کے منشور سے بھی انحراف کرنا پڑا۔

اپوزیشن کا دباؤ:

9 جنوری 1990ء کو وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کہا کہ اگر اپوزیشن چاہے تو مڈ ٹرم الیکشن کروائے جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے پارٹی لیڈروں کو انتخابات کی تیاری کا حکم دیا اور بتایا کہ فوج نے انتخابات کے دوران امن وامان کو بحال رکھنے میں تعاون کرنے کا یقین دلایا ہے اسی روز اپوزیشن کے مرکزی قائدین نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے منفی رویہ کے خلاف اسلام آباد میں احتجاجی مظاہرہ کیا اور وہ 15 منٹ تک دھرنا مار کر بیٹھے رہے۔ احتجاج کرنے والوں میں غلام مصطفیٰ جتوئی، نوابزادہ نصر اللہ خاں، چوہدری شجاعت حسین، خان عبدالولی خان، عمر فاروق اور مولانا عبدالستار خان نیازی شامل تھے۔ 26 جنوری کو متحدہ اپوزیشن نے کراچی میں ایم کیو ایم کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے بہت بڑے جلسہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اس جلسے میں تقریباً 60 ہزار افراد نے شرکت کی۔ اور مقررین میں نواز شریف، نوابزادہ نصر اللہ خان، عبدالولی خان، بیگم عابدہ حسین اور الطاف حسین شامل تھے۔ 5 فروری کو متحدہ اپوزیشن کی اپیل پر کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی کا دن منایا

گیا اور ملک بھر میں تعطیل کی گئی کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی کا دن منانے کا اعلان میاں نواز شریف نے کیا تھا۔ 8 فروری کو اپوزیشن کے مطالبہ پر وفاقی حکومت نے کشمیر کونسل قائم کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت اور اپوزیشن کے ارکان اسمبلی کو اس میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاہم اس کونسل کا اجلاس بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں کبھی نہ ہوا۔ کیونکہ حکومت نے اس میں اپوزیشن کے مطالبے کے باوجود دلچسپی نہ لی۔ آئی جے آئی اور متحدہ اپوزیشن نے مطالبہ کیا کہ بے نظیر بھٹو کو 20 مارچ 1990ء سے قبل قومی اسمبلی سے دوبارہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا چاہئے۔ انہوں نے صدر مملکت پر بھی زور دیا کہ وہ وزیر اعظم کو اعتماد کا ووٹ لینے پر مجبور کریں۔ آئین کے آرٹیکل 91 (2۔ الف) کے تحت ضروری ہے کہ وزیر اعظم اعتماد کا ووٹ حاصل کریں۔ کیونکہ 20 مارچ 1990ء کے بعد صدر وزیر اعظم کو نامزد نہیں کر سکیں گے۔ اپوزیشن کی مہم کے باوجود 20 مارچ گزر گیا نہ تو بے نظیر بھٹو نے اس روز قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اور نہ ہی صدر نے انہیں مجبور کیا تاہم متحدہ اپوزیشن نے اس روز قومی اسمبلی اور سینٹ کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ اور کہا کہ بے نظیر بھٹو کا وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر برقرار رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ اپوزیشن نے پارلیمانی امور کے وزیر مملکت ڈاکٹر شیر افگن کا بھی سماجی بائیکاٹ کیا۔ کیونکہ انہوں نے اپوزیشن کی رہنما بیگم عابدہ حسین کے خلاف غلط زبان استعمال کی تھی۔ اسی طرح سندھ میں بدامنی کے واقعات پر بھی اپوزیشن نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ جون اور جولائی کے مہینے میں وفاقی حکومت پر اس قدر دباؤ بڑھ گیا کہ وہ ڈگمگانے لگی۔

بے نظیر بھٹو کے دور میں مختلف نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات کی وجہ سے بھی مرکز اور پنجاب کے درمیان محاذ آرائی میں اضافہ ہوا۔ دونوں حکومتوں نے انتخابی مہم کے دوران ایک دوسرے کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا اور اس مقصد کے لیے ڈس انفارمیشن سیل قائم کیے۔ اپنے اپنے امیدواروں کو جتوانے کے لیے ان کی انتخابی مہم پر کروڑوں روپے خرچ کرنے کے علاوہ دیگر تمام سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع اور وسائل استعمال کیے ضمنی انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی مہم وفاقی وزراء اور آئی جے آئی کے امیدواروں کی مہم صوبائی وزراء نے چلائی اور جس پارٹی کا امیدوار ضمنی انتخابات میں کامیاب ہوا۔ اس نے یہ تاثر دیا کہ اس کی مقبولیت مخالف پارٹی کے مقابلے میں بڑھ گئی ہے۔ 1989ء اور 1990ء کے درمیان مجموعی طور پر قومی اسمبلی کے 18 اور صوبائی اسمبلی کے 11 ضمنی انتخابات ہوئے۔ قومی اسمبلی کے 18 ضمنی انتخابات میں

پیپلز پارٹی نے بالترتیب 17 اور آئی جے آئی نے 8 نشستیں حاصل کیں جب کہ ایم کیو ایم اور عوامی نیشنل پارٹی نے ایک ایک نشست حاصل کی۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت نے بھارت سے قریبی تعلقات کے قیام کو بہت زیادہ اہمیت دی اور بھارت سے والہانہ جذبات کا اظہار کیا۔ اسی طرح بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی غیر معمولی گرمجوشی ظاہر کی اور پیپلز پارٹی کی حکومت میں گہری دلچسپی لی۔ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے پہلے آٹھ ماہ کے دوران دو مرتبہ پاکستان کے دورے پر آئے۔ جبکہ جنرل ضیاء کے گیارہ سالہ دور حکومت میں انہوں نے ایک مرتبہ بھی پاکستان کا دورہ نہ کیا۔ بلکہ جنرل ضیاء خود دو مرتبہ بھارت کے دورے پر گئے۔ بے نظیر بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی جنرل ضیاء کی طرف سے بھارت کو پیش کی گئی "عدم جارحیت کے معاہدے" کی تجویز واپس لے لی۔ اور اُسے ناقابلِ عمل قرار دیا۔ کیونکہ بھارت اسے قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی پہلی مرتبہ پاکستان کے دورے پر 29 دسمبر 1988ء کو سارک کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے۔ اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے اُن کے اعزاز میں خاموش عشائیہ دیا جس میں صرف ان کی بیگم سونیا گاندھی اور بے نظیر کے شوہر آصف زرداری نے شرکت کی۔ دونوں لیڈروں نے باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کے علاوہ بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے مابین باقاعدہ مذاکرات بھی ہوئے۔ جن میں دونوں ممالک کے اعلیٰ حکام نے شرکت کی۔ اور ان مذاکرات کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا اور دونوں ممالک فوجوں اور اسلحہ کی تعداد کم کرنے پر رضامند ہونے کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کو بند کرنے پر آمادہ ہوئے۔ بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے درمیان تنہائی میں نصف گھنٹہ تک بات چیت ہوئی۔ جس کی تفصیلات منظر عام پر نہ آسکیں اور انہیں مخفی رکھا گیا اپوزیشن نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ اور الزام لگایا گیا کہ مذاکرات کے دوران مسئلہ کشمیر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ راجیو گاندھی کے قیام کے دوران اسلام آباد میں کشمیر ہاؤس کے باہر لگا ہوا بورڈ ہٹا دیا گیا۔ اور ٹیلی ویژن پر کشمیر کے موسم کا حال نشر کرنا بند کر دیا گیا۔ بھارتی رہنماؤں نے اپنے ہم خیال سیاستدانوں کو بے نظیر بھٹو سے تعاون کرنے کی درخواست کی وہ عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان سے خصوصی طور پر ملے۔ اور ان پر زور دیا کہ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ جب راجیو گاندھی پاکستان سے واپس

لوٹنے لگے تو وہ بہت خوش تھے جیسے وہ کچھ حاصل کر کے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد بھارتی ذرائع ابلاغ نے بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کی حکومت کی حمایت شروع کر دی۔

بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی اپنی بیگم سونیا گاندھی کے ہمراہ 16 جولائی 1989ء کو دوسری مرتبہ پاکستان کے دوروزہ دورہ پر آئے اور باقاعدہ مذاکرات کے دوران بے نظیر بھٹو نے تخفیف اسلحہ کی تجویز پیش کی جسے راجیو نے مسترد کر دیا۔ مذاکرات میں دونوں ممالک نے ایٹمی پروگرام سیاچن گلیشئر فوجوں اور اسلحہ کی تخفیف، اقتصادی اور ثقافتی شعبوں میں باہمی تعاون بڑھانے کے طریقوں پر غور کیا گیا۔ 17 جولائی کو بھارتی وزیراعظم نے پاکستانی وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ اسلام آباد میں مشترک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''کشمیر میں رائے شماری نہیں ہو سکتی۔ سیاچن گلیشئر اور کشمیر پیچیدہ مسائل ہیں۔ ان کا فوری حل ممکن نہیں۔ شملہ معاہدے میں کشمیر کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اور اس نے تمام سمجھوتوں کی جگہ لے لی ہے۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر بھارت کو اس لیے تشویش ہے کہ وہ فوج کے کنٹرول میں ہے اور بھارت باہمی معاہدے کے ذریعے جنوبی ایشیا میں ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کے مسئلے پر یقین نہیں رکھتا۔''

بھارتی وزیر خارجہ مسٹر وی پی نرسیما راؤ نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کا ملک آئندہ کسی ملک میں فوج نہ اتارنے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ پاکستان شملہ معاہدے کے تحت کشمیر سمیت کسی باہمی تنازعہ کو اقوام متحدہ یا کسی دوسرے عالمی فورم پر نہیں لے جا سکتا۔ اور شملہ معاہدے کی بھارتی توضیح درست ہے۔'' پاکستان سے واپسی پر راجیو گاندھی نے بے نظیر بھٹو سے تنہائی میں ملاقات کی جس کی تفصیلات خفیہ رکھی گئیں۔ بعد ازاں عالمی اخبارات میں چھپنے والی رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ راجیو گاندھی بے نظیر بھٹو کو افغان مسئلہ پر سوویت یونین کے مؤقف سے آگاہ کرنے اور بے نظیر بھٹو کو سوویت رہنما گورباچوف کا خصوصی پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان آئے تھے اور واپسی پر وہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے پیغام لے کر گئے کہ افغان مسئلہ کے حل کے لیے ڈاکٹر نجیب کی سبکدوشی ضروری ہے۔ پاکستان کے دورے کے بعد راجیو گاندھی فوراً سوویت یونین گئے اور گورباچوف کو بے نظیر کے مؤقف سے آگاہ کیا مختصر یہ کہ جب تک راجیو گاندھی برسراقتدار رہے تو پاکستان کے ساتھ بھارت کے تعلقات خوشگوار رہے۔

O

اقتدار سنبھالنے کے بعد بے نظیر بھٹو حکومتی معاملات میں اس قدر منہمک ہو گئیں کہ انہوں نے اپنے پارٹی کے ارکانِ اسمبلی کو ملنا چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے ان کا پارٹی کے ارکان کے ساتھ رابطہ کم پڑ گیا۔ مزید براں یہ کہ وفاقی وزراء نے بھی اپنی پارٹی کے ارکان کو لفٹ کرانی چھوڑ دی اور ان کی سفارشوں کو نظر انداز کیا جسے ارکانِ اسمبلی نے شدت سے محسوس کیا اور انہوں نے اپنے وزراء کے خلاف بیانات دینے شروع کر دیئے۔ 30 مارچ 1989ء کو اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کے 27 ارکان اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ جس میں وفاقی وزراء کے رویہ پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ شرکاء نے شکوہ کیا کہ متعدد کوششوں کے باوجود وہ وزیراعظم سے ملاقات کا وقت حاصل نہیں کر سکے۔ وفاقی وزراء ان کے کاموں پر توجہ نہیں دیتے جبکہ وہ پنجاب میں آئی جے آئی کے ارکانِ اسمبلی کے مقابلے میں لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ 2 ستمبر 1989ء کو قومی اسمبلی کے رکن مسٹر قربان علی نے کہا کہ سندھ پیپلز پارٹی کے 32 ارکان کو وزیراعظم سے اختلاف ہے اور تمام ارکان نے قومی اسمبلی میں اکٹھے بیٹھنے کی سپیکر سے اجازت طلب کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے ارکان میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان سے کسی بھی اہم مسئلہ پر رائے نہیں لی جاتی۔ خصوصاً پنجاب کے وزیراعلیٰ کو ہٹانے کا جو اہم فیصلہ کیا گیا اس میں ان سے پوچھا تک نہیں گیا اور پنجاب کے گورنر کے انتخاب میں غلطی کی گئی اور پارلیمانی پارٹی کے مشورے کے بغیر ایک غیر سیاسی شخص کو گورنر کے عہدے کے لیے نامزد کیا گیا جو اس عہدے کے لیے کسی طرح سے بھی موزوں نہ تھا۔

بے نظیر بھٹو کی طرف سے اپنی پارٹی کے اہم لیڈروں کو نظرانداز کرنے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 16 فروری 1990ء کو قومی اسمبلی کے سپیکر ملک معراج خالد نے انکشاف کیا کہ انہوں نے وزیراعظم کو مستعفی ہونے کی دھمکی دے کر اپنے حلقے کے لیے سوئی گیس کی منظوری حاصل کی۔ 12 مارچ کو پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اسلام آباد میں وزیراعظم سیکرٹریٹ کے باہر مظاہرہ کیا اور وفاقی وزراء جہانگیر بدر، احمد سعید اعوان، شیخ رفیق احمد اور مس ناہید کے خلاف نعرے لگائے۔ پارٹی کے اندر انتشار اور اختلافات اس قدر گہرے ہو گئے کہ 11 جون 1990ء کو پارلیمانی امور کے وزیر مملکت ڈاکٹر شیخ افگن نے ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ میں سپیکر قومی اسمبلی ملک معراج خالد کے خلاف آئینی درخواست دائر کی جبکہ 30 جون 1990ء کو راولپنڈی میں منعقد ہونے والے پیپلز پارٹی کے ڈویژنل کنونشن میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس

میں پارٹی کے ارکان قومی اسمبلی پر زور دیا گیا کہ وہ حکومت کو بلیک میل کرنا چھوڑ دیں۔ کنونشن کے شرکاء نے وفاقی وزراء اور وزیراعظم کے خصوصی معاونین پر سخت تنقید کی بعدازاں وفاقی وزراء اور پیپلز پارٹی کے ارکان قومی اسمبلی کے درمیان چپقلش اس قدر بڑھ گئی کہ 3 جولائی 1990ء کو پیپلز پارٹی کے 45 ارکانِ اسمبلی نے وفاقی وزراء کی تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا اور الزام لگایا کہ وفاقی وزراء لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے نہ تو ارکانِ اسمبلی سے ملتے ہیں اور نہ ہی عوامی مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔

صدر اسحٰق پارٹی بن گئے

پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بے نظیر بھٹو نے برسراقتدار آتے ہی صدر غلام اسحٰق خان سے قریب تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں ان کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ ابتداء میں صدر نے بھی پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے گرمجوشی کا اظہار کیا۔ اور وزیراعظم سے خوشگوار انداز میں ملتے رہے کیونکہ اس وقت ان کے اور وزیراعظم کے درمیان اختیارات کی تقسیم و استعمال کا مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ باہمی اعتماد بحال کرنے کا مسئلہ تھا اس لیے دونوں طرف سے یہ کوشش کی گئی کہ باہم اعتماد قائم ہو غلام اسحٰق نے اگرچہ آئی جے آئی کے امیدوار کے طور پر صدارتی انتخاب لڑا تھا۔ مگر پیپلز پارٹی نے بھی ان کی بھرپور حمایت کی تھی جس کی وجہ سے وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے اس لیے ان کے لیے ضروری تھا وہ آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی کے درمیان توازن برقرار رکھیں اور دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کریں۔ مگر بعدازاں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے مابین محاذ آرائی کی وجہ سے صدر کی حیثیت نازک ہو گئی۔ اور انہیں بڑے احتیاط سے چلنا پڑا۔ کیونکہ دونوں طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ وہ ایسی صورتحال سے دوچار ہو گئے کہ وہ نہ تو پیپلز پارٹی کی کھلم کھلا حمایت کر سکتے تھے اور نہ آئی جے آئی کی۔ وزیراعظم صدر کو وفاقی کے خلاف صوبوں کی کارروائیوں کے بارے میں شکایت کرتیں جبکہ وزراء اعلیٰ صدر کو وفاقی حکومت کی طرف سے صوبائی معاملات میں مداخلت سے آگاہ کرتے۔ یہ سلسلہ پیپلز پارٹی کے دور میں شروع سے آخر تک جاری رہا۔ ابتداء میں صدر نے پیپلز پارٹی کے کہنے پر جنرل (ر) ٹکا خاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ اور اس کے بدلے میں ٹکا خاں صدارتی انتخابات سے ان کے حق میں دستبردار ہوئے۔ مگر باقاعدہ صدر منتخب ہونے کے بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کو اپنی ذات سے کوئی فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ مثلاً بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت نے صدر پر زور دیا کہ وہ جنرل موسیٰ کو ہٹا کر یحییٰ بختیار کو بلوچستان کا گورنر

مقرر کریں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اس طرح پیپلز پارٹی نے سرحد میں اپنی سیاسی حلیف عوامی نیشنل پارٹی سے وعدہ کیا تھا کہ تین ماہ بعد وہاں پر اس کا گورنر مقرر کیا جائے گا مگر جب یہ تجویز صدر کے سامنے پیش کی گئی تو صدر نے سرحد کے گورنر بریگیڈیئر (ر) گلستان جنجوعہ کو ہٹا کر عوامی نیشنل پارٹی کا گورنر مقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ افغان مجاہدین اور آئی جے آئی نے اس کی سخت مخالفت کی تھی ابتداء میں صدر مرکز اور صوبوں کی محاذ آرائی پر خاموش رہے اور اس جھگڑے میں بظاہر مرکزی حکومت کی حمایت کرتے رہے اور متعدد بار پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف کو ہدایت کی کہ وہ نرم رویہ اختیار کریں اور مرکز کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کریں۔ 11 اپریل 1989ء کو پہلی مرتبہ انہوں نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کو ہدایت کی وہ مفاہمت کی فضا کو مکدر نہ ہونے دیں۔ میاں نواز شریف بذات خود ملنے کے علاوہ صدر کو بذریعہ خطوط بھی اپنے خاندان اور حکومت کے خلاف وفاقی حکومت کی کارروائیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نواب اکبر بگٹی بھی صدر کو وفاقی حکومت کے بارے میں اپنی شکایات سے آگاہ کرتے رہے۔ اور صدر ان کی شکایات کی روشنی میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو خطوط لکھتے رہے۔ وزیر اعظم بھی بذریعہ خطوط پنجاب اور بلوچستان کے بارے میں اپنی شکایات سے صدر کو آگاہ کرتی رہیں۔ اگست 1989ء تک بے نظیر بھٹو نے صدر اسحاق کو 90 خطوط لکھے۔ جبکہ صدر نے انہیں 50 خطوط لکھے اور انہوں نے وزیر اعظم کو اپنے خطوط میں بعض آئینی مشورے بھی دیئے۔ اور آئین کی دفعات کا حوالہ دے کر اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ جبکہ بے نظیر بھٹو نے اپنے خطوط میں زیادہ پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں سے متعلق شکایات بیان کیں۔ پیپلز پارٹی کے ابتدائی 9 ماہ کے دوران صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات خاص حلقوں تک محدود رہے۔ اور ان میں شدت پیدا نہ ہوئی۔ کیونکہ اس دوران ان کے مابین اختیارات کے استعمال کا ٹکراؤ پیدا نہ ہوا۔ اور دونوں اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کرتے رہے۔

سب سے پہلے جس مسئلہ پر صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اختیارات کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل افتخار احمد سروہی کی ریٹائرمنٹ تھی۔ جس پر صدر کا مؤقف تھا کہ ''انہیں جو مقرر کرتا ہے وہی ریٹائر کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ ان کے بقول آئین کے تحت انہیں جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو مقرر کرنے کا اختیار ہے اور وہی ان کو ریٹائر کر سکتے ہیں۔'' جبکہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو جو وزیر دفاع بھی تھیں ان کا مؤقف تھا کہ

''ایڈمرل سروہی کو ریٹائر کرنے کا اختیار وزارت دفاع کو ہے۔'' تاہم اس مسئلہ پر صدر اور وزیر اعظم کے درمیان اخبارات میں بحث ہوتی رہی اور آخر کار وزیر اعظم نے صدر کا مؤقف تسلیم کر لیا۔ اور سروہی ریٹائر نہ ہوئے مگر اس کے بعد صدر اور وزیر اعظم کے مابین ذہنی فاصلے اور شکوک وشبہات بڑھ گئے اور اُن کے درمیان اختیارات کی جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں نے ہر مسئلہ پر ایک دوسرے سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ 30 اگست 1989ء کو وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''صدر وزیر اعظم کے مشورے پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔'' جبکہ صدر نے اعلان کیا کہ ''وہ آئین کی نہ خود خلاف ورزی کریں گے اور کسی اور کو کرنے دیں گے۔'' وزیر اعظم کے مقابلے میں صدر کا پلہ اس لیے بھی بھاری تھا کہ انہیں مسلح افواج کے تینوں سربراہوں، پنجاب اور بلوچستان کے وزراء اعلیٰ، آئی جے آئی اور متحدہ اپوزیشن کی حمایت حاصل تھی۔ اس بات کو جاننے کے باوجود وزیر اعظم نے اُن کے ساتھ محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا۔

بے نظیر بھٹو اور اُن کی والدہ بیگم نصرت بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی مرتضیٰ بھٹو کو پاکستان واپس لانے کے لیے قانونی راستے تلاش کرنا شروع کر دیئے اس سلسلے میں انہوں نے قانونی ماہرین سے مشورے بھی کیے۔ جس کے بعد حتمی طور پر فیصلہ کیا گیا کہ مرتضیٰ بھٹو کو پاکستان لایا جائے اور ان کی گرفتاری کی صورت میں عدالت سے اُنہیں ضمانت پر رہا کرایا جائے۔ خود مرتضیٰ بھٹو نے 3 ستمبر 1989ء کو پاکستان واپس آنے کا اعلان کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ پاکستان آتے صدر مملکت غلام اسحٰق خان نے 4 دسمبر کو دہشت گردی کے لیے خصوصی عدالتوں کے ایکٹ مجریہ 1975ء میں ترمیم کی اس ترمیم کے تحت دہشت گردی میں ملوث افراد کی ضمانت لینے کا اختیار خصوصی اور دیگر عدالتوں سے واپس لے لیا گیا۔ یعنی انہیں ایسے افراد کی ضمانت لینے سے روک دیا گیا۔ اس آرڈیننس سے جہاں دہشت گردی میں ملوث دوسرے افراد متاثر ہوئے وہاں مرتضیٰ بھٹو بھی متاثر ہوئے۔ جن پر دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرتضیٰ بھٹو نے پاکستان آنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ 10 ستمبر کو صدر نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو سیاسی مسائل کے حل کے لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کا مشورہ دیا جسے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے محسوس کیا۔ ایک اور مسئلہ جس پر صدر اور وزیر اعظم کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا۔ وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی تقرری تھی۔ دسمبر 1989ء میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس محمد حلیم اور تین جج جسٹس ایس اے نصرت، جسٹس اسلم ریاض

حسین اور جسٹس جاوید اقبال ریٹائر ہوئے۔ چیف جسٹس کی ریٹائرمنٹ سے پانچ ماہ قبل وزیر اعظم نے صدر سے نئے چیف جسٹس کی تقرری کے لیے مشورہ لیا۔ اور اپنی طرف سے تین ججوں جسٹس محمد افضل ظلہ، جسٹس عبدالقادر اور جسٹس عبدالسلام کے نام پیش کیے۔ صدر جسٹس محمد افضل ظلہ کے حق میں تھے جبکہ وزیر اعظم چیف جسٹس کے عہدے کے لیے ان کی تقرری کے خلاف تھیں۔ ان کا مؤقف تھا کہ آئین کی آرٹیکل 48 کے تحت صدر کابینہ اور وزیر اعظم کے مشورے پر عملدرآمد کرنے کے پابند ہیں۔ جبکہ صدر کا مؤقف تھا کہ وہ آئین کے تحت چیف جسٹس آف پاکستان کو مقرر کرنے کے مجاز ہیں۔ اور ان کے مشورے سے دیگر ججوں کی تقرری کا انہیں اختیار حاصل ہے۔ 22 اکتوبر 1989ء کو وفاقی وزیر قانون سید افتخار گیلانی نے کہا کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کے لیے صدر کو صوابدیدی اختیارات حاصل نہیں۔ اس بحث کو ختم کرنے کے لیے صدر اسحٰق خان نے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کے مسئلہ پر سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر 9 دسمبر کو صدر اور وزیر اعظم کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں اس نازک آئینی مسئلہ پر طویل بحث ہوئی اور آخر کار بے نظیر بھٹو نے اسحٰق خان کا مؤقف تسلیم کرلیا۔ اس تنازعہ کے حل ہوتے ہی نئے چیف الیکشن کمشنر کی تقرری کا مسئلہ پیدا ہوا۔ کیونکہ سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس ایس اے نصرت جو چیف الیکشن کمشنر بھی تھے وہ دسمبر 1989ء میں ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ جسٹس نعیم الدین کو قائم مقام چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا گیا۔ وزیر اعظم نے اس عہدے کے لیے جسٹس قادر بخش شیخ کا نام پیش کیا تھا مگر صدر نے اس سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ جسٹس نعیم الدین احمد کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بطور چیف الیکشن کمشنر کام کرتے رہیں گے اور تمام تر دباؤ کے باوجود انہوں نے چیف الیکشن کمشنر کو تبدیل نہ کیا۔ فروری 1990ء میں لاہور کے حلقہ 99 کے ضمنی انتخابات کے موقع پر صدر سے کہا گیا کہ وہ عوامی نمائندگی کے ایکٹ 1972ء میں ترمیم کر کے پولنگ میں شناختی کارڈ کی پابندی کو لازمی قرار دیں۔ مگر صدر نے یہ ترمیم کرنے سے انکار کر دیا اور مؤقف اختیار کیا کہ عوامی نمائندگی کا ترمیمی آرڈیننس مئی 1989ء میں جاری کیا گیا تھا اس کی مدت ستمبر 1989ء میں ختم ہوگئی۔ اور اسے مقررہ مدت کے اندر اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ حکومت اسے اسمبلی میں منظور نہیں کرا سکی۔ اس لیے اب اس آرڈیننس کو دوبارہ جاری کرنے کا مطلب اختیارات کو غلط استعمال کرنے کے مترادف ہوگا۔ اور یہ بھی درست نہیں کہ ہر بار آرڈیننس جاری کیا جائے۔ کیونکہ یہ عمل اسمبلی کے اختیارات سلب کرنے کے

مترادف ہے۔ اسی طرح صدر نے اپوزیشن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے وفاقی اور سندھ حکومتوں پر زور دیا کہ وہ سندھ کے مسئلہ پر تمام سیاسی جماعتوں کی کانفرنس بلائیں مگر اس تجویز سے اتفاق نہ کیا گیا بلکہ صرف سندھ کی 22 ہم خیال جماعتوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ صدر نے وفاقی حکومت پر زور دیا کہ وہ مشترک مفادات کی کونسل کا اجلاس بلاتاخیر طلب کرے کیونکہ صوبے اس کے لیے ایجنڈا حکومت کو بھیج چکے ہیں۔ مگر وفاقی حکومت نے اس تجویز کو بھی اہمیت نہ دی۔ صدر نے حیدرآباد میں قلعہ پکا آپریشن کی کھلم کھلا مذمت کی جسے پیپلز پارٹی کی قیادت نے اپنے خلاف بیان سمجھا اور اس کے جواب میں سینئر وفاقی وزیر بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ ایم کیو ایم نے ایوان صدر سے بیان جاری کروایا ہے۔ حیدرآباد میں پولیس آپریشن کامیاب رہا ہے۔ ایم کیو ایم میں بھارتی ایجنٹ ہیں جو دہشت گردی کی کارروائیاں کرتے ہیں۔ صدر نے 15 جون کو اسلام آباد میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے نصرت بھٹو کے بیان کی تردید کی اور کہا کہ دہشت گرد کسی ایک تنظیم یا گروپ میں نہیں بلکہ تمام جماعتوں میں موجود ہیں۔ دہشت گردوں کی بلاامتیاز بیخ کنی کرنی چاہئے۔'' صدر کا اشارہ واضح طور پر پیپلز پارٹی کی طرف تھا۔ انہوں نے 15 جون کو وزیر اعظم کو ایک خط لکھا اور ان پر زور دیا کہ ''وہ سندھ میں حالات جلد معمول پر لائیں، صوبے کے عوام کے مختلف طبقوں کے درمیان بڑھتی ہوئی نفرتوں کے باعث ملکی سلامتی کے لیے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ امن وامان قائم رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔'' صدر کی طرف سے یہ وزیر اعظم کو ایک وارننگ تھی۔ وزیر اعظم کی طرف سے ارکان کی نامزدگی کے بغیر قومی مالیاتی کمیشن کے قیام کی سمری جب صدر کو بھیجی گئی تو صدر نے اصرار کیا کہ کمیشن کے قیام کے لیے صوبوں کی طرف سے پرائیویٹ ارکان کی نامزدگی ضروری ہے اور وہ اس کے بغیر کمیشن کے قیام کا اعلان نہیں کر سکتے۔ وفاقی حکومت نے ارکان کو نامزد کرنے میں توقف اختیار اس لیے کیا کہ پنجاب حکومت نے اپنی طرف سے ڈاکٹر محبوب الحق کو کمیشن کا رکن نامزد کیا تھا جو اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ پنجاب حکومت نے جب ڈاکٹر محبوب الحق کے نام پر اصرار کیا تو وفاقی حکومت نے اپنی طرف سے وی اے جعفری کو قومی مالیاتی کمیشن میں شامل کرلیا اور کمیشن کے ارکان کی تعداد گیارہ سے بڑھا کر بارہ کر دی جس کی صوبوں نے مخالفت کی اور اس اختلاف کی وجہ سے کمیشن تشکیل نہ دیا جا سکا۔ جون 1990ء میں سندھ میں تعینات فوج نے جب دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے آئین کی دفعہ 245 کے تحت عدالتی اختیارات طلب کیے تو وزیر اعظم کے لیے پریشان کن صورتحال پیدا ہوگئی۔

کیونکہ وہ نہ تو فوج کو اختیارات دینا چاہتی تھیں اور نہ اسے ناراض کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے مشیروں اور کابینہ کے ارکان نے بھی فوج کو عدالتی اختیارات دینے کی مخالفت کی۔ جس کے بعد بے نظیر بھٹو نے ضابطہ فوج داری کی دفعہ 131-A میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسے ایک آرڈیننس کے ذریعے نافذ کرنے کے لیے صدر کو آرڈی ننس کا مسودہ بھیجا گیا۔ مگر صدر نے آرڈیننس جاری کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ ضابطہ فوج داری کی دفعہ 131-A میں ترمیم آرمی ایکٹ کی بعض دفعات سے متصادم ہوں گی۔ اس لیے اس ترمیم کے بعد آرمی ایکٹ میں بھی بعض ترامیم کرنا لازم ہوں گی۔ انہوں نے وزیراعظم کو مشورہ دیا کہ وہ بل کی شکل میں مجوزہ آرڈی ننس قومی اسمبلی میں پیش کریں۔ صدر نے یہ آرڈیننس اس لیے جاری نہیں کیا کہ فوج اور فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ آئین کی دفعہ 245 کے تحت اختیارات چاہتے تھے۔ اور وہ فوج کے اندر پائے جانے والی اضطراب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ مگر بے نظیر بھٹو نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ اور فوج سے محاذ آرائی شروع کردی جس کے نتیجے میں ان کی حکومت کو برطرف کرنا پڑا۔ بعد میں انہوں نے الزام عائد کیا کہ فوج کی ایماپر ان کی حکومت برطرف کردی گئی اور فوج کے ساتھ ان کے اختلافات صدر نے کروائے۔ 19 نومبر 1990ء کو خصوصی عدالت میں اپنے بیان کے دوران بے نظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ ''صدر اسحاق خاں اس لیے ان کے خلاف ہوئے کہ وزیراعظم کے طور پر انہوں نے صدر کے رشتہ داروں کو مطلوبہ مراعات نہ دیں۔ کیونکہ اگر ان کو مراعات دی جاتیں تو پھر سب کو وہ مراعات دینا پڑتیں وہ یہ روایت قائم نہیں کرنا چاہتی تھیں۔'' انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان کے 20 ماہ کے دوران بنکوں کے منافع میں 70 فیصد، ٹیکسوں کی وصولی میں 20 فیصد اور سرمایہ کاری میں چار گنا اضافہ ہوا۔ تیل کے ذخائر آٹھ دن سے بڑھ کر 42 دن کے ہوگئے۔ توازن ادائیگی 240 ملین ڈالر سے بڑھ کر 600 ملین ڈالر ہوگئے۔ سرکاری اخراجات میں تین ارب روپے کی کمی کی گئی۔ بیرون ملک پاکستانیوں کی طرف سے بھیجی جانے والی رقوم میں بھی اضافہ ہوا۔ مگر اس کے باوجود ان کی حکومت برطرف کردی گئی۔

□ □ □

فوج کے ساتھ عارضی سمجھوتہ

چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو پیپلز پارٹی کے چیئر مین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو وزارتِ عظمیٰ سے معزول کر کے قید کیا اور بعد ازاں 1979ء میں نواب محمد خان قصوری کو قتل کرنے کا حکم دینے کے الزام میں انہیں سزائے موت دی گئی۔ جنرل ضیاء نے اپنے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں پیپلز پارٹی اور اُس کی قیادت کو دبانے اور اسے ختم کرنے کے لیے تمام ممکنہ حربے استعمال کیے۔ اس دوران روج نے جنرل ضیاء کے ان اقدامات کی مخالفت نہ کی بلکہ اپنے چیف آف سٹاف کا پورا ساتھ دیا۔ جنرل ضیاء فوج کو اپنا حلقہ (constituency) کہتے تھے اور اقتدار چھوڑنے پر کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں فوج کے خلاف پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں پر ردِعمل کا پیدا ہونا فطری بات تھی ضیاء دور میں پیپلز پارٹی کے سینکڑوں رہنماؤں اور کارکنوں کو فوجی عدالتوں سے سزائیں دی گئیں بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی کے سینکڑوں رہنما بیرون ملک چلے گئے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو نے جنرل ضیاء کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ''الذوالفقار'' نامی تنظیم قائم کی۔ جس نے پاکستان کے اندر دہشت گردی پھیلانے، طیارے اغوا کرنے اور فوج کے خلاف سازش کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل وحربے استعمال کیے۔ ''الذوالفقار'' تنظیم اور پیپلز پارٹی کی منفی سرگرمیوں کا ٹارگٹ اگرچہ جنرل ضیاء کی ذات تھی۔ مگر چونکہ وہ فوج کے سربراہ تھے اس لیے اُن کے خلاف الذوالفقار کی کارروائی کو فوج کے خلاف سازش تصور کیا گیا۔ ضیاء دور میں پیپلز پارٹی کی قیادت نے بانگِ دہل فوج کو تنقید کا نشانہ بنایا اور پیپلز پارٹی کے جلسوں میں اکثر یہ نعرہ لگایا جاتا ''فوج کا جو یار ہے، وہ غدار ہے غدار ہے'' اس منفی رویہ نے فوج کے اندر پیپلز پارٹی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے۔

اس شکوک وشبہات کی فضاء میں پیپلز پارٹی دسمبر 1988ء میں برسر اقتدار آئی۔ اقتدار منتقل کرنے سے قبل اس کی قیادت سے دفاعی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی یقین دہانی حاصل کی گئی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ 1988ء کے عام انتخابات کے بعد فوج پیپلز پارٹی کو اقتدار منتقل کرنے کی مخالف تھی۔ اگرچہ عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے سادہ اکثریت حاصل کی اور آئین کے تحت صدر مملکت کسی بھی رکن قومی اسمبلی کو وزیراعظم نامزد کر سکتے تھے مگر فوج بیوروکریسی اور صاحب الرائے افراد کی اکثریت نے جمہوری عمل کو آگے بڑھانے کے لیے پیپلز پارٹی کو اقتدار منتقل کرنے کی حمایت کی اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ عوام کی رائے کا احترام کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کو ایک اور موقع فراہم کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا ماضی کا رویہ تبدیل ہوا ہے یا نہیں۔ اقتدار کے انتقال سے قبل پیپلز پارٹی کی شریک چیئر مین بے نظیر بھٹو کو جی ایچ کیو میں اعلیٰ افسران نے بریفنگ دی جس میں انہیں فوج کی ترجیحات سے آگاہ کیا گیا۔ بعد ازاں کیم دسمبر 1988ء کو فوج اور بھٹو خاندان کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''فوج اور بے نظیر بھٹو کے درمیان طے ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہیں کریں گے۔ بے نظیر نے فوج کو بتا دیا ہے کہ وہ دفاعی وفوجی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ جب کہ فوج نے بے نظیر کو یقین دلایا ہے کہ وہ سیاست میں مداخلت نہیں کرے گی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ نے یقین دلایا کہ وہ منتخب حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے۔ کیونکہ وہ جمہوریت چاہتے ہیں۔'' قوم سے اپنے پہلے خطاب کے دوران وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے جمہوریت کی بحالی میں تعاون کرنے پر صدر مملکت مسٹر غلام اسحٰق خان اور مسلح افواج کو سلام پیش کیا۔ 17 دسمبر 1988ء کو واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ''محمد خان جونیجو نے فوج کو چیلنج کر کے حکومت گنوائی۔ میں محتاط رہوں گی، میں اپنا اثر ورسوخ بتدریج بڑھا رہی ہوں۔ پہلے اقدام کے طور پر میں نے اہم فوجی شخصیات کی حمایت حاصل کر لی ہے۔ اور دفاعی پالیسیوں خصوصاً افغان پالیسی اور امریکہ سے خصوصی تعلقات کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگرچہ میں امریکی فوجی امداد کے مقابلے میں اقتصادی تعاون کو زیادہ بہتر خیال کرتی ہوں۔'' تاہم بری افواج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے کہا کہ منتخب حکومت کو کسی شرط کے بغیر اقتدار منتقل کیا گیا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے مذکورہ بیانات سے واضح ہوتا

ہے کہ پیپلز پارٹی اور فوج کی قیادت کے درمیان کن امور پر اتفاق رائے ہوا تھا۔ اور بے نظیر سے کن دفاعی معاملات پر یقین دہانی حاصل کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اسمبلی سے جب دسمبر 1988ء میں ضمنی بجٹ کی منظوری حاصل کی تو دفاعی اخراجات میں کمی نہ کی۔ اسی طرح 1989ء اور 1990ء کے قومی بجٹوں میں بھی دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا گیا۔ جب کہ اس کے مقابلے میں سرکاری اخراجات میں 3 ارب روپے کی کمی کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بالفاظ دیگر بے نظیر بھٹو نے فوج کے اثر کو کلی طور پر قبول کیا۔ اس کی ظاہری دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی حکومت سیاسی طور پر غیر مستحکم تھی دوسرا وہ فوج میں پیپلز پارٹی کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کو ختم کرنا چاہتی تھیں۔ فوج کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بے نظیر بھٹو نے فوجی تقریبات میں بھرپور شرکت کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے 18 ہزار فٹ بلندی پر واقع سیاچین گلیشئر میں تعینات پاک فوج کے مورچوں کا بھی معائنہ کیا اور وہاں پر موجود فوجی افسروں اور سپاہیوں سے ملاقات کے دوران کہا کہ ''جمہوری حکومت ملک کے دفاع کے لیے فوج کے ساتھ شانہ بشانہ لڑے گی۔'' بے نظیر کے دورۂ سیاچین گلیشئر کا بظاہر مقصد وہاں پر تعینات فوجی افسروں اور جوانوں کے حوصلوں کو بلند کرنا تھا۔ مگر بعد ازاں پیپلز پارٹی کی حکومت نے جس انداز میں اس کا پروپیگنڈہ کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ اس دورے کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے۔ مثال کے طور پر اس دورے کے دوران فوجی جوانوں کے ساتھ کھینچی گئی وزیراعظم کی رنگین تصویر پر مشتمل بڑا پوسٹر لاکھوں کی تعداد میں ملک میں مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور اسے عوام کی توجہ کے لیے نمایاں جگہوں پر چسپاں کیا گیا۔ جس کا مقصد اس تاثر کو ابھارنا تھا کہ وزیراعظم بھٹو کو فوج کے ساتھ بے پناہ محبت ہے اور ان کے دل میں فوجی جوانوں کے لیے بے حد احترام ہے۔

فوج کو قریب لانے کے لیے بے نظیر بھٹو نے ایک اور قدم اُٹھایا اور 13 مارچ 1989ء کو ''یومِ پاکستان'' کے موقع پر جمہوری عمل کی بھرپور حمایت کرنے پر پاک فوج کے لیے تمغۂ جمہوریت کا اعلان کیا۔ بے نظیر بھٹو کے اس اقدام کو فوج کے اندر بے حد سراہا گیا۔ اور ''فوج کا جو یار ہے، وہ غدار ہے'' نعرے کا تاثر آہستہ آہستہ ختم ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اس دوران بے نظیر بھٹو نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ اور بعض دوسرے جرنیلوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اپریل 1989ء تک

بے نظیر بھٹو کی حکومت کافی حد تک مستحکم ہوگئی۔ اس وقت امریکہ اور بھارت کی اسے مکمل
حمایت حاصل تھی۔ فوج کے سربراہ اور صدر مملکت سے ان کے تعلقات بھی خوشگوار تھے۔
اس وقت اپوزیشن بھی منتشر حالت میں تھی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ کے بے نظیر بھٹو جو چاہتیں
کرسکتی تھیں۔

اس موقع کو غنیمت جان کر بے نظیر بھٹو نے فوج کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے،
اہم فوجی عہدوں پر اپنے پسندیدہ افراد کو تعینات کرنے اور مرحوم صدر ضیاء کے حامی فوجی
افسروں کی تذلیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اقتدار میں آنے سے پہلے اور بعد میں فوج کے جس
ادارے کو اپنی ذاتی پارٹی اور اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتی تھیں۔ وہ انٹرسروسز انٹیلی جنس (آئی۔
ایس۔آئی) تھا جو اس قدر مضبوط تھا کہ سوویت یونین، افغانستان اور بھارعت جیسے ممالک
میں بھی اس کی سرگرمیوں سے خوفزدہ تھے۔ کیونکہ سوویت یونین کے خلاف افغان عوام کی
جنگ کے دوران اس ادارے نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اور یہی ادارہ بے نظیر بھٹو کے والد
ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خاتمے کا سبب بنا۔ بے نظیر بھٹو کو خدشہ تھا کہ آئی ایس آئی میں
ان کا مخالف گروپ کہیں اُن کی حکومت کے خاتمے کا سبب نہ بنے۔ چنانچہ انہوں نے 25 مئی
1989ء کو آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل حمید گل اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر
جنرل انٹرسکیورٹی بریگیڈیئر امتیاز احمد کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کردیا۔ بریگیڈیئر امتیاز کو
بے نظیر بھٹو اس لیے ناپسند کرتی تھیں کہ اُنہوں نے ان کے والد کی معزولی کے بعد کراچی میں
واقع ان کی رہائش گاہ 70 کلفٹن پر چھاپہ مارا تھا اور وہاں سے اہم دستاویزات برآمد کی
تھیں جو بعد ازاں ان کے خلاف قتل کے مقدمے میں استعمال کی گئیں۔ بریگیڈیئر امتیاز کئی
سال تک آئی ایس آئی کے سیاسی سیل کے انچارج رہے۔ انہیں صدر ضیاء تک براہِ راست
رسائی حاصل تھی۔ ضیاء دور میں ان کا بنیادی کام بے نظیر بھٹو کی ملک کے اندر اور باہر
سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور ان کے بارے میں صدر ضیاء کو آگاہ کرنا تھا اور اسی وجہ سے وہ
اسٹیبلشمنٹ کی آنکھ اور کان تھے اُنہوں نے بے نظیر بھٹو کے بعض ایسے فوٹو گراف بھی حاصل
کیے جو اگر شائع ہوجاتے تو پیپلز پارٹی کی قیادت کی بدنامی ہوتی مگر جنرل ضیاء نے بار بار
اصرار کے باوجود ان کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔ آئی جے آئی کی انتخابی مہم کے لیے فنڈز
بھی آئی ایس آئی نے فراہم کیے تھے۔ اور اس کے ''ڈس انفارمیشن سیل'' جس کے کرتا دھرتا

بریگیڈیئر امتیاز تھے نے پیپلز پارٹی کی نئی حکومت کے بارے میں پروپیگنڈا کیا۔ اس لیے
بینظیر بھٹو نے حکومت سنبھالتے ہی بریگیڈیئر ایتاز کو ہٹانے پر اصرار کیا۔ انہوں نے نہ
صرف جنرل حمید گل اور بریگیڈیئر امتیاز کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کیا بلکہ آئی ایس آئی
میں کام کرنیوالے سیاسی سیل اور افغان سیل کو بھی محدود کردیا مزید یہ کہ آئی ایس آئی کے
فنڈز کی جانچ پڑتال کرنے کا حکم دے دیا۔ یہی غالبًا اُن کی سب سے بڑی غلطی تھی کیونکہ
پاکستان میں جب کسی سویلین حکمران نے فوجی مداخلت کے خلاف آواز اٹھائی اُس کی چھٹی
ہوگئی۔